



اک سناگر ہے زندگی

نفیسہ سعید



اک سا گرے زندگی

نفسہ سعید

علی میاں پبلی کیشنز

20- عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور پاکستان۔ فون: 37247414

انتساب

عورت کے نام

جراؤ کی کے اور عورت کے غلام رہی

نقیہ سعید

پیش لفظ:

”چڑیا داچنہ“ میرا ناول اس سے پہلے آپ قارئین میں مقبولیت پا چکا ہے۔ میرا یہ دوسرا ناول ”اک ساگر ہے زندگی“ معاشرے کا عکاس ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دنیا میں ہمیشہ برائی اس وقت پھیلتی ہے جب معاشرے میں عورت جیسی عظیم ہستی کو نہ صرف نظر انداز بلکہ ہر لحاظ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی ہے کہ ہر عورت اچھی اور ہر مرد برا ہی ہوتا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ ہر بری عورت کے پیچھے ایک مرد ہوتا ہے۔

وہ مرد جس کی محبت کسی عام عورت کو ممتاز محل، نور جہاں اور انارکلی بنا سکتی ہے تو یقیناً اس کی نفرت کسی بھی شریف عورت کو زہنہ نب بھی بنا سکتی ہے۔ زہنہ نب جیسی عورتیں ہمارے معاشرے میں ہر جگہ موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ہمیں ان کا علم اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر انہیں بغاوت پر مجبور نہ کر دے۔

”اک ساگر ہے زندگی“ ہمارے اسی معاشرے کا عکاس ناول ہے جو بنیادی طور پر مردوں کا معاشرہ ہے اور زہنہ نب بھی ایک ایسے ہی مرد کی بے اعتنائی، بے حسی اور بے رنجی کا شکار ہو کر اپنی زندگی کے دردناک انجام کو پہنچی۔ مگر ایسے معاشرے میں جیبہ جیسی لڑکیاں بھی موجود ہیں جن میں تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت اور ہمت ہوتی ہے اور جو اپنی زندگی کے فیصلے کے لیے کسی دوسرے کے کندھوں کا سہارا نہیں لیتیں۔ غرض اس ناول میں عورت کا ہر کردار آپ کو ملے گا اور امید ہے کہ پڑھنے والوں کو یہ ناول ضرور پسند آئے گا۔

میری ہر مرد سے صرف اتنی درخواست ہے کہ عورت سے محبت کریں اس کی عزت کریں، خاص طور پر بحیثیت بیوی اسے عزت ضرور دیں کیونکہ اس طرح آپ آنے والی نئی نسلوں کو ماں کے ساتھ ساتھ بہن، بیوی اور ہر ایک عورت، سب کی عزت کرنا سکھا دیں گے اور یقیناً یہ عمل ہمارے اچھے معاشرے کی تشکیل میں بنیاد ثابت ہوگا۔

دعاؤں کی طلب گار

نفیسہ سعید

چلتے چلتے بالآخر گاڑی رک ہی گئی سفر کتنا طویل تھا، اسے موبائل کی مصروفیت میں اندازہ بھی نہ ہوا اب جو گاڑی جھٹکا لے کر رک کی تو اس نے بھی اپنا جھکا ہوا سراٹھایا۔ اگلی سیٹ سے پاپا اور ڈرائیور فضل چاچا ایک ساتھ ہی باہر نکل گئے تھے۔ اس نے کھڑکی کے شیشے کے پار جھانکا دور دور تک پھیلی ہوئی چھوٹی بڑی دکانیں، جن کے سامنے جانے کس کس اشیائے صرف کے ٹھیلے کھڑے تھے، جہاں بھانت بھانت کے لوگ موجود تھے ہر طرف رش ہی رش تھا لوگوں کا جم غفیر چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ جانے یہ کون سا علاقہ تھا، جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک کبھی ایسی جگہ نہیں گیا جہاں اتنے لوگ ایک ساتھ موجود ہوں۔ یہ پاپا جانے کہاں لے کر آ گئے تھے جبکہ اس کے دونوں بہن بھائی ماما کے ساتھ دونوں پہلے ہی امروڈ گئے تھے اسے پاپا نے روک لیا تھا وہ اسے کسی سے ملوانا چاہتے تھے۔ کس سے؟ یہ ابھی تک وہ جان نہ پایا تھا۔

پاپا باہر کھڑے فضل چاچا سے کچھ باتیں کر رہے تھے اسے ابھن سی محسوس ہونے لگی یہ دونوں اسے اندر چھوڑ کر ہی کہیں نہ چلے جائیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے تیزی سے اپنی جانب کا دروازہ کھولا جس کی آواز سنتے ہی ملک صاحب نے پلٹ کر دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ وہ خاموشی سے اتر کر ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ فضل چاچا نے گاڑی سے کچھ نکالا اور گاڑی لاک کر دی۔

”اندر گلیوں میں گاڑی جانے کی گنجائش نہیں ہے اس لیے ہمیں پیدل ہی آگے کا سفر کرنا ہوگا۔“ پاپا نے ایک نظر اس پر ڈالتے ہوئے وضاحت کی۔ ابھی مزید اندر کی تنگ و تاریک گلیوں میں بھی داخل ہونا تھا اس سوچ نے بھی اسے تھوڑا سا پریشان کر دیا مگر وہ زبان سے کچھ نہ بولا اور اپنے پاپا کے ساتھ ساتھ چلتے سامنے نظر آنے والی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو گیا۔ فضل چاچا ان سے کچھ آگے چل رہے تھے ان کے ہاتھ میں غالباً ایڈریس کی پرچی تھی یہ ہی سبب تھا جو وہ جگہ جگہ رک کر لوگوں سے کچھ پوچھ بھی رہے تھے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ اس سوال سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ تو اپنے ارد گرد موجود چھوٹے چھوٹے اور تنگ و تاریک مکان دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہاں بھی لوگ زندہ رہ سکتے ہیں۔ اس کے تصور میں ان مکانات میں سانس لینا بھی مشکل تھا پھر بھی حیرت تھی کہ ہر طرف زندگی رواں دواں تھی۔ شور شرابا، بچوں کے کھیلنے کی آوازیں، کہیں کہیں زور و شور سے بجاتا ہوا تیز میوزک یہ سب اس کے ماحول سے یکسر مختلف تھا۔ اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ ان کا کوئی ملنے والا کسی ایسی جگہ سے تعلق رکھتا ہو وہ سب تو بہت ہی ہائی فائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے پھر ایسے میں

پاپا کا ان گلیوں میں آنا، وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔

چلتے چلتے فضل چاچا ایک تنگ گلی میں داخل ہو گئے جو آگے سے بند تھی گلی کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے چار پانچ مکان بنے ہوئے تھے۔ وہ دو گھر چھوڑ کر تیسرے کے ساتھ جا کھڑے ہوئے اپنا چشمہ درست کر کے باہر گلی سختی پر نام پڑھا اور اگلے ہی پل سبز رنگ والے دروازے کی کنڈی زور و شور سے بجادی جس کے جواب میں فوراً ہی کسی نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ فضل چاچا جانے پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اندر موجود نفوس سے کیا کہا جو اگلے ہی پل دروازہ پورا کھول دیا گیا۔

”آجائیں صاحب جی ہم صبح جگہ آگئے ہیں۔“

فضل دین نے پلٹ کر اپنے مالک کو پکارا جو حیران پریشان کھڑے اس گھر کو دیکھ رہے تھے جس میں رہنے والی ہستی سے وہ ملنے آئے تھے۔ انہیں کبھی امید نہ تھی آج اتنے سالوں بعد وہ انہیں اس گھر میں ملے گی۔ اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے پردہ ہٹا کر وہ اس گھر کے اندر داخل ہو گئے ان کی تقلید میں چودہ سالہ ایشال کو بھی اس گھر کی دہلیز پار کرنی پڑی ورنہ عام حالات میں وہ کبھی اتنی گندی جگہ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

چھوٹا سا مہن پار کرتے ہی وہ ایک نیم تاریک کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہیں اندر لانے والی خاتون نے جلدی سے آگے بڑھ کر کمرے کا بلب آن کیا ملگجاسا اجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ سامنے چار پائی پر کوئی وجود بالکل ساکت و صامت پڑا تھا لائٹ کھولنے والی خاتون اس کے سرہانے کھڑی ہو گئیں۔

”آئی آپ کے مہمان آئے ہیں اسلام آباد سے، جنہیں آپ نے خط لکھ کر بلوایا تھا۔“ اس نے بستر پر لیٹے وجود کا

کندھا دھیرے سے ہلایا۔

”فضل دین تم جاؤ اور وہ سب کام مکمل کر کے آؤ جو میں نے تم سے کہے تھے۔“

ملک صاحب نے اپنے پرس سے نکال کر جانے کتنی رقم اس کے حوالے کی جو اس نے خاموشی سے اپنی قمیص کی جیب میں رکھی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایشال کا دل چاہا وہ بھی چاچا کے ساتھ چلا جائے مگر گیا نہیں اور وہیں کھڑا رہا جب کہ اس کے پاپا دھیرے دھیرے چلتے اس وجود کے پاس جا کھڑے ہوئے جس میں زندگی کی کوئی رمت اتنی دور سے اسے محسوس نہیں ہو رہی تھی، وہ حیران تھا کہ یہ پاپا کی کون سی ایسی عریزہ ہیں جنہوں نے انہیں خط لکھ کر بلوایا، اور جن سے ملنے کے لئے پاپا نے ابروڈ میں جلد ہی منعقد ہونے والی ماما کی جیولری کی نمائش بھی اٹینڈ کرنے سے معذرت کر لی اور یہ ہی نہیں بلکہ جانے کیوں وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔

جو بھی تھا ایشال چاہتا تھا کہ اس کے پاپا جلد از جلد ان سے مل کر واپس چلیں مگر پاپا تو مزے سے ان خاتون کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئے وہ ابھی تک اپنی جگہ پر ویسے ہی کھڑا تھا۔ اس کے موبائل پر جانے کس کس کا میج آیا ہوا تھا جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اسے اس ماحول سے ابھرنے کی محسوس ہو رہی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے آس پاس زندگی ختم ہو گئی ہو۔

”ایشال ادھر آؤ بیٹا اپنی آنٹی سے ملو۔“ جانے کیسے پاپا کو اس کا خیال آ گیا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دھیرے دھیرے چلتا

ان کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔

”ایشال تو تمہیں یاد ہوگا، میرا سب سے بڑا بیٹا۔“

فخر پاپا کے لہجہ میں خود بخود در آ گیا۔

کھینچ کھینچ کر سانس لیتے وجود نے بمشکل اثبات میں اپنا سر بلایا اور اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا۔ اتنے جس زدہ ماحول میں بھی بستر پر لیٹی ان خاتون کے پاس سے آتی دھیمی دھیمی خوشبو نے ایصال کے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا۔

”السلام علیکم آئی۔“ پاپا نے بازو سے پکڑ کر اسے ان خاتون کے سامنے کر دیا، نہایت ہی کمزور، پیلی زرد رنگت، آنکھوں کے نیچے گہرے گہرے حلقے، اپنی جانب نکلتی ان سفید سفید آنکھوں کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا خوف زدہ ہو گیا، ایسا ماحول اور اس طرح کی خاتون اس نے آج تک ڈراؤنی فلموں میں ہی دیکھی تھیں۔ اپنی حقیقی زندگی میں اس کا واسطہ تو ہمیشہ خوب تیار شدہ، میک اپ سے آراستہ حسین و جمیل خواتین سے ہی پڑا تھا جن کے حسن میں قدرت سے زیادہ مصنوعی ہتھیار استعمال کیے جاتے تھے اور اسے ہمیشہ سے یہ سب کچھ ہی اچھا لگتا تھا رنگ روشنی، خوشبو۔ ایسا ماحول برداشت کرنا یقیناً اس کے اعصاب کے لئے ایک کڑا امتحان تھا۔

ایصال کے سلام کے جواب میں ان خاتون نے یک دم ہی اس کا ہاتھ تھام لیا ان کے لرزے ہاتھوں میں بھی ایصال کو اپنے لیے ایک گرم جوشی سی محسوس ہوئی اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں، پاپا نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چھڑوایا، اور اپنے قریب رکھی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایصال کرسی تھوڑا سا پیچھے کھینچ کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی ایک بار پھر اپنے موبائل میں مصروف ہو گیا اتنی دیر میں اس کا وہ گیم خراب ہو گیا جو اس نے اس گھر میں داخل ہونے سے قبل شروع کیا تھا۔ گیم آف کر کے اس نے ان باکس کھولا اور سارے میج پڑھ کر ان کا جواب دینے لگا۔ اس مصروفیت میں جانے کتنا وقت گزر گیا، ہوش اس وقت آیا جب چاچا فضل کمرے کا دروازے پر پڑا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ ان کی آمد کا احساس ہوتے ہی ایصال نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا چاچا فضل کے ساتھ چار اجنبی اشخاص بھی تھے جن میں سے ایک شخص عمر رسیدہ اور باریش بھی تھا جس کے لیے پاپا نے فوراً اپنی کرسی چھوڑ دی۔ ان کی تقلید میں وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا چاچا فضل اپنے ساتھ کچھ سامان بھی لائے تھے جو انہوں نے قریب دھرے لکڑی کے ٹیبل پر ہی رکھ دیا۔

سامان سے آتی خوشبو نے ایصال کو بھوک کا احساس دلایا وہ صبح سے بھوکا تھا اور یقیناً یہ سامان اشیائے خورد و نوش تھیں۔ ایصال کا سارا دھیان کمرے میں موجود واحد ٹیبل کی جانب منتقل ہو گیا، کمرے میں کیا ہو رہا تھا اسے اس میں کوئی دلچسپی نہ تھی، چاچا فضل نے ایک بار پھر اسے بازو سے پکڑ کر پاپا کے قریب کر دیا۔

”بیٹا یہاں سائن کرو۔“ ان کے قریب کھڑے کالے کوٹ والے شخص نے فائل میں رکھا ایک کاغذ اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

”نکاح نامہ، کچھ ناگزیر حالات کے سبب مجھے تمہارا نکاح کرنا پڑا اور چونکہ تم نا سمجھ ہو اس لئے تمہارے ولی کی حیثیت سے سب کچھ باقاعدہ میری اجازت سے ہوا ہے اور مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ پاپا نے مکمل تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔

نکاح کے بعد انہوں نے جو کچھ کہا اس کی سمجھ میں نہ آیا مگر وہ حیران ضرور ہوا، اسے علم تھا کہ نکاح کے لیے ایک عدد لڑکی کا ہونا بھی ضروری ہے جو اسے اس کمرے میں دور دور تک دکھائی نہ دے رہی تھی، پچھلے دنوں اس کے ماموں کے بیٹے فاران بھائی کا نکاح بھی ایک مقامی ہوٹل میں ہوا تھا خوب دھوم دھام اور ہلے گلے کے ساتھ، ان کے پہلو میں روحا بھابی بھی خوب تیار ہو کر بیٹھی تھیں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں یہ نکاح اس نکاح سے بالکل مختلف تھا۔

وہ چودہ سالہ لڑکا، نکاح کی اہمیت سے قطعی ناواقف تھا وہ نکاح کو صرف ایک رنگ رنگ تقریب کے حوالے سے جانتا تھا اور کچھ نہیں، یہ ہی سبب تھا جو بنا مزید کوئی سوال کیے اس نے خاموشی سے پیپر پر سائن کر دیئے۔

”ملک صاحب بہت بہت مبارک ہو۔“ سب بابا سے مل رہے تھے انہیں اندر لانے والی خاتون ہاتھ میں ایک عدد ٹرے لیے کمرے میں آن موجود ہوئیں، ٹرے میں رکھی خالی پلیٹوں میں چا چا فضل نے مٹھائی اور کچھ اور کھانے پینے کی اشیا رکھ دیں۔ سب کچھ نظر انداز کر کے وہ پھر سے اپنے موبائل میں مصروف ہو گیا۔ اس ماحول سے اس کا دھیان ہٹانے میں آج اس کے سیل نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا ورنہ جانے اتنی دیر میں اس کا کیا حشر ہوتا، تمام لوگ ایک بار پھر بابا کو مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جا چکے تھے، اب بابا بھی چلنے کو تیار تھے۔ اس عرصہ میں کسی نے اسے کچھ کھانے کا نہ پوچھا تھا اور نہ ہی اس نے مانگا، بابا ان خاتون سے دھیرے دھیرے بات کر رہے تھے جب وہ چا چا فضل کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔

چھوٹا سامن ابھی پار نہ کیا تھا کہ بابا بھی باہر آ گئے اور صحن کے دوسرے سرے پر بنے ایک چھوٹے سے دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے، یہ چھوٹا کمرہ غالباً کچن تھا ایشال نے دیکھا سبز دوپٹے میں ملبوس کوئی لڑکی وہاں، دروازے میں کھڑی تھی جو اندھیرے کے باعث اسے بالکل دکھائی نہیں دی اور نہ ہی اسے اس لڑکی کو دیکھنے میں کوئی دلچسپی تھی۔ بابا نے اس لڑکی کو اپنے سینے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرا اور جانے کیا بات کی۔ اس لڑکی کا یہ ہلکا سا قصور ایشال کے ذہن میں نقش ہو گیا اور وہ فضل چا چا کے ساتھ اس گھر کی دہلیز پار کرتا ہوا نکل گیا وہ جلد از جلد ان گلیوں کو چھوڑ کر جانا چاہتا تھا، گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا۔

”بابا مجھے پڑا ہٹ جانا ہے۔“ ملک صاحب کے گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے فرمائش کی۔

”اوکے بیٹا!“ وہ کبھی اس کی کوئی فرمائش نہ ٹالتے تھے۔

”ایک بات اور بیٹا آج کی اس تقریب کے بارے میں تم فی الحال اپنی ممایا کسی اور کو سچ پر کچھ نہیں بتاؤ گے جو کچھ بتانا ہے میں خود بتاؤں۔“

”کون سی تقریب؟“ وہ بالکل نہ سمجھ پایا۔

”تمہارے نکاح کی۔“ بابا نے پلٹ کر دیکھا۔

”بابا مجھے بھوک لگی ہے پلیز پہلے کچھ کھلا دیں باقی بات بعد میں کریں گے۔“ کیونکہ سمجھتے ہوئے بھی اسے بابا کا

”تمہارا نکاح“ کہنا کچھ اچھا نہ لگا۔



”سریہ فائل یہاں رکھ دوں اس پر آپ نے سائن کرنا ہے۔“

شاہ زین نے پی سی سے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا، اور نچ اور وائٹ پر عڑ کرتے کے ساتھ وائٹ دوپٹا گلے میں ڈالے وہ ہمیشہ کی طرف فریش تھی۔ ”آج تو بڑی اچھی لگ رہی ہو۔“ وہ بے اختیار تعریف کر بیٹھا۔

”تھینک یو سر!“ وہ پچھلے ایک سال سے اس کے آفس میں تھی مگر آج تک اتنی ہی ریزرو تھی کہ کبھی کبھی تو شاہ زین کو حیرت بھی ہوتی کیونکہ وہ خود فطرتاً خاصاً آفس کھتھا اور جلد ہی لوگوں سے گھل مل جاتا تھا اور اس کی اتنی کوششوں کے بعد یہ ضرور ہوا کہ حبیب اب ہنسا کسی تکلف اس سے بات ضرور کر لیتی مگر پھر بھی وہ بے تکلفی نہ تھی جو عام طور پر آفس میں کام کرنے والی

لڑکیوں میں آجاتی ہے۔ اس کے آفس کا ماحول تو ویسے بھی خاصا فرینڈلی تھا۔ شاہ زین نے ہاتھ بڑھا کر فائل کھولی اور جہاں جیبہ نے ہاتھ رکھا سائن کرتا چلا گیا۔ جیبہ شام کی کسی یونیورسٹی سے بی بی اے کرنے کے ساتھ ان کے ہاں ملازمت بھی کر رہی تھی اور خاصی پُر اعتماد لڑکی تھی جس کی خود اعتمادی شاہ زین کو شروع سے ہی پسند تھی۔

”تم آج شام کو فری ہو؟“ وہ جیسے ہی فائل اٹھا کر پلٹی شاہ زین نے ایک دم ہی پوچھ لیا اس کا یہ سوال یقیناً غیر متوقع تھا۔

”کیوں سر خیریت؟“ اپنے بالکل سیدھے کمر تک آتے بالوں کو وہ کان کے پیچھے کرتی ہوئی حیرت سے بولی۔ اس کے یہ سلی بال بھی اسے بہت پسند تھے اکثر اس کا دل چاہتا وہ قریب جا کر ان میں آتی خوشبو کو ایک لمبی سانس کے ذریعے اپنے اندر اتار لے۔

”دراصل میرے ایک دوست نے آج اپنی انگیجمنٹ کی ٹریٹ دینی ہے سو چاہتے ہیں بھی ساتھ لے جاؤں یہاں گھر والوں سے دور تم ضرور بور ہوتی ہوگی۔“

اس کے پاپا نے جب جیبہ کو اپائنٹ کیا تھا تو بتایا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کراچی آئی ہے جبکہ اس کی فیملی حیدرآباد میں ہوتی ہے۔

”نہیں سر میں بالکل بھی بور نہیں ہوتی آپ شاید بھول گئے ہیں شام میں میری کلاسز ہوتی ہیں اور چھٹی والے دن میں ہوسٹل میں رہ کر اپنے تمام کام ختم کرتی ہوں میری مصروفیت مجھے بور نہیں ہونے دیتی۔“ نرمی سے جواب دے کر وہ شیشہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔



اس نے جلدی جلدی الماری کھول کر کپڑوں میں چھپے ہوئے پیسے نکال کر گنے، بارہ سو پچاس روپے گننے کے بعد اس نے منہ ہی منہ میں دہرایا۔

”اس میں تو لان کا ایک اچھا جوڑا نہیں آئے گا میں باقی شاپنگ کیا کروں گی۔“ نینب مایوس سی ہو گئی۔ یہ رقم جانے وہ کب سے جمع کر رہی تھی اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح بازار جا کر خوب شاپنگ کرے گھومے پھرے، مزے مزے کے کھانے کھائے مگر فرہاد اس کا شوہر جانے کس طرح کا مرد تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ عورت کی ضروریات میں صرف دو وقت کا کھانا اور سردی گرمی کے چار سوٹوں سے زیادہ کچھ نہیں، وہ گھر کا راشن خود لاتا، ایک ایک چیز خود خریدتا، یہاں تک کہ اگر نینب کو کچھ چاہیے ہوتا تو وہ بھی اسے فرہاد سے ہی منگوانا پڑتا جب کہ اس کا دیور اور جیٹھ دونوں ایسے نہ تھے وہ اپنی بیویوں کو الگ سے باقاعدگی کے ساتھ خرچہ دیتے جو فرہاد کے نزدیک سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا۔ ایسے موقع پر وہ ہمیشہ اپنی ماں کے حوالے دیتا جس نے پائی پائی جوڑ کر ان کے لیے گھر بنایا۔ وہ کہتا اس کی ماں دو سوٹ گرمیوں میں اور دو سردیوں میں بناتیں اس کے نزدیک اس کی ماں کی یہ بچت اور سلیقہ شعاری ان کے کام آئی اور وہ یہ ہی امید نینب سے بھی رکھتا یہ جانے بغیر کہ اس کی دلی خواہشات کیا ہیں؟

وہ یہ ضرور چاہتا کہ جب گھر آئے نینب خوب تیار ہو مگر اس کے لئے وہ کوئی اضافی رقم خرچ کرنے پر بالکل تیار نہ تھا، اور اس کی یہ عادت نینب کو سخت ناپسند تھی۔ ابھی بھی یہاں وہاں سے جمع کی گئی رقم جس میں اس کی بیٹی کی عیدی بھی شامل تھی ناکافی ہونے کے سبب نینب کو مایوس کر گئی وہ خاموشی سے رقم واپس رکھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

لڑکیوں میں آ جاتی ہے۔ اس کے آفس کا ماحول تو ویسے بھی خاصا فریڈلی تھا۔ شاہ زین نے ہاتھ بڑھا کر فائل کھولی اور جہاں جہاں جیبہ نے ہاتھ رکھا سائن کرتا چلا گیا۔ جیبہ شام کی کسی یونیورسٹی سے بی بی اے کرنے کے ساتھ ان کے ہاں ملازمت بھی کر رہی تھی اور خاصی پُر اعتماد لڑکی تھی جس کی خود اعتمادی شاہ زین کو شروع سے ہی پسند تھی۔

”تم آج شام کو فری ہو؟“ وہ جیسے ہی فائل اٹھا کر پلٹی شاہ زین نے ایک دم ہی پوچھ لیا اس کا یہ سوال یقیناً غیر متوقع تھا۔

”کیوں سر خیریت؟“ اپنے بالکل سیدھے کمر تک آتے بالوں کو وہ کان کے پیچھے کرتی ہوئی حیرت سے بولی۔ اس کے یہ سلکی بال بھی اسے بہت پسند تھے اکثر اس کا دل چاہتا وہ قریب جا کر ان میں آتی خوشبو کو ایک لمبی سانس کے ذریعے اپنے اندر اتار لے۔

”دراصل میرے ایک دوست نے آج اپنی انگیجمنٹ کی ٹریڈ دینی ہے سوچا تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں یہاں گھر والوں سے دور تم ضرور بور ہوئی ہوگی۔“

اس کے پاپا نے جب جیبہ کو اپائنٹ کیا تھا تو بتایا تھا کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کراچی آئی ہے جبکہ اس کی فیملی حیدرآباد میں ہوتی ہے۔

”نہیں سر میں بالکل بھی بور نہیں ہوتی آپ شاید بھول گئے ہیں شام میں میری کلاسز ہوتی ہیں اور چھٹی والے دن میں ہوسٹل میں رہ کر اپنے تمام کام ختم کرتی ہوں میری مصروفیت مجھے بور نہیں ہونے دیتی۔“ نرمی سے جواب دے کر وہ شیشہ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔



اس نے جلدی جلدی الماری کھول کر کپڑوں میں چھپے ہوئے پیسے نکال کر گئے، بارہ سو پچاس روپے گننے کے بعد اس نے منہ ہی منہ میں دہرایا۔

”اس میں تولان کا ایک اچھا جوڑا نہیں آئے گا میں باقی شاپنگ کیا کروں گی۔“ نینب مایوس سی ہو گئی۔ یہ رقم جانے وہ کب سے جمع کر رہی تھی اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح بازار جا کر خوب شاپنگ کرے گھوسے پھرے، مزے مزے کے کھانے کھائے مگر فرہاد اس کا شوہر جانے کس طرح کا مرد تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ عورت کی ضروریات میں صرف دو وقت کا کھانا اور سردی گرمی کے چار سوٹوں سے زیادہ کچھ نہیں، وہ گھر کا راشن خود لاتا، ایک ایک چیز خود خریدتا، یہاں تک کہ اگر نینب کو کچھ چاہیے ہوتا تو وہ بھی اسے فرہاد سے ہی منگوانا پڑتا جب کہ اس کا دیور اور جیٹھ دونوں ایسے نہ تھے وہ اپنی بیویوں کو الگ سے باقاعدگی کے ساتھ خرچہ دیتے جو فرہاد کے نزدیک سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا۔ ایسے موقع پر وہ ہمیشہ اپنی ماں کے حوالے دیتا جس نے پائی پائی جوڑ کر ان کے لیے گھر بنایا۔ وہ کہتا اس کی ماں دو سوٹ گرمیوں میں اور دو سردیوں میں بناتیں اس کے نزدیک اس کی ماں کی یہ بچت اور سلیقہ شعاری ان کے کام آئی اور وہ یہ ہی امید نینب سے بھی رکھتا یہ جانے بغیر کہ اس کی دلی خواہشات کیا ہیں؟

وہ یہ ضرور چاہتا کہ جب گھر آئے نینب خوب تیار ہو مگر اس کے لئے وہ کوئی اضافی رقم خرچ کرنے پر بالکل تیار نہ تھا، اور اس کی یہ عادت نینب کو سخت نا پسند تھی۔ ابھی بھی یہاں وہاں سے جمع کی گئی رقم جس میں اس کی بیٹی کی عیدی بھی شامل تھی ناکافی ہونے کے سبب نینب کو مایوس کر گئی وہ خاموشی سے رقم واپس رکھ کر کمرے سے باہر آ گئی۔

فرہاد کچن میں رکھی چھوٹی سی ٹیبل پر ناشتا کرنے میں مصروف تھا پہلے اس کا دل چاہا وہ اس سے کچھ رقم مانگ لے اسے بتائے کہ اس نے شاپنگ کے لئے جانا ہے مگر پھر اگلے ہی پل اپنی اس خواہش کا گلا خود ہی گھونٹ دیا۔ اس کا بالکل دل نہ چاہا اس وقت فرہاد کے متوقع سوالات کا جواب دینے کو، رقم تو اس نے دینی نہیں تھی لہذا ایک بار پھر اسے اپنی ساس کے قصیدے سننے پڑتے جو اس کے لئے ناقابل برداشت تھے۔

آگے بڑھ کر زینب نے خاموشی سے چائے کا چولہا بند کیا اور گرم چائے دو کپوں میں نکال لی، ایک فرہاد کے سامنے رکھا اور دوسرا ہاتھ میں لئے باہر آگئی۔ جہاں ٹی وی پر کوئی انتہائی واہیات مارنگ شو آ رہا تھا جس میں موجود میزبان خاتون کی باتیں اور ڈریسنگ اتنی فضول تھی کہ اس نے جلد ہی اسکا کر ٹی وی کا چینل تبدیل کر دیا کسی اچھی سی لان کا اشتہار آرہا تھا۔ رنگ برنگے پرنٹ وہ دیکھنے میں مگن ہوگئی جب فرہاد کچن سے ہاتھ پونچھتا ہوا باہر نکلا زینب کے قریب رکھا ریوٹ اٹھا کر چینل تبدیل کر دیا۔

”اس لان کا ایک سوٹ ہی کافی مہنگا ہے۔ جس کا ابھی ٹی وی پر اشتہار آرہا تھا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکل گیا۔

”اچھا.....“ فرہاد جواب دے کر نیوز سننے لگا۔

”فضہ بھابی اس لان کے چار سوٹ لے کر آئی ہیں۔“ فرہاد کی بے توجہی کے باوجود اس نے اپنے دل کی بات اس تک پہنچانے کا فیصلہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ہمت باندھی۔

”لائی ہوں گی میں کیا کروں، ویسے بھی اسفند بھائی کے پاس فالتو پیسہ ہے جو ان کے بیوی بچے اس طرح اجاڑتے پھرتے ہیں وہ کام جو وہ دو دو ہزار کے سوٹ خرید کر کرتی ہیں دو، چار سو والے سوٹوں میں بھی ہو سکتا ہے بس پہننے والے بندے کو سلیقہ ہونا چاہیے۔“ اس کی یہ تھیوری کبھی بھی زینب کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

”اب دیکھو تمہیں جو ریڈ اور بلیک سوٹ میں نے لا کر دیا تھا صرف تین سو روپے کا تھا مگر جب تم نے پہنا تو کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔“

اس کی وہ باتیں جن سے ہمیشہ ہی زینب کو چڑھا کرتی تھی شروع ہو گئیں اب اس سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا لہذا وہ خاموشی سے سنی چلی گئی۔



رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کمرے میں ہونے والے ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔ منہ سے کھل ہٹایا تو دیکھا روم میں پھیلے ٹکجے سے اندھیرے میں اس کے پاپا تیار کھڑے تھے۔

”یہ اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔“ ایصال کے ذہن میں یہ خیال آتے ہی اس نے ایک نظر سامنے نظر آنے والی وال کلاک پر ڈالی جہاں ساڑھے تین بجے تھے وہ فوراً..... کھل ہٹا کر اٹھ بیٹھا۔

”پاپا.....“ ملک صاحب نے ایصال کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔

”میں بیٹا۔“ آہستہ سے کہتے ہوئے وہ اس کے قریب آن کھڑے ہوئے۔

”آپ اتنی رات میں کہاں جا رہے ہیں۔“ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ پریشان بھی ہو گیا۔

”بیٹا ہم پرسوں تمہاری جس آنٹی سے ملے تھے نا ان کا انتقال ہو گیا ہے۔“ پاپا اس کی جانب ہکتے ہوئے آہستہ سے

بولے۔

”اودھ تو آپ اتنی رات میں ان کے گھر جائیں گے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ تنگ و تنار یک گلیاں اس کے ذہن میں آ گئیں۔

”نہیں بیٹا وہ ہسپتال میں تھیں، فضل وہیں ان کے ساتھ تھا اب وہ مجھے لینے آ رہا ہے۔ ان شاء اللہ صبح جلدی فارغ ہو کر جیسے ہی میں واپس آؤں گا ہم اسلام آباد کے لئے نکل جائیں گے تم سو جاؤ میں کمرالاک کر کے جا رہا ہوں صبح ناشتے کے لئے روم سروس فون کر دینا ورنہ فریج دیکھ لینا اس میں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔“

ان کا موبائل بج اٹھا، وہ اسے جلدی جلدی سمجھا کر باہر نکل گئے شاید فضل چا چا آ گئے تھے، کمرے سے نکلتے نکلتے وہ زیرو پاور کا بلب بھی آف کر گئے تھے کیونکہ ایٹال ہمیشہ اندھیرے میں سونے کا عادی تھا۔

”اگر وہ آئی ہسپتال میں تھیں تو وہ سبز دوپٹے والی ان کی بیٹی کہاں ہوگی کیا اکیلی اس تنگ و تنار یک گھر میں..... بے چاری اب کیسے رہے گی اس گھر میں اکیلی۔“

یہ آخری سوچ جو سونے سے قبل اس کے دماغ میں آئی اور پھر اس کا دماغ فوراً ہی نیند کی دادیوں میں گم ہو گیا اپنی ماں کی موت کے بعد اس لڑکی کے اکیلے رہ جانے کے علاوہ کوئی دوسری سوچ ایٹال کے ذہن میں نہ تھی۔



وہ جیسے ہی نہانے کے لیے باتھ روم میں کھسی اچانک ہی داخلی دروازے کی کھنٹی بج اٹھی یہ وقت فرہاد کے گھر آنے کا نہ تھا پھر اس بھری دوپہر میں کون آ گیا؟ اسے یک دم ہی کوفت نے گھیر لیا۔ جگنو کو دو دن سے بخار تھا ابھی بھی بڑی مشکل سے وہ رور کو سوئی تھی اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بڑی بیٹی مریم کو بھی سلا دیا تھا کیونکہ اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو کبھی بھی جگنو کو نہ سونے دیتی۔ جانے کیوں وہ پیار ہی پیار میں اتنی شدت سے اس کے گال کھینچتی کہ بے چاری بچی بلبلایا اٹھتی یہ ہی سبب تھا جو زنب کبھی بھی اسے جگنو کے ہمراہ تنہا نہ چھوڑتی۔ ابھی بھی جب تک وہ کپڑے دھوتی رہی تمام وقت مریم کو اپنے ساتھ ہی رکھا اور پھر دونوں کو ایک ساتھ سلا کر نہانے کے لئے باتھ روم کھسی تو جانے یہ کون آ گیا۔

پہلے تو سوچا نظر انداز کر کے نہالے جو ہوگا خود ہی واپس چلا جائے گا مگر آنے والا بھی شاید بہت ہی ڈھیٹ تھا۔ نل ایک بار پھر پوری شدت سے بج اٹھی اپنا نہانے کا ارادہ ترک کر کے اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور باتھ روم سے باہر نکل آئی کمرے سے باہر آتے آتے نل ایک بار پھر سے بج اٹھی۔

”آ رہی ہوں صبر کرو۔“ وہ باہر موجود شخص کی بے صبری محسوس کر کے صحن سے ہی زوردار آواز میں چلائی اور تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی سامنے ہی خوب خوشبو میں بسی فضا بھائی کھڑی تھیں حسب توقع لدی پھندی غالباً شاپنگ سے واپس آتے ہوئے وہ اس کے گھر کی جانب آگئی تھیں آج خلاف توقع حذیفہ بھی ان کے ساتھ تھا ورنہ وہ ہمیشہ اکیلی ہی آتی تھیں اور دونوں بچے گھر ہی ہوتے۔

”السلام علیکم بھائی۔“ وہ کچھ دیر قبل والی کوفت بھلا کر خوشدلی سے سلام کرتے ہوئے ان سے گلے ملی۔

”وعلیکم السلام کیسی ہو تم؟“

جواب کے ساتھ ساتھ اس کی خیریت دریافت کرتی وہ اس کے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو گئیں ہاتھ میں کپڑے ذیروں شاپرز اس کے پلنگ پر ڈھیر کر دیئے۔ چاہتی تو یہ سب کچھ باہر گاڑی میں بھی رکھ کر آسکتی تھیں، مگر پھر زنب کے آگے

اپنی شو بازی دکھانے کا موقع انہیں کیسے ملتا ویسے بھی وہ ہمیشہ سے ایسی ہی نمود و نمائش کی عادی تھیں۔ زینب کی بے تحاشا خوب صورتی کو اپنی دولت کے زور سے بچا دکھانا ان کے پسندیدہ مشغلوں میں سے ایک تھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں کھانا کھائیں گی آپ؟“

ان کا جواب جانتے ہوئے بھی زینب نے میزبانی کے تقاضے نبھاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں نہیں کھانا تو آج باہر سے کھا کر آئی ہوں پلیز تم کوئی تکلف مت کرو یہاں آؤ بیٹھو میرے پاس۔“ بیک سے منرل دائر کی بوتل نکال کر اپنے منہ سے لگاتے ہوئے انہوں نے بیڈ پر ہی اپنے قریب اس کے لیے جگہ بنائی، مگر اتنی دیر میں وہ کمرے میں رکھے واحد موڑھے پر بیٹھ چکی تھی۔

”دراصل آج حذیفہ کا ایڈمیشن ٹیسٹ تھا اس کے لیے صبح سے ہی نکلے ہوئی ہوں۔ ٹیسٹ کے بعد تھوڑا بازار گئی کچھ اپنے لیے شاپنگ کی پھر حذیفہ کا یونیفارم اور کتابیں خریدیں، کھانا کھایا پھر سوچا چلتے چلتے تمہاری بھی خیریت معلوم کرتی جاؤں تم تو کبھی آتی ہی نہیں ہو۔“

یکے بعد دیگرے اپنی تمام دن کی مصروفیات بتاتے ہوئے انہوں نے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ زینب کی دہلی ہوئی دلی خواہشوں کو سلگانے کی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہو گئیں۔

”بس بھابی کیا بتاؤں سارا دن ٹائم ہی نہیں ملتا۔“ چند لمحوں قبل والی اس کی خوشدلی کافی حد تک کم ہو گئی اب جو وہ بولی تو اس کی آواز خاصی مدہم تھی اس کے تصور میں ایک بار پھر اپنے جمع کردہ بارہ سو پچاس روپے آگئے جس میں سے اب صرف ایک ہزار باقی بچا تھا باقی کی رقم سے اس نے گلی کے ککڑ پر کھڑے ٹھیلہ فروش سے برگر اور کولڈ ڈرنک منگوا کر اس وقت کھالی تھی جب فرہاد گھر نہیں تھا ورنہ اس کے نزدیک باہر کا کھانا کھانا..... ایک نہایت ہی فضول قسم کی عیاشی تھی جو اس کی ماں نے کبھی نہ کی تھی جب کہ زینب کو ہمیشہ ہی باہر کا کھانا کھانا اچھا لگتا اس کا دل چاہتا روزانہ نہ سہی کم از کم مہینے میں ایک دفعہ تو باہر جا کر کھانا کھانا چاہیے اور اپنی اس دلی خواہش کو وہ کبھی کبھار اس طرح پورا کر لیتی کیونکہ فرہاد جیسے شخص سے کوئی بھی فرمائش کرنا اپنا سر دیوار سے مارنے کے مترادف تھا۔

”اور یہ تم نے مریم کا کہاں ایڈمیشن کروایا ہے؟“

وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب یک دم فضا بھابی کو مریم کا خیال آ گیا۔

”مریم کا ایڈمیشن“ اپنے خیالوں میں گم پہلے تو زینب کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

”ابھی تو بھابی وہ چار سال کی بھی نہیں ہوئی۔“ اپنے تئیں اس نے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں حذیفہ اور وہ ایک ہی عمر کے ہیں۔“ عجیب جتنا ہوا لہجہ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں بنا کچھ کہے ہی زینب سمجھ گئی۔

”جی.....“ اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا جو وہ انہیں دیتی۔

”چائے بناؤں آپ کے لئے؟“ نہ چاہتے ہوئے پھر ایک بار انداز میزبانی نبھانا پڑا۔

”نہیں نہیں اب میں نکلوں گی آج اسفند کے دوست کے گھر رات کا ڈنر ہے اب گھر جا کر تیار ہونا ہے مظلمہ بھی اسکول سے آچکا ہوگا جا کر اسے بھی دیکھوں۔“

ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا جس کا اندازہ بخوبی زینب کے سنے ہوئے چہرے کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا جانے کیوں انہیں

ہمیشہ محسوس ہوتا کہ زینب کو اپنی خوب صورتی کا بہت غرور ہے اور یہی سبب تھا جو وہ اپنی باتوں اور حرکتوں سے اسے یہ جتنا نہ بھولتیں کہ قسمت کا تعلق خوب صورتی سے نہیں ہے ورنہ آج اس مقام پر زینب ہوتی جہاں اپنے پیسے کے زور سے وہ کھڑی تھیں، اپنی اسی غلط فہمی اور حسد میں وہ زینب کو کس بری طرح دماغی طور پر مفلوج کر رہی ہیں اس کا انہیں بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔

اگلے دن فرہاد کے گھر سے نکلتے ہی وہ اپنی پڑوسن کے ساتھ جا کر ایک قریبی اسکول سے داخلہ فارم لے آئی کیونکہ وہ کسی بھی صورت نہ چاہتی تھی کہ مریم تعلیمی درجہ میں حذیفہ سے پیچھے رہ جائے جب کہ فرہاد بھی اس کے اسکول داخلے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ مریم کو پانچ سال کی عمر سے اسکول بھیجا جائے مگر زینب کے دماغ میں جو بات فضا بھائی بٹھا گئی تھیں اب وہ نکلنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن تھا یہی سبب تھا جو رات کو فرہاد کے کھانا کھا کر ٹی وی کے سامنے بیٹھتے ہی اس نے اپنا صبح کالایا ہوا داخلہ فارم اس کے آگے رکھ دیا، وہ چاہتی تھی کہ اگلی صبح ہی یہ فارم واپس جمع بھی کر دیا جائے۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ ٹی وی پر چینل سرچ کرنے میں مصروف تھا۔

”مریم کے اسکول کا داخلہ فارم۔“ وہ جوش و خروش سے جواب دیتے ہوئے بولی۔

”اچھا.....“ فرہاد نے ذرا کی ذرا ایک نظر داخلہ فارم پر ڈالی، زینب کا سارا جوش یک دم ٹھنڈا ہو گیا اپنے پہلے بچے کو اسکول داخل کروانے کی کوئی خوشی فرہاد کے چہرے پر نہ تھی۔

”کتنا خرچ ہوگا؟“ وہ پھر سے ٹی وی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”تقریباً دو ہزار۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اتنے پیسے۔“ فرہاد کو سنتے ہی حیرت کا جھٹکا لگا۔

”حذیفہ کے ایڈمیشن پر خرچ ہونے والے پچاس ہزار سے تو بہت کم ہیں۔“ دل میں آیا ہوا اپنا یہ جواب وہ لبوں تک نہ لاسکی کیونکہ اس موقع پر وہ کوئی بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔

”داخلہ فیس، دو ماہ کی چھٹیوں کی فیس، سالانہ فنڈ کے علاوہ، یونیفارم کی رقم بھی اس میں شامل ہے جو اسکول سے ہی ملے گا ہمیں صرف کتابیں الگ سے خریدنا ہوں گی۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک ایک بات کی وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”مطلب دو ہزار کے علاوہ ابھی مزید کتابوں کا بھی خرچہ ہوگا؟“ وہ حیران ہوا۔

”اچھا اور جو دو ہزار میں تمہیں دوں گا اس کی رسید ضرور اسکول سے لے آنا۔“ وہ ہمیشہ سے اتنا ہی بے اعتبار تھا۔ سمجھتا تھا زینب اس سے پیسے بٹورنے کے لئے زیادہ رقم بتاتی ہے جبکہ وہ شروع سے پائی پائی کا حساب لینے کا عادی تھا۔

”اور ہاں داخلہ فارم کتنے کا آیا ہے تم صبح پانچ سو روپے مجھ سے لے کر گئی تھیں۔“

صبح والے پانچ سو روپے وہ ابھی تک نہ بھولا تھا جانے اس کے دونوں بھائی اپنی بیویوں کو اتنی اتنی رقم دے کر کس طرح بھول جایا کرتے تھے جو کبھی حساب نہ مانتے، زینب کو تو یقین ہی نہ آتا تھا ان کے برخلاف یہ شخص تو پائی پائی کا حساب کتاب کرنے کا عادی تھا۔ اپنی ماں سے ورثے میں ملنے والی ہر اچھی بری عادت اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ فارم پر دو سو روپے لکھا ہوا تھا نہ بھی ہوتا تو بھی زینب کا کوئی ارادہ پیسے بچانے کا نہ تھا۔ وہ خاموشی سے انھی اور تین سو روپے لا کر فرہاد کے پاس رکھ دیئے جو اس نے اٹھا کر اپنی جیب میں بھی رکھ لیے۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ مریم کے ایڈمیشن اور کتابوں میں سے کچھ

پیسے ضرور بچائے گی مگر اب اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اگر کسی شخص کو خود ہی احساس نہ ہو اپنی بیوی کی ضروریات کا تو پھر کیا ضرورت ہے اس طرح ہیر پھیر کر کے اس سے رقم حاصل کرنے کی اس نے دل برداشتہ ہوتے ہوئے سوچا۔

اور پھر تمام اخراجات کے بعد بچنے والے چار سو روپے بھی اس نے لا کر فرہاد کے حوالے کر دیئے۔ یہاں تک کہ وہ اس دوران جتنی بار بھی اسکول گئی چاہتے ہوئے بھی وہاں سے ایک کولڈ ڈرنک تک خرید کر نہ لی، فی الحال وہ ان پیسوں میں سے ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر نہیں خرچ کرنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ جب بھی کبھی فرہاد کی باتیں اسے دکھی کرتیں وہ کچھ عرصہ تک ایسی ہی ہو جایا کرتی اور پھر آہستہ آہستہ گزرتے وقت کے ساتھ خود ہی ٹھیک بھی ہو جایا کرتی کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔



آج ان کے آفس کا سالانہ ڈنر ایک فائیو سٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں منعقد کیا گیا تھا جہاں تقریباً سارا ہی اسٹاف آچکا تھا سوائے حبیبہ کے، ویسے بھی آج تک وہ آفس کے کسی بھی فنکشن میں شریک نہ ہوئی تھی وجہ ہمیشہ اس کی شام کی کلاسز ہوتیں یا پھر ہوٹل کے مسائل، جو بھی تھا شاہ زین کو آج بھی اس کے آنے کی ایک فیصد بھی امید نہ تھی وہ اپنے کسی دوست کو ریسو کرنے کے لئے جیسے ہی آگے بڑھا ایک دم ہی ڈائننگ ہال کے بڑے سے شیشے کے دروازے کو دھکیلتی وہ اندر داخل ہوئی جس کے آنے کے بعد کم از کم شاہ زین کو ایسا ضرور محسوس ہوا کہ جیسے چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی ہو۔

بلیک شنون کی پاؤں تک فراک کے ساتھ، سادہ بلیک دوپٹا، کمر تک آتے سلگی ہال اور کانوں میں پہنے سلور ٹیکنوں والے ٹائپس، غرض اس کے جسم پر موجود ہر چیز اس کے ساتھ پرفیکٹ دکھائی دے رہی تھی۔ کالے لباس میں اس کی سفید رنگت چاندی کی مانند دک رہی تھی۔

ایک پلی کو شاہ زین اپنی پلکیں جھپکنا ہی بھول گیا، اندر داخل تو وہ نہایت اعتماد کے ساتھ ہوئی تھی، مگر ایک دم اتنے سارے لوگوں کو دیکھ کر شاید کچھ زور سی ہو گئی یا شاہ زین کو بھی ایسا محسوس ہوا ہو بہر حال جو بھی تھا وہ اپنی جگہ پر ختم سی گئی۔ شاہ زین نے ایک لمحہ کو کچھ سوچا اور پھر تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”ہیلو مس حبیبہ!“ اس کے قریب جا کر وہ دھیرے سے بولا۔

”السلام علیکم سر.....“ اس کے ہیلو کے جواب میں حبیبہ نے سلام کیا، وہ ابھی بھی پہلے ہی جیسی بڑا اعتماد تھی شاہ زین کو جیسے ہی اپنے پہلے لگائے گئے اندازے کی غلطی کا احساس ہوا وہ لبوں ہی لبوں میں مسکرا دیا۔

”سر میں زیادہ لیٹ تو نہیں ہو گئی۔“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولی۔

”نہیں بالکل ٹھیک ٹائم پر آئی ہیں آپ، آئیں آپ کو اپنی ماسے ملواؤں۔“

بات کرتے کرتے شاہ زین کی نظر کچھ دور کھڑی اپنا ماما پر پڑی تو بے اختیار ہی اس کے منہ سے نکل گیا اس کی نظروں کے تعاقب میں حبیبہ نے دیکھا۔ وائٹ ساڑھی میں گرے اسٹریٹنگ کندھے تک آتے بالوں کے ساتھ، دور سے خوب صورت دکھائی دینے والی وہ عورت یقیناً شاہ زین کی ماں ہی ہوگی۔

اتفاق کی بات تھی آج ایک سالہ ملازمت کے باوجود وہ کبھی بھی ان سے نہ ملی تھی، ان کے کھڑے ہونے کے انداز میں جھلکتا احساس تھا آخر اتنی دور سے بھی حبیبہ کو صاف دکھائی دے رہا تھا، اس کا بالکل دل نہیں چاہا وہ جا کر اس عورت سے ملے، اپنا ایک آفس ورکر کے طور پر یہاں اس طرح اتنے لوگوں میں متعارف کروایا جانا اور پھر خوشامد انداز میں ”السلام علیکم میڈم“ کہنا اور اس کے علاوہ بھی مزید تکلفات نہ جانا جن کی نہ وہ عادی تھی اور نہ ہی اس وقت اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ

اک ساگر ہے زندگی

آیا کہ وہ شاہ زین کو کس طرح منع کرے لہذا خاموشی سے اپنا دوپٹا سنبھالتی اس کے ساتھ چلے گئی ابھی بمشکل دو قدم ہی چلی ہوگی کہ بیک دم اس کے سامنے جو آد آگیا جوان کے آفس میں ہی کام کرتا تھا۔

”میم آپ کو بڑے صاحب بلارہے ہیں۔“ اس کا اشارہ یقیناً شاہ زین کے والد کی جانب تھا جن کے حسن اخلاق اور شفقت بھرے رویے کی وہ دل سے گرویدہ تھی۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی جو جانے کب سے رکی ہوئی تھی اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ وہ شاہ زین کی والدہ سے ملنے کے بالکل بھی موڈ میں نہ تھی اور اس موقع پر بڑے صاحب ایک بار پھر اس کے کام آئے۔

”مجھے اکل بلارہے ہیں۔“ اس نے شاہ زین سے کہا اور جو اد کے ساتھ چل دی۔ شاہ زین کچھ دور تک اسے جاتا دیکھتا رہا اور پھر جیسے ہی واپس پلٹا وہ جگہ خالی تھی جہاں کچھ دیر قبل اس کی ماما کھڑی تھیں۔ اسے یاد آیا آج ماما کا فیملی ڈنران کے بڑے بھائی کے گھر تھا جہاں شاہ زین اور اس کے والد کے علاوہ سب لوگ موجود تھے چونکہ آفس ڈنر ہر سال اسی تاریخ کو ہوتا تھا لہذا اسے آج ہی رکھنا ان لوگوں کی مجبوری تھی اور فیملی ڈنر بھی بہت ساری وجوہات کی بنا پر کینسل نہیں ہو سکا تھا لہذا اس کی ماما یہاں سے جلد واپس جا کر اپنی فیملی کو جوائن کرنا چاہتی تھیں جبکہ وہ اپنے پاپا کے ساتھ ہی تھا جنہیں رات میں فارغ ہو کر ماموں کے گھر سے ہوتے ہوئے جانا تھا۔

شاہ زین نے ایک نظر دور کھڑی جیب پر ڈالی جو اپنی آفس کو لیک کرن کے ساتھ کھڑی کسی بات پر ہنس رہی تھی اس کی خوب صورتی اس تمام محفل میں سب سے نمایاں تھی یا شاید وہ شاہ زین کو ہی سب سے زیادہ حسین لگ رہی تھی جو بھی تھا کم از کم اس کے آنے کے بعد شاہ زین کو وہاں کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ جیب کو ہی دیکھتا رہے، مگر کب تک اتنی بھری محفل میں ایسا ممکن نہ تھا۔

ڈنر شروع ہو چکا تھا جیب کو کچھ پل کے لیے نظر انداز کر کے وہ بھی ڈانٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا آج کا یہ ڈنر اس کی زندگی کا ایک خوب صورت اور یادگار ڈنر تھا کیونکہ اس میں اپنی تمام عنانیوں کے ساتھ جیب موجود تھی اور یہ بات شاید جیب بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ شاہ زین کے نزدیک ہر گزرتے دن کے ساتھ کتنی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔



پاپا صبح نو بجے تک واپس آئے تو وہ ناشتا کر کے فارغ ہو چکا تھا جانے کیوں پاپا کو تنہا دیکھ کر وہ کچھ حیران سا ہوا۔ اسے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جب پاپا واپس آئیں گے وہ سبز دوپٹے والی لڑکی بھی یقیناً ان کے ساتھ ہوگی، مگر ایسا نہ تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوا، پاپا کچھ پریشان اور الجھے ہوئے تھے، مسلسل فون پر مصروف جانے کس کس کو کیا کیا ہدایات دے رہے تھے اس کی سمجھ میں نہیں آیا انہوں نے لنگ بھی نہیں کیا۔

”وہ کیوں اس قدر پریشان ہیں؟“ ایسا لپ پوچھنا چاہتا تھا، مگر نہ پوچھ سکا وہ اب مزید لاہور میں نہیں رہنا چاہتا تھا اسے جلد از جلد اپنے گھر واپس جانا تھا جہاں دو دن بعد اس کی ماما واپس آنے والی تھیں۔ اسے اپنی بیسٹ فرینڈ اریشہ سے بھی ملنا تھا جو جانے کتنی بار پوچھ چکی تھی کہ وہ کب واپس آئے گا؟ وہ اسے اپنے وہ تمام ویڈیو گیم بھی دکھانا چاہتا تھا جو پاپا نے لے کر دیئے تھے، اسے اریشہ کی نئی کیٹ بھی دیکھنی تھی جو اس نے دو دن قبل لی تھی جس کی باتیں سن سن کر وہ اس سے ملنے کے لیے بے چین تھا، اس نے اریشہ کے لیے ایک خوب صورت کوٹ بھی خریدا تھا وہ جانتا تھا وہ دیکھ کر اریشہ بہت خوش ہوگی، مگر جانے کیوں پاپا اتنی دیر کر رہے تھے واپس ہی نہیں جا رہے تھے وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ہمیں کب واپس جانا ہے، لیکن پاپا کی فون

کی مصروفیت موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

”بیٹا اپنا سارا سامان سمیٹ لو کچھ ہی دیر میں فضل دین آرہا ہے تو ہم اسلام آباد کے لیے نکل رہے ہیں۔ وہاں کچھ آفس کا کام ہے جو پٹا کے ان شاء اللہ کل دوپہر کی فلائٹ سے واپس کراچی چلے جائیں گے اور کل رات تک تمہاری ممانے بھی واپس آ جانا ہے۔“ اپنی فون کی مصروفیات سے فارغ ہو کر انہوں نے جلدی جلدی اسے ساری تفصیل بتائی جسے سنتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ اپنا گھر، بہن بھائی اور ممانے ملنے کی خوشی میں وہ ساری کوفت بھول گیا جو کچھ دیر قبل اس پر سوار تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا تمام سامان سمیٹا اور کچھ ہی دیر بعد فضل چاچا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسلام آباد کی جانب روانہ ہو گیا یہ جانے بغیر کہ اس کی زندگی میں کیا تبدیلی آ چکی ہے۔ لاہور میں گزارا جانے والا یہ ہفتہ اس کی زندگی کو کس قدر تبدیل کر چکا ہے وہ نہیں جانتا تھا۔

اسلام آباد پہنچ کر پاپا نے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا اور پھر دوپہر کی فلائٹ سے وہ اپنے گھر واپس پہنچ گئے۔ گھر واپسی کی خوشی اور سب سے ملنے کی بے قراری اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ ممانے تو رات کو آتا تھا وہ جاتے ہی جلد از جلد ایشہ سے ملنا چاہتا تھا جس سے ملے ہوئے اسے آج ایک ہفتہ سے بھی زیادہ ہو گیا ورنہ وہ تو سارا دن ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ ایئر پورٹ سے گھر تک تیس منٹ کا یہ سفر اب اسے تیس دن سے بھی زیادہ لگ رہا تھا۔



وہ جانے کب سے اپنی الماری کھولے کھڑی تھی جہاں موجود کپڑوں میں سے کوئی بھی سوٹ ایسا نہ تھا جو کسی بہت ہی اچھی تقریب میں پہن کر چلایا جاسکے اور تقریب بھی وہ جہاں اپنے پورے کردار کے ساتھ فضا بھالی موجود ہوں۔ اسفند اور فرہاد کا سب سے چھوٹا اور تیسرے نمبر والا بھائی صمد پچھلے دس سالوں سے دبئی میں مقیم تھا جہاں اس نے ایک پاکستانی فیملی میں شادی کر لی تھی اس کی بیوی کسی نیوز چینل سے منسلک تھی۔

بہت کم ہی ایسا ہوتا جب صمد پاکستان آتا تو وہ بھی ساتھ ہوتی ورنہ ہمیشہ صمد اکیلا ہی آیا کرتا تھا۔ اس دفعہ اتفاق سے وہ اپنی چھوٹی بہن کی شادی میں شرکت کے لئے آئی ہوئی تھی جس کا رشتہ یہیں کسی پاکستانی گھرانے میں طے پایا تھا۔ اس نے ہر فنکشن میں شرکت کا دعوت نامہ اسفند بھائی کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دیا تھا۔ بے شک وہ اپنی عادتوں کے اعتبار سے فضا بھابی سے کافی مختلف تھی، مگر پھر بھی نہ ب کا ارادہ کسی بھی فنکشن میں شرکت کا نہیں تھا اور اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی کہ اس کے پاس کوئی ایسا قیمتی لباس نہ تھا جو وہ کسی بھی تقریب میں پہن کر جاسکتی یہی سبب تھا جو مہندی کے فنکشن میں بھی صرف فرہاد ہی شریک ہوا۔ اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس نے بڑی سہولت سے منع کر دیا، مگر آج بار بار آنے والے صمد کے فون پر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تیار ہونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

الماری کھولی، کوئی ڈھنگ کا کپڑا اسانے دکھائی نہ دیا۔ وہ ہی گنتی کے چند سوٹ جو جانے کتنی بار پہن چکی تھی اس نے کئی بار فرہاد سے کہا تھا کہ اسے دو عدد جوڑے، ایک جوتی اور کچھ میک اپ کا سامان لادے جسے اس نے سنا تو بڑی توجہ سے، مگر عمل کر کے نہ دیا اور آج شادی کا دن آپہنچا۔

دو دن قبل ہونے والی رسم مہندی سے واپسی پر وہ مسلسل وہاں کی ڈیکوریشن، کھانا اور دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ اپنی بھابی کی عالی شان ڈریسنگ کے قصیدے بھی ساری رات گاتا رہا بنا یہ جانے کہ اس کی ان باتوں سے نہ ب کو کیا تکلیف پہنچ رہی ہے۔

”صمد کی بیوی کو تیار ہونے کا بڑا سلیقہ ہے ماشاء اللہ بہت اچھا تیار ہوتی ہے۔“ جواباً وہ خاموش رہی۔
 ”آج تو فضہ بھابی بھی بڑی اچھی لگ رہی تھیں ان کے سوٹ کا کلر بہت خوب صورت تھا۔“
 وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ فرہاد کو ان باتوں کا کوئی سلیقہ نہیں ہے یہ سب سن کر تھوڑا سا حیران ضرور ہوئی۔
 ”تم بھی چلتیں سچ بہت مزا آتا خاصاً انجوائے کرتیں، انہوں نے کھانا بھی بہت اچھا دیا تھا اور ویسے بھی وہاں سب ہی تمہارا پوچھ رہے تھے، میں نے کہہ دیا کہ طبیعت خراب تھی۔“ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا اور زینب خاموشی سے سن رہی تھی، مگر کب تک، وہ چپ نہ رہ سکی اور بول ہی پڑی۔
 ”فضہ بھابی کے اچھے لگنے میں زیادہ کمال ان کے پارلر اور قیمتی لباس کا ہوتا ہے۔“
 وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جتا گئی جس کا اثر فرہاد پر بالکل بھی نہ ہوا۔

”یہ تو ہے بہر حال جو ریڈ سوٹ تم نے عید پر بنوایا تھا وہ بھی خاصاً اچھا تھا اگر پہن کر جاتیں تو مجھے یقین ہے سب سے اچھی لگتیں مگر اب تمہیں کون سمجھائے۔“
 ”عید والا سوٹ.....“ وہ متحیر زدہ لہجہ میں بولی۔

عام سی جار جٹ جس پر اس نے خود گونا لگایا تھا ساتھ ہی اس کے تصور میں فضہ بھابی آگئیں خوب سخی سنوری قیمتی لباس سے آراستہ، دل چاہا پلٹ کر فرہاد کو کوئی سخت سا جواب دے، مگر حسب عادت صبر کے گھونٹ پی گئی۔
 ”ہاں اس میں کیا برائی ہے اصل میں زینب ہر انسان اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہی خرچ کرتا ہے جتنا روپیہ اسفند بھائی کے پاس ہے وہ خرچ کرتے ہیں اور میں وہ خرچ کرتا ہوں جو میرے پاس ہے میرے اور ان کے معیار زندگی میں خاصا فرق ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرو لاکھوں سے اچھے ہیں، اچھا کھاتے ہیں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا جو ہے اپنا ہے اب ان شاء اللہ کچھ ہی عرصہ میں، میں یہ گھر بنوانے والا ہوں سوچا ہے اوپر ایک کمر اڑال کر کرائے پر دے دوں۔“
 فرہاد مسلسل بول رہا تھا ایسی باتیں جن سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ جانتی تھی کہ علاقے میں موجود فرہاد کا جنرل اسٹور ٹھیک ٹھاک چلتا ہے کچھ نہ سہی پھر بھی اس کی کم از کم اتنی آمدنی ضرور تھی جس سے اگر وہ چاہتا تو اسے ہر ماہ ایک لگا بندھا خرچہ دے سکتا تھا، مگر نہیں، اس کے نزدیک زینب کو سوائے دو وقت کی روٹی کے کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کے نزدیک یہ بھی بہت تھا کہ وہ ہر عید، بقر عید پر اسے دو جوڑے کپڑوں کے بنا دیتا تھا، دو سوٹ سردی گرمی میں بھی لے دیتا تھا چاہے وہ زینب کی پسند کے ہوں یا نہیں اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

کبھی کبھی تو زینب کو اس وقت بہت حیرت بلکہ دکھ بھی ہوتا جب فرہاد کی بڑی بہن یا سبین آپا کراچی آتیں اور فرہاد کے سامنے اپنے شوہر کے رونے رو تیں جو انہیں بقول ان کے خرچہ نہ دیتا تھا (اس کے باوجود ہر چھ ماہ بعد جہاز کے ذریعے اسلام آباد سے کراچی آتیں) ایسے میں فرہاد بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا خوب بڑھ بڑھ کر باتیں بناتا جو عورت کے حقوق پر مبنی ہوتیں اور پھر اپنی بہن کو کچھ نہ کچھ رقم بھی ضرور دیتا۔ اس کے نزدیک اس کا بہنوئی ایک ظالم شخص تھا جسے اپنی بیوی کی ضروریات کا بالکل بھی احساس نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک نہایت ہی قابل فخر مرد سمجھتا جو بیوی کی ہر ضرورت پوری کرتا۔

وہ جب جب یہ باتیں سوچتی اسے حیرت ہوتی فرہاد کے نزدیک بہن اور بیوی کے معیار زندگی کا تصور کتنا مختلف تھا، مگر شاید سارے مرد ایسے نہ تھے۔ اس کے بھائی، بڑا بہنوئی، جیٹھ اور دیور کوئی بھی تو ایسا نہ تھا شاید دنیا کا کوئی بھی مرد فرہاد جیسا نہ

تھا، لیکن ہو سکتا تھا حقیقت اس کے برعکس بھی ہو جو اس نے دیکھا، ہو سکتا ہے دنیا کی بہت ساری عورتیں دوسروں سے اپنا آپ چھپا کر چھیتی ہوں آخر وہ بھی تو ایک ایسی ہی عورت تھی اور یہ ہی سوچ اسے ہمیشہ تسلی دیتی۔

”کیا بات ہے میری کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہیں سو گئی ہو کیا؟“

فرہاد ہمیشہ یہ چاہتا کہ وہ جب بھی کوئی بات کرے زینب اس کا جواب ضرور دے خواہ دل چاہے یا نہ، اور ایسے میں کبھی کبھی جواب نہ پا کر وہ اکثر ہی چڑ جایا کرتا۔ اسے لگتا زینب اسے انکڑ کر رہی ہے اور ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ کئی کئی دن تک ناراض رہتا، سیدھے منہ بات نہ کرتا اس طرح شاید وہ زینب سے بدلہ لیا کرتا۔ یہ ہی سبب تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی زینب کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔

”نہیں تو جاگ رہی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا اب کل ضرور تیار ہو جانا شادی پر چلنے کے لیے آج بھی سب نے تمہارا بہت پوچھا۔“

”اچھا.....“ اس کا دل نہ چاہا کوئی بات کرنے کو، اس نے آنکھیں موند لیں تاکہ فرہاد اسے سوتا جان کر خاموش ہو جائے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب ہوگئی، مگر اگلے دن جو تیار ہونے کے ارادہ سے کپڑوں کی الماری تک آئی تو خاصی مایوس سی ہوگئی اس کے پاس کوئی ایسا سوٹ نہ تھا جو وہ آج پہن کر جاسکتی۔ تھک ہار کر الماری کے پٹ کھلے چھوڑ کر وہیں نزدیک ہی بیڈ پر بیٹھ گئی جب یک دم ہی اسے سادیہ کا خیال آیا جو نہ صرف اس کی پڑوسن بلکہ ایک اچھی دوست بھی تھی۔

”کیوں نہ میں سادیہ سے اس کا وہ سوٹ مانگ لوں جو اس نے پچھلے ماہ اپنے بھائی کی شادی پر بنوایا تھا۔“

اس خیال کے آتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی پاؤں میں چپل پہنی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی سامنے ہی صحن میں فرہاد بڑے جذبے سے اپنے موٹر سائیکل کو دھورہا تھا۔ چاہتی تھی کہ اس کے قریب سے خاموشی سے گزر جائے، مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے پاس سے گزر کر وہ دو قدم ہی چلی ہوگی جب اس نے آواز دے کر روک لیا۔

”اس وقت کہاں جا رہی ہو تیار نہیں ہونا ابھی کچھ دیر میں ہی صحنے گاڑی بھیج دینی ہے۔“ اپنے بھائیوں کی گاڑیوں کا مان ہمیشہ سے ہی فرہاد کو رہا اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ان کی گاڑیاں اور حیثیت و مرتبہ فرہاد کے لیے باعث فخر و امتیاز ہے۔

”سادیہ کی طرف جا رہی ہوں تاکہ اس کا کوئی سوٹ مانگ کر آج پہن لوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی ہلکی سی تلخی اس کے لہجے میں آگئی جس غالباً فرہاد نے محسوس ہی نہ کیا۔

”کیوں اپنا ریڈ والا نہیں پہن رہیں اچھا خاصا سوٹ ہے۔“

وہ اپنا ہاتھ روک کر اس کی جانب متوجہ ہوتا ہوا بولا۔ زینب کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

”اچھا جاؤ لے آؤ، مگر جلدی آ جانا دیر نہ ہو جائے۔“

شاید وہ زینب کے چہرے پر چھائی بے زاری اور بددلی بھانپ گیا تھا۔ زینب نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا اور بنا کوئی جواب دیئے گھر سے باہر نکل آئی۔ دو گھر چھوڑ کر تیسرا سادیہ کا گھر تھا۔

وہ مریم کے اسکول میں جا ب بھی کرتی تھی جہاں سے ہر ماہ ملنے والی تنخواہ وہ صرف اور صرف اپنی ذات پر ہی خرچ کیا کرتی شاید یہی وجہ تھی جو اس کا رہن سہن ہر لحاظ سے زینب سے بہتر تھا۔

”اللہ کرے فتح محمد گھر نہ ہو۔“ جانے کیوں اسے سادیہ کا شوہر بالکل پسند نہ تھا زینب کو اپنے سامنے دیکھتے ہی ایک

عجیب کردہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ جاتی جو اسے ایک آنکھ نہ بھاتی۔ ایسے میں فتح محمد کا چہرہ بالکل ایک عیار لومڑی جیسا دکھائی دیتا یا شاید زینب کو ایسا لگتا بہر حال جو بھی تھا وہ اسے بالکل ناپسند تھا یہ ہی سبب تھا وہ ہمیشہ کوشش کرتی کہ سادیہ کے گھر اس وقت جائے جب اس کا شو ہر گھر نہ ہو، مگر اس وقت چونکہ ٹائم سات سے اوپر ہو چکا تھا اور یہ وقت فتح محمد کے گھر آنے کا تھا۔

زینب کی توقع کے عین مطابق کھنٹی بجاتے ہی گیٹ کے اس پار فتح محمد کا چہرہ دکھائی دیا، زینب پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چہرے پر ہزار واٹ کا بلب روشن ہو گیا اور وہ پورے دل سے اپنی باجھیں کھول کر مسکرایا۔
”میں خواخواہ ہی اسے لومڑی سے تشبیہ دیتی رہی یہ تو بالکل بھیڑیے جیسا دکھائی دیتا ہے۔“ فتح محمد کے ہونٹوں سے جھانکتے دانت بھیڑیے ہی جیسے تھے اپنی اس نئی تشبیہ پر وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

”ساد یہ گھر پر ہے؟“ اپنی مسکراہٹ چھپائے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”ہاں ہاں بالکل ہے۔“ دروازے کے دونوں دروا کیے وہ سامنے ہی کھڑا رہا۔

”فتح بھائی اسے بتائیں کہ میں آئی ہوں۔“

لفظ ”بھائی“ نے اس کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ کو یکسر غائب کر دیا۔

”ساد یہ، سادیہ.....“ وہ وہیں سے آواز لگاتا واپس پلٹ گیا۔

”ارے اندر آ جاؤ باہر کیوں کھڑی ہو۔“

وہ غالباً کچن میں تھی اسی لیے تولیہ سے ہاتھ پونچھتی سامنے برآمدے میں آن کھڑی ہوئی۔ زینب گیٹ بند کر کے اندر داخل ہو گئی۔ سادیہ اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آ گئی۔

”بیٹھ جاؤ کھڑی کیوں ہو۔“

”نہیں میں بیٹھے نہیں آئی مجھے تم سے ایک کام ہے۔ دراصل مجھے تمہارا وہ سوٹ چاہیے جو تم نے اپنے بھائی کی شادی پر

بغویا تھا۔“

کوئی تمہید باندھے بغیر وہ جلدی جلدی اپنی بات ختم کرتے ہوئے بولی اور اگلے ہی پل بنا کوئی جواب دیئے سادیہ نے سوٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ریڈیفون پر کامدانی کے ساتھ اس کا یہ سوٹ کافی خوب صورت تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم یہیں تیار ہو جاؤ میں تمہارا اچھا سا میک اپ بھی کر دیتی ہوں۔“

آئیڈیا برا نہیں تھا۔ زینب نے اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر نظر آنے والے میک اپ کے سامان پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا اور فوراً ہی ہامی بھری..... اور پھر کچھ ہی دیر میں سادیہ کی مہارت نے اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیئے خود کو آئینہ میں دیکھ کر کئی پل تک زینب کو یقین ہی نہ آیا کہ سامنے نظر آنے والا عکس اس کا ہے۔

سچ ہے لباس شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے جسم پر سجے قیمتی لباس نے زینب کو یکسر تبدیل کر دیا نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی طور پر بھی اپنی خوب صورتی کا احساس ایک غرور کی طرح اس پر چھا گیا۔

”واہ یار تم تو بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ سادیہ نے دل کھول کر اس کی تعریف کی وہ ویسے بھی زینب کے سادہ حسن کی شیدائی تھی آج تو پھر بات ہی کچھ اور تھی۔

”یقین کر دو آج کے فنکشن میں تم سے زیادہ حسین کوئی اور نہ ہوگا یہ میں تمہیں دعوے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں۔“

اور سادیہ کی یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی جس کا احساس اسے شادی ہال میں داخل ہوتے ہی خود پر پڑنے والی ہر ستائشی نگاہ نے دلا دیا۔

یہ محفل جو آج تھی ہے

اس محفل میں ہے کوئی ہم سا

ہم سا ہو تو سامنے آئے

دل ہی دل میں گنگنائی وہ اسٹیج کی جانب بڑھی جس کے بالکل قریب ہی ایک شان بے نیازی اور غرور میں تنی فضا بھائی کھڑی تھیں اسے پوری امید تھی کہ زینب کو اپنے سامنے اس طرح دیکھ کر ان کا سارا غرور اور مظنہ حسد میں تبدیل ہو جانا ہے جو ان کی ذات کا ایک خاص حصہ تھا اور زینب کا یہ خیال اگلے ہی پل درست ثابت ہو گیا۔



”واؤ! یار کوٹ تو بہت خوب صورت ہے۔“ اریشہ کے منہ سے نکلنے والے ستائشی الفاظ نے ایصال کو پچھلے پورے ہفتے کی کوفت بھلا دی اور وہ یک دم خوش ہو گیا۔

”تھینک گاڈ تمہیں پسند آ گیا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے تم میرے لیے کچھ لاؤ اور مجھے پسند نہ آئے۔“

”ہاں یہ بھی ہے۔“ وہ جانتا تھا کہ اس کی دی ہوئی ہر چیز اریشہ کو بہت پسند آتی تھی یہی سبب تھا جو وہ کہیں بھی جاتا اریشہ کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور خریدتا۔ اسے اریشہ کے لئے شاپنگ کرنا ہمیشہ ہی اچھا لگتا۔

”تمہیں یاد ہے جو تم پچھلے سال میرا نام چادل کے دانے پر لکھوا کر لائے تھے مری سے، میرے پاس وہ بھی رکھا ہے اور تمہارا امریکہ سے لایا ہوا اینڈ بیگ تو میں نے کبھی استعمال ہی نہیں کیا آج تک ویسے ہی رکھا ہے جیسے تم نے مجھے دیا تھا۔“

وہ ایک ایک چیز گنتی جا رہی تھی اور اس پل جو محبت اور جذبہ اریشہ کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا وہ ایصال کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ بولتی جائے اسی طرح ساری زندگی اور ایصال سنتا جائے اسے یقین تھا وہ اریشہ کے ساتھ کبھی بور نہیں ہو سکتا، کبھی تھک نہیں سکتا اس طرح جس طرح وہ لاہور سے تھک کر آیا تھا بور ہو کر آیا تھا اریشہ کا ساتھ اس کی خوشی تھی جس کا اندازہ ایصال کو شروع سے ہی تھا، مگر آج یقین بھی ہو گیا۔



”دیکھو بیٹا ماں کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا، مگر پھر بھی میں کوشش کروں گا جو دکھ اور تکلیف تم اپنی زندگی میں اٹھا چکی ہو اب وہ تمہیں واپس نہ ملیں، میں تمہیں ماں نہیں دے سکتا اس کے علاوہ جو کچھ میرے بس میں ہو وہ تمہارے لیے ضرور کروں گا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ دھرے، دھیرے دھیرے اسے سمجھاتے ہوئے بول رہے تھے وہ رونا چاہتی تھی، مگر اس کے آنسو شاید خشک ہو چکے تھے۔ یہ سبب تھا جو سر پر دوپٹا لیے وہ خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھی سب کچھ سن رہی تھی، سمجھ رہی تھی، مگر کچھ بول نہ پا رہی تھی۔

”تم ابھی بچی ہو بہت ساری باتوں سے لاعلم، میرے بس میں ہوتا تو تمہیں آج اور ابھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا جو تمہارا بھی ہے، مگر افسوس لے کر نہیں جا سکتا اس وقت تک جب تک میں تمہیں اس گھر میں کوئی مقام نہ دلا دوں۔“

وہ جانتا چاہتی تھی کہ اتنی محبت اور ذمہ داری کے باوجود کیوں اسے یہاں تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں، کیوں اسے اپنے

اک ساگر ہے زندگی

ساتھ نہیں لے جاسکتے، مگر چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ سکی اتنا ضرور جان گئی کہ کوئی نہ کوئی مجبوری ایسی ضرور تھی جس نے انہیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسے اس طرح تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔

”بیٹا تمہارے پاس فضل دین آتا رہے گا۔ اس کا فون نمبر بھی میں نے تمہیں دے دیا ہے جب کسی چیز کی ضرورت ہو بلا دھڑک اسے فون کر دینا۔ کوئی پریشانی ہو تو میرا نمبر بھی تمہارے پاس ہے، میں بھی ہمیشہ تمہارے رابطے میں ہی رہوں گا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کھڑا ہونا پڑا۔

”اچھا بیٹا اللہ حافظ۔“ انہوں نے اسے گلے لگا کر ماتھا چوما اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ وہ اپنی جگہ پر ویسے ہی ساکت

کھڑی رہی۔

زندگی کا پہلا سفر اپنے مقام پر پہنچ کر ختم ہو چکا تھا۔ زندگی کا ایک نیا سفر اپنے آغاز کو تیار کھڑا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا پہلے سفر میں تمام تر غربت کے باوجود ماں اس کے ساتھ تھی اور اس سفر میں ہر سہولت کی فراہمی کے باوجود وہ بالکل تنہا کھڑی تھی، تنگ دست اور خالی ہاتھ وہ آج بھی ویسی ہی غریب تھی، دولت نے آکر اسے رشتوں سے محروم کر دیا ایک اکیلا واحد رشتہ کھو کر وہ اس زندگی اور غربت کو کہیں پیچھے چھوڑ آئی تھی جس سے اپنی گزری زندگی میں ہمیشہ ٹالاں رہی۔

آج اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہوا کہ رشتوں کی کمی سے بڑھ کر کمی کوئی نہیں اب شاید وہ اپنی زندگی میں سب کچھ پاسکتی تھی سوائے اس حقیقی رشتے کے جو یہاں تک کے سفر میں ہمیشہ کے لیے کہیں کھو گیا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی ماں کی یاد نے ایک بار پھر اسے گھیر لیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

○.....❖.....○

”السلام علیکم بھابی.....“ فضلہ بھابی بھی اسے دیکھتے ہی کچھ عجیب سی ہو گئی تھیں۔ اب جو یک دم اس نے قریب پہنچ کر سلام کیا تو بے اختیار چونک اٹھیں۔

”وعلیکم السلام.....“ اپنے سامنے کھڑی زینب کو دیکھ کر انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ زینب ہی ہے نک سب اور طریقے سے تیار، آج تو اس کا ڈریس بھی خاصا اچھا تھا بے شک ان کے ڈریس جتنا قیمتی نہ سہی، مگر پھر بھی زینب کے لحاظ سے اچھا تھا۔ اس پر کیا گیا نفاست سے میک اپ وہ حیران رہ گئیں۔

”پتا نہیں اللہ تعالیٰ نے اسے اس قدر حسن کیوں دے دیا۔“ وہ دل ہی دل میں سلگ سی گئیں۔

”کیا ہوا بھابی پہچانا نہیں۔“ وہ اک ادا سے مسکراتے ہوئے بولی۔

حقیقت میں قیمتی لباس نے زینب کے انداز و اطوار کو خاصا تبدیل کر دیا تھا، سچ ہے اچھا لباس اور اچھا کھانا کبھی کبھی انسان کو اپنی اوقات بھلا دیتا ہے۔ ”لو بھلا اب میں تمہیں کیسے نہ پہچانوں گی۔“

وہ اپنی حیرانی اور حسد کو چھپاتے ہوئے مسکرا دیں۔

”ماشاء اللہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔“ یہ جملہ انہوں نے کس دل سے کہا۔ یہ وہ ہی جانتی تھیں زندگی نے انہیں خاصی ڈیڑھ میس کھا دی تھی جس کا ثبوت آج وہ کھل کر دے رہی تھیں۔ ورنہ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو وہ کبھی اس طرح زینب کی تعریف نہ کرتیں۔

”شکریہ.....“ فضلہ بھابی کی تعریف نے اسے خوش کر دیا۔

”تکین سے ملی ہو؟“ تکین یقیناً صد کی سالی کا نام تھا۔

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ابھی ابھی آئی ہوں اور سیدھی آپ ہی کی جانب آگئی تھی۔ ابھی تک میں کسی سے نہیں ملی۔“ جواب دے کر اس نے ایک نظر سامنے اسٹیج پر ڈالی قیمتی ملبوسات میں بھی سنوری خواتین سے اسٹیج بھرا ہوا تھا ان ہی کے درمیان، عین سامنے صوفے پر ٹکین موجود تھی۔ جو دور سے دیکھنے میں خاصی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ ”چلو آؤ میں تمہیں اس سے ملواؤں۔“ فضا بھابی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج کی جانب بڑھیں۔ مریم انگلی تھامے اس کے ساتھ ہی تھی۔ جبکہ چھ ماہ کی جگنو فرہاد کی گود میں تھی۔ یہ بھی شکر تھا جب وہ کہیں جاتی ہے سنبھالنے میں فرہاد اس کی خاصی مدد کر دیا کرتا تھا، ورنہ تو ایسے موقعوں پر خاصی مشکل ہو جاتی، اسٹیج پر ہی اس کی ملاقات صد کی بیوی سے بھی ہوئی جو اسے دیکھتے ہی خوشدلی سے مسکرا کر گلے ملی وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی یا شاید آج نرنب کو اس کے مزاج میں اپنے لیے گرم جوشی زیادہ محسوس ہوئی۔

”اچھا ہوا آپ آج آگئیں۔ یقین جانیں میں نے کل فرہاد بھابی سے کئی دفعہ آپ کا پوچھا۔“ وہ بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔

”دراصل کل مریم کی طبیعت کچھ ٹھیک نہ تھی، ورنہ ضرور آتی۔“

”اوہو..... یہ کون ہے بھی.....“

اپنے عقب سے ابھرنے والی مردانہ آواز سن کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ جو کوئی تھا اس کی نگاہوں کا مرکز وہ ہی تھی اور شاید اس کا بولا گیا جملہ بھی اس ہی کے لیے تھا اور اگلے ہی پل نرنب کا خیال درست ثابت ہو گیا۔

”یہ میری دیورانی ہیں..... یعنی فرہاد بھابی کی بیوی۔“ صد کی بیوی نے جواب دیتے ہوئے اسے دیکھا۔

”ارے میں تو سمجھا آپ کے پاس کوئی لڑکی کھڑی ہے۔“

بات کرنے کے دوران اس کی نگاہیں مسلسل نرنب کے ارد گرد گھوم رہی تھیں۔ وہ تھوڑی سی نروس ہو گئی۔ جواباً صباحت زور سے ہنس دی۔

”برامت مایہ گا۔ یہ میرے فرسٹ کزن ہیں اور مذاق کرنا ان کی باہی ہے۔“

”آپ نے انہیں میرا نام تو بتایا نہیں، مجھے سالار کہتے ہیں اور آپ کا نام؟“

وہ ابھی بھی اتنی ہی دلچسپی سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

”نرنب.....“ آہستہ سے اس کے منہ سے نکلا، صباحت اسے وہیں چھوڑ کر ٹکین کی طرف بڑھ گئی جہاں شاید دولہا کے آنے کے بعد کوئی رسم شروع ہو گئی تھی۔

”آپ کو کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ وہ دھیمے سے ان کے کان کے قریب آ کر بولا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ بات میں خود بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لیے کسی کے بتانے کی مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔“

”اوہ..... اچھا..... ویسے میں نے تو مذاق میں تعریف کی تھی۔ آپ تو سنجیدہ ہی ہو گئیں۔“ نرنب کی بات سن کر وہ ایسے ہنسا جیسا خوب انجوائے کیا ہو۔

”ایک بات اور.....“ آگے کی طرف بڑھتے بڑھتے وہ رک گیا۔

”فرہاد کا آپ سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔“

جانے اس نے یہ بات کن معنوں میں کہی تھی۔ زینب سمجھ نہ سکی۔ مگر یہ سچ تھا کہ اسے فرہاد کے بارے میں سالار کا یہ تجزیہ بالکل پسند نہیں آیا۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی سخت جواب دیتی وہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔ زینب نے اس کی تلاش میں یہاں وہاں نظریں دوڑائیں، وہ تو نظر نہ آیا، مگر کچھ دور کھڑی فضلہ بھابی ضرور دکھائی دیں جو عجیب سی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ شاید وہ کچھ دیر قبل اس کے پاس کھڑے سالار کو دیکھ چکی تھیں۔ اسے ان کی نگاہوں میں اک معنی خیزی سی نظر آئی، پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہی تھیں۔ زینب نے گھبرا کر فرہاد کی تلاش میں اپنی نظریں گھمائیں، تاکہ اس سے پوچھے کہ گھر واپس جانا ہے، اسے فضلہ بھابی کی نظروں نے پزل کر دیا تھا۔ اسے لیے اب وہ جلد از جلد اپنے گھر واپس جانا چاہتی تھی۔



”اور تمہاری ایگزیشن کیسی رہی۔“ ماما اپنے بیک میں سے اس کے لئے لائے ہوئے گفٹس نکال رہی تھیں جب پاپا کا سوال سنتے ہی ان کا ہاتھ یک دم رک گیا۔

”وہ تو خیر اچھی رہی، میں نے آپ کو تصاویر بھی بھیجی تھیں مجھے اس دفعہ کافی اچھا رسپانس ملا۔“ ماما اپنی ایگزیشن کی کامیابی سے خاصی خوش اور پُر جوش تھیں جس کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”گڈ.....“ پاپا جواب دے کر کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

”میں تو آخری لمحوں تک آپ کی منتظر رہی مگر آپ آئے ہی نہیں جب کہ آپ نے وعدہ کیا تھا کام ختم ہوتے ہی ایصال کو لے کر آجائیں گے۔“ ماما بات کرتے کرتے رک گئیں۔ انہوں نے شاید پاپا کی بے توجہی کو بھانپ لیا تھا۔

”کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ ماما کی بات پر ایصال نے سر اٹھا کر پاپا پر ایک نظر ڈالی۔

”نہیں تو بس ویسے ہی سر میں درد ہو رہا ہے ابھی چائے پیوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے اپنی آنکھیں موند کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگالی۔

”اچھا بیٹا اب تم اپنا سامان اٹھا لو میں تمہارے پاپا کو چائے بنا کر دوں۔“

وہ ہمیشہ پاپا کو چائے خود بنا کر دیتی تھیں بہت کم ہی پاپا سیکینہ بوا کے ہاتھ کی چائے پیتے تھے انہیں صرف ماما کی بنائی ہوئی چائے ہی پسند تھی۔

”او کے ماما.....“ ایصال سامان سمیٹتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایک منٹ بیٹا۔“ انہیں شاید کچھ یاد آ گیا تھا، ایصال رک گیا انہوں نے جلدی سے بیک کی زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا

چند سیکنڈ بعد جب ان کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک چھوٹا سا شاپر تھا جو انہوں نے ایصال کی جانب بڑھایا۔

”یہ دیکھو کیسا ہے میں اریشہ کے لئے لائی ہوں۔“

جانتی تھیں کہ ایصال کو اریشہ کے لئے کچھ لینا اچھا لگتا تھا، اس سے قبل کہ ایصال ہاتھ بڑھاتا پاپا نے آگے بڑھ کر ماما کے ہاتھ سے شاپر لے لیا اسے کھول کر اندر جھانکا، ایصال کو پاپا کی یہ حرکت کافی عجیب لگی کیوں کہ وہ کبھی بھی اس طرح کی حرکت نہیں کرتے تھے۔ ماما بھی ان کے اس عمل پر تھوڑا سا حیران ہو گئیں۔ شاپر میں کچھ جیولری تھی جسے نکال کر اچھی طرح دیکھنے کے بعد پاپا نے واپس اندر رکھ کر اسے ایصال کی جانب بڑھا دیا جسے ایصال نے خاموشی سے پکڑ لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اسے یہ جیولری اریشہ کو خود دینی ہے اسی لیے ماما نے اس کے حوالے کی ہے ورنہ وہ خود بھی اسے دے سکتی تھیں۔

”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے اور میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔“ پاپا نے اپنا ہاتھ

اک ساگر ہے زندگی

دوا انگلیوں سے رگڑتے ہوئے کہا۔ پریشانی کی شدت سے ان کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں ایصال کو کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ پاپا کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنی جگہ پر رک گیا۔

”بیٹا آپ اپنے کمرے میں جائیں۔“

مما کبھی کوئی بات بچوں کے سامنے کرنے کی عادی نہیں تھیں یہ بات شروع سے ہی ایصال جانتا تھا اس لیے وہ بنا کچھ کہے باہر کی جانب بڑھا بھی اس نے قدم ہی اٹھایا تھا کہ پاپا نے آواز دے کر اسے روک دیا۔

”نہیں ایصال اپنے کمرے میں نہیں جائے گا مجھے جو بات کرنی ہے اس کے لئے ایصال کی یہاں موجودگی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی تمہاری اور میری۔“ ایصال کا اندازہ درست تھا وہ رک گیا پاپا کے رویے اور گفتگو نے مما کو خاصا پریشان کر دیا تھا جس کا بخوبی اندازہ ان کی شکل اور مسلسل انگلیاں چٹختی حرکت سے ہو رہا تھا۔

”خیریت تو ہے ایسی کیا بات ہو گئی جس کے لئے ایصال کی موجودگی ضروری ہے۔“

مما کی پریشانی ان کی آواز سے ظاہر ہو رہی تھی اور پھر پاپا نے انہیں سب کچھ بتا دیا اپنا لاہور جانا، ایصال کا نکاح غرض ہر وہ بات جو ان غیر موجودگی میں ہوئی پاپا کی بات ختم ہونے کے بعد مما کا رد عمل اتنا غیر متوقع تھا کہ ایصال دم بخود رہ گیا۔

”واٹ؟ آپ ہوش میں تو ہیں اس زمانے میں ایک ہائی فائی سکول سے اولیول کرنے والے اپنے ناسمجھ بیٹے کا نکاح آپ کس بنیاد پر کر آئے، اس کی اور اس کی ماں کی مرضی کے بغیر، وہ بھی ایک ایسی بدکردار عورت کی بیٹی کے ساتھ جس کی ماں کے کالے لکڑت آج تک سارے خاندان کو یاد ہیں۔“

اس نے کبھی اپنی ماں کو اس طرح چیخنے نہیں سنا تھا وہ تو شروع سے ہی بہت نرم گفتار تھیں اور اسی سبب پاپا کے دل پر راج کر رہی تھیں۔ آج ان کی اس چیخ و پکار نے ایصال کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا، ضرور کچھ غلط ہوا تھا جس کا اندازہ وہ اپنے پاپا کے چہرے کو دیکھ کر بھی لگا سکتا تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے کہ بھابی کینسر کے آخری اسٹیج پر تھیں اور ان کی موت کے بعد ان کی بیٹی کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ میرے بھائی کی اولاد ہونے کے ناتے وہ میری ذمہ داری تھی اور مجھے اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنے کے لئے کسی کی رضا مندی کی ضرورت نہیں، میں خود اپنے بیٹے کے ولی کے طور پر اس کے ساتھ تھا۔“

”کیوں، اس کا وہ عاشق کہاں گیا جس کے ساتھ بھاگ کر اس نے اخبارات میں اپنے اشتہار لگوائے تھے۔“ غصہ کی شدت سے کئی سالوں سے دل میں دبا رہا ایک ہی پل میں ہونٹوں تک آ گیا۔

اس نے اپنی ماما کی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہیں سنے تھے جو وہ اس وقت بول رہی تھیں۔ ماما کی گفتگو سننے ہی ایصال کو اچھی طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ ان خاتون سے کس قدر نفرت کرتی تھیں جن کے گھر وہ پاپا کے ساتھ گیا تھا اور حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ اس خاتون کو بہت اچھی طرح جانتی بھی تھیں۔ ایصال کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

”پلیز پیگم صاحبہ بہتر ہوگا آپ بچوں کے سامنے اس قسم کی گفتگو کرنے سے گریز کریں۔“

پاپا کی کمزوری آواز ایصال کے کانوں سے ٹکرائی۔

”کیوں بچوں کو پتا نہ چلے آپ انہیں کس گڑھے میں دھکیلنے والے ہیں ملک صاحب، ہر بیٹی اپنی ماں کی خصلت لے کر دنیا میں آتی ہے اور پھر اس کی تربیت بھی اس ماحول میں ہوئی جہاں اس کی آوارہ ماں جانے کن حالوں میں اسے لے کر رہ رہی تھی۔ ایسی لڑکی کبھی بھی میرے بیٹے کی بیوی بن کر اس گھر میں نہیں آسکتی ایسا کرنے کے لئے آپ کو پہلے مجھ سے جزا ہر

رشتہ ختم کرنا ہوگا۔“ پاپا نے شاید ان خاتون کی حمایت میں کچھ کہنا چاہا جسے ماما کے آخری جملے نے بالکل ختم کر دیا۔
 ”ٹھیک ہے اگر آپ ایصال کا رشتہ وہاں سے ختم نہیں کریں گے تو پھر مجھے طلاق دے دیں۔“ ماما کا لہجہ نہایت ہی سخت اور حتی تھا اب پاپا کے پاس کوئی الفاظ ایسے باقی نہ بچے تھے جن سے وہ ماما کو قائل کر سکتے۔ انہیں مخالفت کی امید تو تھی مگر اتنی شدید مخالفت کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اس آخری جملے نے ختم کر دی ان کی سمجھ میں نہیں آیا وہ مزید کیا بات کریں ان کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا۔

”ملک صاحب یاد رکھیے گا ہمارا ان سے جو بھی رشتہ تھا وہ ان کا اپنی تین سالہ بیٹی کو لے کر گھر سے بھاگ جانے پر بالکل ختم ہو گیا اب آپ دوبارہ اس گھر میں اس عورت کا نام دوبارہ مت لیجیے گا۔“

ایک بار پھر وہ ہی طعنہ اتنے سالوں بعد بھی ملک صاحب کو شرمندہ کر گیا۔ اپنے بھائی کی بیٹی کو ایک محفوظ پناہ گاہ فراہم کرنے کی ان کی دلی خواہش اس قدر خطرناک موڑ اختیار کر لے گی، اس بات کا انہیں بالکل اندازہ نہ تھا۔ اب ان کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس عمر میں وہ اپنا گھر بچائیں یا اپنے بیٹے کا، یہ فیصلہ انہوں نے قدرت پر چھوڑ دیا۔ ماما ہیں بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ ایصال اپنی جگہ بالکل ساکت و صامت کھڑا تھا۔

وہ مسئلہ یقیناً اس سے تعلق رکھتا تھا مگر اب کمرے میں موجود دونوں افراد کو اس کی موجودگی سے کچھ لینا دینا نہ تھا جس کا اندازہ ان کے اس وقت کے رد عمل کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ ایصال کے لیے بہتر تھا کہ وہ ہنا کسی معاملے میں مداخلت کیے کمرے سے باہر نکل جائے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ ماما اور پاپا کے درمیان جو بھی بات ہو اسے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ماما کی مخالفت اسے اچھی لگی اب پاپا اسے، اس جس زدہ گھر میں دوبارہ جانے کے لیے کبھی مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ مطمئن ہو گیا وہ جانتا تھا کہ ماما کے منہ سے نکل ہوئی بات کو کوئی بھی واپس نہیں کر سکتا چاہے وہ پاپا ہی کیوں نہ ہوں، وہ سمجھ گیا ماما کو وہ آنٹی پسند تھیں اور نہ ہی ان کی سبز دوپٹے والی بیٹی، ماما کی اور اس کی سوچ ہمیشہ سے ہی ایک جیسی تھی دونوں کی پسند اور ناپسند بھی ملتی جلتی تھی اسی لیے جتنی اریشہ اسے پسند تھی اتنا ہی ماما بھی اسے چاہتی تھیں اور جتنی ناپسند، ہنا دیکھے اسے وہ سبز دوپٹے والی لڑکی آئی تھی غالباً اتنی ہی وہ اس کی ماں کو بھی ناپسند تھی۔ اس نے ماما کے دیئے ہوئے شاپر پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتا تیزی سے گیٹ کی جانب چل دیا۔

اسے جلد از جلد اریشہ کے پاس پہنچنا تھا وہ ماما کی لڑائی ہوئی ساری جیولری فوراً اس کو دینا چاہتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس جیولری کو دیکھ کر وہ کس قدر خوش ہونے والی ہے اور ایصال کو ہمیشہ سے اریشہ کا خوشی سے دمکتا چہرہ اچھا لگتا۔ ابھی بھی وہ صرف اس کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھنے کی امید میں گیٹ پار کر کے روڈ پر آ گیا جہاں کچھ دور آگے اس کی عزیز از جان ہستی کا گھر تھا جو اسے شاید ساری دنیا سے زیادہ پیاری تھی۔



”میں چاہ رہا تھا اس دفعہ آفس کی میٹنگ تم انینڈ کرو۔“

پاپا پر سوچ لگا ہوں سے اس کی جانب تکتے ہوئے بولے۔

”میں.....؟“ وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

”آپ کیوں نہیں؟“ شروع سے آفس کی تمام میٹنگ پاپا ہی انینڈ کرتے تھے۔

”اس کی دو جوہات ہیں؟“ پاپا اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کھنکارے۔

اک ساگر ہے زندگی

”ایک تو یہ کہ میں چاہتا ہوں اب تم اس سلسلے میں کچھ تجربہ حاصل کرو تمہیں پبلک ڈیلنگ کرنی آئے دوسرا تم جانتے ہو میرا ڈاکٹر زیدی سے اپائنٹ منٹ ہے اور پھر اسی ہفتے وہ لندن بھی جا رہے ہیں لہذا دوبارہ وہ میرا چیک آپ ایک ماہ سے قبل نہیں کر سکتے۔“

”اوہ.....“ ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

”ٹھیک ہے آپ میری سیٹ بک کروادیں تب تک میں اپنے تمام کام سمیٹ لوں۔“ وہ کرسی پیچھے کھسکا کراٹھ کھڑا ہوا۔

”بیٹا اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں حبیبہ کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دوں؟“

پاپا کا جھجکتے ہوئے کیا جانے والا یہ سوال اس کے سن کو شانت کر گیا۔

”نہیں پاپا بھلا مجھے کیا اعتراض ہوگا، مگر وہ میرے ساتھ جا کر وہاں کیا کرے گی، میں یہ نہیں سمجھ پایا۔“

”اسے اپنی کچھ پریزنٹیشن کی تیاری کے حوالے سے یہ میٹنگ انیڈ کرنی ہے اس کے علاوہ بھی اسے وہاں کچھ ضروری

کام ہیں اب جب تک تم فارغ ہو گے وہ بھی اپنے کام نبٹا کر تمہارے ساتھ ہی واپس بھی آجائے گی۔“

وہ وہاں کیوں جانا چاہتی تھی یا میٹنگ میں اس کا کیا کام تھا اس سے شاہ زین کو کچھ سروکار نہ تھا اس کی اصلی خوشی تو حبیبہ کا ساتھ تھا جو بے شک عارضی اور چند روزہ تھا، مگر شاہ زین کے لیے فی الحال اتنا ہی کافی تھا۔ اس عارضی ساتھ کو مستقل کیسے کرنا ہے یہ وہ کافی عرصے پہلے سوچ چکا تھا۔

”ویسے آپ نے اسے سلسلے میں حبیبہ سے بات کر لی ہے۔“

حبیبہ اس کے ساتھ اکیلی جانے پر شاید کبھی آمادہ نہ ہو اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے پاپا سے سوال کیا۔

”ہاں دراصل حبیبہ کو اپنی کچھ اسناد کی وصولی کے لئے وہاں جانا از حد ضروری تھا اور وہ تمہا جانا ہی چاہ رہی تھی اسی لئے

میں نے اسے آفر کی کہ وہ تمہارے ساتھ چلی جائے اس کی رضا مندی کے بعد میں نے تم سے بات کی ہے۔“

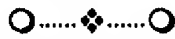
پاپا کی بتائی جانے والی تفصیل کے دوران اس نے شیشے کی دیوار کے اُس پار موجود حبیبہ کی ٹیبل پر ایک نظر ڈالی جو اس کے وجود سے خالی تھی۔

”وہ اپنے گاؤں گئی ہے کل صبح تک آجائے گی تمہاری میٹنگ رات میں ہے، میں تیمور کو فون کر دیتا ہوں وہ کل شام کی

سیٹ بک کروادے۔“

فون اپنے قریب کر کے وہ تیمور کا نمبر ملانے لگے۔ شاہ زین کمرے سے باہر نکل آیا حبیبہ کے گاؤں جانے کا سن کر اس

کا آفس میں مزید جی نہ لگا اور کچھ ہی دیر بعد وہ گھر جانے کے لیے پارکنگ کی جانب آ گیا۔



وہ جب سے گھر آئی تھی کچھ کم مسمی تھی اس کی اس کیفیت کو فرہاد نے محسوس ضرور کیا، مگر بولا کچھ نہیں۔ زینب نے

خاموشی سے اپنے کپڑے تبدیل کیے اور سادیہ کا سوٹ لپیٹ کر شاہ پر میں ڈال کر رکھ دیا، مریم اور جگنو دونوں سو گئی تھیں وہ ہمیشہ

کہیں سے آنے کے بعد رات میں چائے ضرور پیتی تھی، مگر آج ایسا نہ ہوا کپڑے تبدیل کر کے منہ ہاتھ دھو کر وہ خاموشی سے

بستر پر آ کر لیٹ گئی۔

”زینب.....“

فرہاد سے اس کی یہ خاموشی برداشت نہ ہوئی۔

”جی.....“ وہ چپٹ لیٹی جانے چھت پر کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

”کیا بات ہے؟ کیا تمہیں وہاں کسی نے کچھ کہا ہے؟“

وہ اس کی خاموشی سے یہ ہی نتیجہ اخذ کر سکا۔

”نہیں مجھے کوئی کیوں کچھ کہے گا۔“ وہ اپنے خیالوں سے چوگی، فرہاد کی جانب دیکھا۔

”کہیں اسے فضا بھابی نے تو کچھ نہیں بتا دیا، میرا سالار سے بات کرنا انہیں خاصا ناگوار لگ رہا تھا۔“ یہ خیال ذہن

میں آتے ہی وہ بے چین ہو گئی۔

”انہیں تو ویسے بھی عادت ہے ایک کی چار بنانے کی۔“ اسی خوف نے اس کے دل میں بچہ گاڑا ہوا تھا۔

”جب سے تم واپس آئی ہو اس قدر خاموش کیوں ہو؟“

”ویسے ہی تھک گئی ہوں۔“ اس نے اپنی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی۔

”آج تمہارا سوٹ اچھا لگ رہا تھا۔“ دیر سے فرہاد کے دل میں آئی بات اس کی زبان پر آ گئی۔

”میرا نہیں سادیہ کا سوٹ۔“ وہ جتاتے ہوئے بولی۔

”ہاں مگر پہنا تو تم نے ہی تھا اسی لیے تمہارا ہی کہوں گا۔“ فرہاد اس کا طنز سمجھ نہ پایا۔

”اچھا.....“

وہ کروٹ لے کر سوتی بن گئی کیوں کہ اس کا دل اب مزید اس موضوع پر بات کرنے کو بالکل نہ چاہ رہا تھا۔ آنکھیں بند

کرتے ہی بنا سوچے سالار کا سراپا اس کے سامنا آن کھڑا ہوا۔

”آپ کو کبھی کسی نے بتایا نہیں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ اس کی آواز زینب کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس نے

پٹ سے آنکھیں کھول دیں تعریف تو آج اس کی فرہاد نے بھی کی تھی، مگر کس قدر فرق تھا دونوں کی تعریف میں، فرہاد کی تعریف

ڈھکے چھپے لفظوں میں تھی اور سالار کی کھلے الفاظ میں بنا کسی جھجک کے، وہ لبوں ہی لبوں میں مسکرا دی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ

عورت ہمیشہ اپنی تعریف کی بھوک ہوتی ہے، جھوٹے الفاظ میں کی جانے والی تعریف بھی کسی سخت دل عورت کے دل کو زما

نے کے لئے کافی ہوتی ہے، ابھی بھی زینب کا دل چاہا کہ فرہاد اس کے حسن کی تعریف کرے ایسی تعریف جس میں سادیہ کے

کپڑوں کا ذکر نہ ہو۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا، فرہاد کی بند آنکھیں دیکھ کر وہ اپنا دل موس کر رہ گئی۔ وہ

گہری نیند کی وادیوں میں اتر چکا تھا جس کا ثبوت اس کے حلق سے برآمد ہونے والے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز دے رہی

تھی۔



”بھابی اب آپ بھی شادی کر لو۔“ کئی دنوں سے رابعہ اس سے یہ بات کرنا چاہ رہی تھی اور آج اسے قدرت نے خود

موقع فراہم کر دیا اور نہ تو وجاہت جب بھی کبھی کھانا کھانے اس کے گھر آتا اتنی افراتفری میں ہوتا کہ وہ چاہ کے بھی بات نہ کر

پاتی، مگر آج شاید وہ کچھ فرصت میں تھا اس لیے اطمینان سے چھوٹی ٹیبل اپنے سامنے رکھے رابعہ کے روٹی پکانے کا انتظار کر رہا

تھا۔ رابعہ نے جلدی جلدی سالن پلیٹ میں نکالا گرم روٹی کپڑے میں لپیٹی اور کھانا اس کے سامنے لا کر رکھا اور ساتھ ہی اپنے

دل میں آیا مدعا بیان کر دیا۔

”کیوں کیا تمہیں میری دو روٹیاں پکانی مشکل لگتی ہیں؟“ ٹرے اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

اک ساگر ہے زندگی

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ، بھلا آپ جیسے بھائی کی درویشیاں بھی کسی بہن پر بھاری ہو سکتی ہیں آپ کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔“ وہ قدرے برا ماننے ہوئے بولی۔

”جانتا ہوں پاگل لڑکی یہ تم لوگوں کی محبت ہی تو ہے جو..... زندگی میں یہ سب کچھ کیا در نہ تو تھا میں کچھ بھی نہ تھا۔“

”آپ میری بات کو گھمائیں مت، جو میں نے کہا ہے مجھے اس کا جواب دیں۔“

”کس بات کا جواب؟“ وجاہت جان بوجھ کر انجان بنا۔

”اچھا بتاؤ تم نے مچھلی فائزہ کے گھر بھیج دی تھی۔“ فائزہ ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی جس کی شادی کے فرض سے

تین سال قبل ہی وجاہت فارغ ہوا تھا اور وہ رابعہ کے گھر سے دوا شاپ دور رہتی تھی۔

”ہاں بھیج دی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ آپ شکار کر کے لائے ہو۔ رستم کا حصہ فریز کر کے رکھ دیا ہے جب

آپ حیدر آباد جاؤ تو لے جانا اور کچھ پوچھنا ہے آپ کو تو وہ بھی ابھی پوچھ لیں۔“

وہ غصہ سے منہ بناتے ہوئے بولی۔ کھانا کھاتے وجاہت نے اپنی چھوٹی بہن کے پھولے ہوئے منہ کو دیکھا تو ہنس دیا

جانتا تھا کہ اس کی بہنیں اس سے کس قدر پیار کرتی ہیں۔

”چلو تم ناراض مت ہو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اس عمر میں کون بے وقوف لڑکی ہوگی جو مجھ سے شادی کرے گی۔“

وہ خاصا حقیقت پسند شخص تھا اور ہر بات کو گہرائی سے جانچنے کا عادی تھا۔

”کیا مطلب اس عمر میں، اللہ خیر کرے ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے بمشکل پینتالیس سال اور دیکھنے میں تو آپ چالیس

سے بھی زیادہ کے نہیں لگتے ویسے بھی بھائی آپ کس طرح ساری زندگی تنہا گزاریں گے، ساری دنیا جانتی ہے کہ کیسے آپ نے

ہم تینوں بہن بھائیوں کے فرض نبھائے ہیں اسی میں آپ کا بچپن اور جوانی گزر گئی تو کیا اب ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم بھی کچھ

ایسا سوچیں جو آپ کی زندگی کو اہل کر دے۔ کم از کم آپ کو گھر میں دو وقت پکی ہوئی روٹی تو ملے اب یہ مت کہہ دینا کہ ہمیں

آپ کی روٹی بھاری ہے۔“

وجاہت کی کبھی ہوئی بات کو اس نے پھر سے جتلیا۔

”میرا خیال ہے کہ میرے لیے تم لوگ کافی ہو اب میرے دل میں شادی بیاہ کی کوئی خواہش باقی نہیں رہی اور نہ ہی یہ

عمر ایسے چو نچلے کرنے کی ہے۔“

وہ اپنا کھانا ختم کر چکا تھا، اسی لیے کرسی کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”بہر حال آپ کچھ بھی کہو میں نے خالدہ خالہ

سے کہہ دیا ہے کہ وہ آپ کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دکھائے اور اب جو لڑکی مجھے پسند آئے گی آپ کو اس سے شادی بھی کرنا

پڑے گی۔“

وہ باقاعدہ دھونس جماتے ہوئے بولی، وجاہت نے کوئی جواب نہ دیا محض میں لگا نلکا کھول کر اچھی طرح منہ دھویا اور

قریبی تار پر پھیلے تولیے سے صاف کیا تولیہ تار پر واپس ڈالا رابعہ کی بات کو قطعی نظر انداز کرتا وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ

سائٹ پر اپنا کام ادھورا چھوڑ کر کھانا کھانے گھر آیا تھا اب اسے واپس جا کر پھر سے کام شروع کر دانا تھا اور ویسے بھی اپنے

باپ کی وفات کے بعد بہت ہی چھوٹی عمر سے وہ اپنے گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے خود سے قطعی غافل ہو چکا تھا۔ وہ عمر

جس میں عشق و عاشقی کے خواب دیکھے جاتے ہیں اس عمر میں اس نے اپنی ماں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری کرتے ہوئے

اپنے چھوٹے بہن بھائی پالے اپنی حیثیت کے مطابق انہیں تعلیم دلا کر اچھی جگہ ان کی شادیاں کیں، جب تک اس کی ماں

اک ساگر ہے زندگی

زندہ رہی اسے کبھی کسی بہن کے گھر کھانا کھانے بھی نہ جانا پڑا۔ مگر اب ماں کی وفات کے بعد وہ اکثر رابعہ کے گھر سے ہی کھانا کھاتا کیونکہ باہر کا کھانا اس کا معدہ ہضم نہ کرتا تھا۔ اس کے بدلے وہ ہمیشہ رابعہ کو کچھ نہ کچھ دیتا رہتا باوجود اس کے منع کرنے کے، اس کا چھوٹا بھائی رستم حیدر آباد میں رہتا تھا وہیں کسی میڈیسن کہنی میں اس کی اچھی جاب تھی جبکہ اس کی بیوی کا تعلق بھی حیدر آباد سے ہی تھا۔ وجاہت مبینے ایک بار، ایک ہی دن کے لیے سہی حیدر آباد کا چکر ضرور لگاتا کیونکہ جب تک وہ رستم کو دیکھ نہ لیتا اسے سکون بھی نہ ملتا۔



وہ اریشہ کی سنگت میں بڑی خوشی خوشی گھر کے اندر داخل ہوا مگر سامنے موجود اپنے پاپا کو دیکھتے ہی کچھ عجیب سا ہو گیا حالانکہ اس کے پاپا نے کبھی بھی اریشہ اور اس کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ ویسے بھی وہ اس کے اکلوتے ماموں کی بیٹی تھی مگر پھر بھی جانے کیوں اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا جیسے پاپا کو ان دونوں کا ساتھ بالکل پسند نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی جو اس وقت پاپا کو اچانک گھر میں موجود دیکھ کر وہ کچھ پزل سا ہو گیا اور گھبرا کر اریشہ کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”السلام علیکم انکل!“ ایصال کے اشارہ کر کے متوجہ کرنے پر اس نے ملک صاحب کو سلام کیا اور نہ عام طور پر وہ ایسی فارسی بھانے کی قطعی قائل نہ تھی۔ ملک صاحب نے اپنے سامنے پھیلے اخبار سے نظریں اٹھا کر ذرا کی ذرا اس پر ایک نظر ڈالی۔ جینز کے ساتھ چھوٹی سی سیلوئس ٹاپ، کندھوں تک آتے سلکی کالے بال دھوپ سے اندر آنے کے باعث اس کے گورے رنگ میں ہلکی سی سرخی گھل گئی تھی۔ ان کے تصور میں وہ سیدھی سادی گندی رنگت والی لڑکی آگئی جس کا نام وہ اپنے بیٹے کے نام کے ساتھ جوڑ چکے تھے بنایہ جانے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور شاید ایسا انہوں نے صرف اپنے بھائی کی محبت میں کیا تھا مگر جب وہ ایصال اور اریشہ کو ایک ساتھ دیکھتے انہیں اپنے فیصلے کی غلطی کا احساس ہوتا انہیں لگتا انہوں نے کوئی بھی قدم اٹھانے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔

”وعلیکم السلام۔ کہاں سے آرہے ہو تم لوگ.....“ بظاہر ان کا سوال بڑا سرسری سا تھا مگر جانے کیوں اس سوال میں ایصال کو کچھ ایسا نظر آیا کہ وہ تھوڑا سا گڑبڑا گیا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

”ہم لنچ کرنے گئے تھے انکل.....“

تھوڑی دیر ایصال کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے کے بعد اریشہ نے خود ہی جواب دینا بہتر جانا ویسے بھی وہ خاصی پُر اعتمادی لڑکی تھی۔

”اصل میں آپ کو شاید علم نہیں، میرا بپو کے میں ایڈمیشن ہو گیا ہے اور میں جلد ہی وہاں جانے والی ہوں اسی سلسلے میں آج میں نے ایصال کو ڈریٹ دی تھی۔“

خوشی خوشی اس نے ساری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔

”اوہ گڈ یہ تو بہت اچھی بات ہے بہت بہت مبارک ہو تمہیں بیسٹ آف لک.....“

اریشہ کے جانے کی خبر سن کر انہیں دلی طور پر خوشی ہوئی وہ ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھے جب ایصال کو اریشہ سے تھوڑا دور کر کے اس کی منکوحہ سے ملنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اسی طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکیں مگر اریشہ کی اگلی بات نے انہیں پل بھر کے لیے سن کر دیا۔

”اصل میں انکل ایصال نے بھی ایڈمیشن کے لیے میرے ساتھ ہی اپلائی کیا تھا مگر پتا نہیں کیوں اسے انٹرویو کے لیے

لیٹ کال کیا گیا ہے میرا خیال ہے کہ دو دن بعد اس کا بھی انٹرویو ہے کیوں ایصال تم نے انکل کو بتایا نہیں۔“
اپنے بال کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے اس نے ایصال سے پوچھا۔ ملک صاحب کے چہرے پر چھائی حیرانی بھانپ کر وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ اس اطلاع سے بے خبر ہیں جب کہ ایصال، ایشہ کے اس بے موقع سچ پر تھوڑا سا بوکھلا گیا۔ اس کے اس عمل کی اطلاع صرف ماما کو تھی بلکہ یہ قدم ہی اس نے ان ہی کی ایما پر اٹھایا تھا ان کا خیال تھا کہ ملک صاحب کی گلے ڈالی جانے والی بلا سے بچنے کا اس سے بہتر حل کوئی اور نہ تھا اور وہ سارا پروسیس مکمل ہونے کے بعد اس کی اطلاع گھر کے دیگر افراد کو دینا چاہتی تھیں۔ بشمول پاپا مگر ایشہ نے ایک سکیڈ میں پٹر پٹر بول کر سارا بھانڈا پھوڑ دیا اب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

”تم نے ایڈمیشن کے لیے کب اور کہاں اپلائی کیا ہے۔“

پاپا نے اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے ایسے ظاہر کیا جیسے یہ اطلاع ان کے لیے کسی خاص اہمیت کی حامل نہ ہو۔ ان کے دل میں کیا تھا اس کا اندازہ چہرے لگانا ہی مشکل ہی نہیں اس کی عمر کے حساب سے ناممکن بھی تھا۔
”میں نے بھی اسی یونی میں اپلائی کیا ہے جس میں ایشہ کا ایڈمیشن ہوا ہے اور یہ یو کے کی ایک اچھی یونیورسٹی ہے۔“
”اچھا.....“

اس کی ساری وضاحت کے جواب میں وہ فقط اتنا ہی بولے اور پھر سے اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے ایصال نے ایشہ کو اشارہ کیا اور دونوں ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے۔



زینب کے گھر کے اوپر پورشن کی تیاری کا کام تکمیل کے آخری مراحل میں تھا اوپر والا حصہ اتنی جلدی مکمل ہوا کہ کبھی کبھی زینب بھی حیران رہ جاتی اور یہ صرف فرہاد کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان چھ ماہ میں، اس نے اس گھر کی تیاری کے لیے دن رات ایک کر دیئے تھے وہ اسٹور کے بعد جتنا ٹائم بچتا مزدوروں کے سر پر کھڑا رہتا۔ اس کے علاوہ اس نے گھر کے اخراجات سے بھی مزید ہاتھ کھینچ لیا تھا اس امر میں کی جانب والی زینب کی ہر شکایت کا اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے ان ہی کے لیے کر رہا ہے اور یہ کہ اسے کچھ بھی اپنے ساتھ لے کر قبر میں نہیں جانا۔ پل بھر کو زینب کا دل چاہتا کہ پوچھے جب جوانی ہی دو کپڑوں میں گل سرگز گزرتی تو پھر کیا فائدہ سینت سینت کر جمع کیے گئے ان تمام پیسوں یا کسی بھی جائیداد کا۔
”دیکھو زینب تمہاری تمام شکایات بجا مگر یہ بھی تو سوچو کہ ہماری دو دو بیٹیاں ہیں کل کو ان کی شادیاں کرنی ہیں اور پھر میں ساری زندگی اتنی محنت نہ کر سکوں گا تو بہتر نہیں ہے کہ بڑھاپے کے لیے کچھ بچا لیا جائے۔“

عید کی تیاری کے حوالے سے اس نے جوشا پنگ زینب کو کروائی تھی وہ اسے لے کر ابھی تک ناراض تھی، فرہاد نے ہر چیز کم سے کم پیسوں میں خریدنے کی کوشش کی تھی اس کا کہنا تھا کہ ابھی مکان میں رنگ دروغن، فرش کی تیاری اور دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں کی مد میں خاصی رقم چاہیے وہ مکان کرائے پر چڑھاتے ہی ایڈوانس کی رقم سے اس کی کچھ مزید خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ یہ فرہاد کا وہ وعدہ ہے جو ساری عمر وفا نہیں ہوا اب اس سے مزید کچھ کہنا بے کار تھا، سارا سامان اسی طرح چارپائی پر ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اگلے چند دنوں میں اوپر والا پورشن مکمل طور پر تیار ہو گیا۔ اس دن فرہاد کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی وہ زینب کو پورشن دکھانے کے لیے اوپر لے آیا۔ چھ ماہ میں پہلی بار وہ اوپر آئی تھی دن میں وہاں کوئی

نہ کوئی مزدور کام کر رہا ہوتا اور شام کے بعد چھا جانے والے اندھیرے کے باعث وہ کبھی بھی اوپر نہ آتی، آج جواد پر آئی تو پورا پورشن دیکھ کر حیران رہ گئی۔ فرہاد کا دل کھول کر لگایا گیا پیسہ نظر آ رہا تھا چپس کا دانے دار رنگین فرش بالکل ویسا جیسا فضا بھابی کے گھر کا تھا، کمروں کے ساتھ ملحق اٹیچڈ باتھ جو اس کے ہاتھ روم سے لاکھ درجے اچھے تھے۔

”میرا خیال ہے تم نیچے والا پورشن کراہیے پر دے دو ہم اوپر شفٹ ہو جاتے ہیں۔“

پورے گھر کا ایک چکر لگانے کے بعد وہ پورے استحقاق سے بولی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔“

فرہاد نے گیلری کا دروازہ کھولتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”جانتی ہو نیچے والے گھر میں کتنا کام ہے کون اس کا اتنا کراہیے دے گا جتنا میں نے اس حصہ کی ڈیمانڈ کی ہے اور دو

پارٹیاں تو تیار بھی ہو گئی ہیں انہیں صرف ایڈوائس کا تھوڑا مسئلہ ہے جیسے ہی وہ ملے ہو گیا مکان کرائے پر چڑھ جائے گا۔“

فرہاد کے اتنے روکھے جواب نے زینب کو بالکل خاموش کر دیا۔ ”ویسے بھی نیچے والا حصہ ٹھنڈا ہے اوپر چادروں کی

چھت کے باعث گرمی زیادہ ہے اور اتنی گرمی بچیاں برداشت نہیں کر سکتیں۔“

اپنے دو ٹوک جواب کے نتیجے میں وہ زینب کی خاموشی غالباً بھانپ چکا تھا اسی لیے اپنی بات کو دوسرا رخ دیتے ہوئے

بولی۔

”کاش یہ بچیوں کے بجائے گرمی کے حوالے سے میرا بھی کچھ احساس کر لیتا۔“

ایک منفی سوچ اس کے دماغ میں آ کر دل میں اتر گئی وہ اب بھی کچھ نہیں اور پھر جب تک وہ اوپر رہی بالکل خاموش

رہی۔ اس دن کے بعد سے اس نے، اس حوالے سے دوبارہ فرہاد سے کوئی بات نہ کی، مکان کرائے پر چڑھ گیا اس کا کراہیے آنا

شروع ہو گیا، مگر اس اضافی آمدنی سے بھی فرہاد کے رومل میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ گھر اور زینب کے اخراجات کے

حوالے سے جیسا وہ شروع دن سے تھا ویسا ہی ابھی بھی تھا دانتوں سے پکڑ کر پیسہ خرچ کرنے والا۔

○.....◇.....○

”ایشال نے یو کے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا اور تم نے مجھ سے اس بات کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ

سمجھا۔“

وہ جب کمرے میں آئے تو سامنے ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھی اپنی نصف بہتر سے شکایت کیے بنا نہ رہ سکے۔

”آپ کو پتا تو تھا کہ اس کا اے لیول مکمل ہو چکا ہے اور ظاہر ہے کہ اسے آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے کسی نہ کسی

یونیورسٹی میں اپلائی تو کرنا ہی تھا، پھر اس میں اتنی حیرت والی کیا بات ہے اور ویسے بھی ملک صاحب آج کل کے بچے اپنے

سب کام خود کرنے کے بعد والدین کو اطلاع دیتے ہیں، بھائی صاحب کو بھی اسی دن پتا چلا تھا جس دن ایشہ اپنے انٹرویو میں

کامیاب ہوئی تھی۔“

اب اس میں کتنا چٹا تھا کتنا جھوٹ وہ جانچ نہ سکے۔

”پاکستان میں دنیا بھر کی بہترین یونیورسٹیاں موجود ہیں پھر کیا ضرورت ہے اسے ملک سے باہر جانے کی، اپنی تعلیم وہ

یہاں کی کسی اچھی یونیورسٹی میں مکمل کر سکتا ہے۔“

”آپ نے پاکستان کے حالات دیکھے ہیں۔“

اک ساگر ہے زندگی

ہاتھوں پر لوٹن ملتے ہوئے انہوں نے ڈریسنگ کے شیشے میں نظر ڈالی۔ انہیں اپنے بالکل عقب میں ملک صاحب کا عکس دکھائی دیا ایک عجیب سی بے چینی ان کے چہرے پر واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی اس پریشانی کے پس منظر میں کیا تھا وہ بنا پوچھے جان چکی تھیں مگر اس وقت اس حوالے سے کوئی بات کر کے وہ ماحول خراب نہ کرنا چاہتی تھیں۔

”تو کیا ان حالات کے باعث پاکستان کے بچوں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟“

انہوں نے ذرا سارک کر سانس لیا۔

”اللہ کا شکر ادا کرو ہمارے بچے بہترین گاڑیوں میں سفر کر کے، یہاں کے بہترین سکول میں تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ ان حالات میں تو وہ بچے بھی پڑھ جاتے ہیں جو بسوں میں دھکے کھاتے ہیں ان کی رہائش بھی ان علاقوں میں ہے جہاں کے حالات ہم سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔ ہم جیسے پوش ایریا میں رہنے والے اپر کلاس کے لوگوں کو ان حالات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور جنہیں فرق پڑتا ہے وہ ان حالات سے گھبرائے بنا اپنی ہر طرح کی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔“

”کل اس کا انٹرویو ہے دعا کریں وہ کامیاب ہو جائے۔“

ملک صاحب کی ساری باتوں کا مختصر سا جواب دے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ملک صاحب کا دل چاہا وہ پوچھیں ایشال کے اس طرح ابرو ڈچلے جانے کے بعد اس لڑکی کا کیا ہوگا جو اس کے نکاح میں ہے مگر پچھلے تین سالوں سے جس طرح وہ اس مسئلہ پر خاموش تھے ابھی بھی خاموش ہو گئے فی الحال خاموشی ہی ان کے حق میں بہتر تھی۔



وہ میٹنگ اینڈ کرنے کے لیے ایئر پورٹ سے ہی سیدھے ہوٹل پہنچے آفس کی گاڑی بمعہ ڈرائیور ان کے ساتھ تھی، میٹنگ کے بعد ڈنر سے فارغ ہوتے ہوئے گیارہ بج گئے۔ شاہ زین نے محسوس کیا کہ اس پہلی بزنس میٹنگ میں شاید غیر ارادی طور پر جیبہ نے اس کی کافی مدد کی ہے۔ جیبہ کی خود اعتمادی اور دیگر معلومات نے اسے جگہ جگہ چونکا دیا۔ گاؤں کی رہائشی ایک لڑکی اتنی قابل اور پُر اعتماد بھی ہو سکتی تھی وہ حیرت زدہ تھا جیبہ کی اس مدد کے بدلے اس نے دل سے اس کا شکریہ ادا کیا جسے قبول کرتے ہوئے وہ کافی خوش دکھائی دی۔ ڈنر کے بعد اسے قریبی ایک ہوٹل جانا تھا۔ جہاں اگلے اٹھارہ گھنٹوں کے لیے اس کا روم بک تھا کیونکہ کل کا سارا دن جیبہ نے یہاں رہ کر اپنے کچھ کام مکمل کرنے تھے اور پھر اسی دن رات میں ان کی واپسی تھی۔ اسے اپنے روم کی بنگ کی پتا تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ جیبہ نے رات کہاں گزارنی ہے۔ اس شش و پنج میں وہ ڈائمنگ ہال سے نکل کر پارکنگ کی جانب آگیا جہاں اس کی گاڑی کے قریب ہی ایک دوسری گاڑی بھی موجود تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک باریش شخص سر پر ٹوپی لیے موجود تھا۔

”سلام چاچا جی.....“

گاڑی میں بیٹھے شخص کو دیکھتے ہی جیبہ اس کی جانب لپکی۔

”ولیکم السلام بیٹا۔“

جواب کے ساتھ ہی اس نے پیچھے کالا کھول دیا۔

”سر میری گاڑی آگئی ہے میں اپنی آٹنی کے گھر جا رہی ہوں جہاں سے اپنے تمام کام ختم کرتے ہی میں ان شاء اللہ کل شام تک آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ویسے آپ کا موبائل نمبر میرے پاس ہے اگر ضرورت پڑی تو میں آپ سے خود ہی رابطہ کر لوں گی اللہ حافظ۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ شاہ زین کا کوئی بھی جواب سنے بغیر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اگلے ایک سیکنڈ میں گاڑی ریورس ہو کر نہایت تیزی سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ اندر بیٹھی حبیبہ کا چہرہ اتنا بے تاثر تھا جیسے وہ باہر کھڑے شاہ زین کو بالکل جانتی ہی نہ ہو اس کے اس رویہ نے شاہ زین کو تھوڑا سا حیران کر دیا۔

”بندہ پاس سے گزرتے ہوئے ہاتھ ہلا کر سائیکل ہی پاس کر دیتا ہے حد ہے ایسے پاس سے گزر گئی جیسے جانتی ہی نہ ہو۔“

دھیرے دھیرے آگے بڑھتی حبیبہ کی گاڑی کو دیکھتے ہوئے اس نے اپنے دل میں سوچا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا دوسرے ہی پل گاڑی میں بیٹھا وہ اپنی مطلوبہ منزل کی جانب رواں دواں تھا۔



پیسے جمع کر کے فرہاد نے ایک چھوٹی سی سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی جسے دیکھ کر پہلی بار زینب کو تھوڑی سی خوشی کا احساس ہوا۔ بے شک یہ گاڑی اسفند اور صد بھائی کی گاڑیوں جیسی عالیشان نہ تھی مگر پھر بھی کسی لکڑی کی جانب رکھا جانے والا وہ پہلا قدم تھا جس نے زینب کے دل میں کئی امیدیں جگا دی تھیں۔ جب شام میں وہ فرہاد اور اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ سی ویو گئی تو خاصی خوش تھی۔ مریم اور فرہاد سارا ٹائم پانی میں رہے جبکہ وہ جگنو کو گود میں لیے باہر بیچ پر بیٹھی رہی۔ اسے پانی میں جانا کچھ خاص پسند نہ تھا اسی لیے وہ مریم اور فرہاد کو انجوائے کرتا دیکھ کر خوش ہوتی رہی، ان دونوں کے پانی سے باہر نکلتے ہی وہ گھر جانے کے لیے سامنے پارک کی ہوئی گاڑی کے قریب آگئے۔

”تم یہاں رکو میں کچھ کھانے کے لیے لاتا ہوں۔“

مریم کی انگلی پکڑے وہ سامنے کھڑے برگر کے ٹھیلے کی جانب بڑھ گیا، زینب نے جگنو کو گاڑی میں بٹھا دیا اور خود گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی جب جانے کہاں سے پیک دم ہی سالار اس کے سامنے آن کھڑا ہوا زینب کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آگئی جبکہ زینب ایسے ہو گئی جیسے اسے جانتی ہی نہ ہو۔

”ارے آپ یہاں اکیلی کیا کر رہی ہیں۔“

وہ ایسے بولا جیسے دونوں کے درمیان صدیوں کی جان پہچان ہو۔

”میں اکیلی نہیں اپنی فیملی کے ساتھ ہوں۔“ زینب کا جواب خاصا روکھا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے موجود اجنبیت کا احساس ہوتے ہی سالار نے پوچھا اس کی توقع کے برعکس زینب کے چہرے پر پہچان کی کوئی رتق تک نہ تھی۔

”جی آپ کا خیال بالکل درست ہے۔“ وہ ہی پرانا سپاٹ لہجہ، سالار تھوڑا شرمندہ سا ہو گیا۔

”میں سالار ہوں مسز صد کا فرسٹ کزن، میرا خیال ہے کہ نکلیں کی شادی کے موقع پر ہماری ملاقات ہو چکی ہے اپنی وے ایک منٹ رکھیں میں آپ کو اپنی سسر سے ملواتا ہوں۔“

اس کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ واپس پلٹ گیا۔

”مسز.....“ زینب نے دل ہی دل میں دوہرایا سالار کے منہ سے اسے یہ لفظ بالکل بھی اچھا نہ لگا اب تک وہ اسے کنوارا ہی سمجھ رہی تھی اور پھر فوری طور پر سالار کی واپسی ایک دہلی تپتی لڑکی کے ساتھ ہوئی جو اپنی سانولی سلونی رنگت کے ساتھ سر پر لیے بلیک اسکارف میں زینب کے سامنے بالکل مانع دکھائی دے رہی تھی۔

”جانے اللہ تعالیٰ بندوں کے جوڑ کیا سوچ کر بناتا ہے۔“ اس لڑکی کے پاس سے آتی قیمتی پرنیوم کی خوشبو اور مہکتے ترین

لباس کو دیکھتے ہی وہ بے اختیار اللہ سے شکوہ کر بیٹھی۔

”سچ ہے نصیب کا تعلق خوبصورتی سے نہیں ہوتا اور نہ شاید آج وہ دنیا کی بانصیب عورتوں میں سے ایک ہوتی۔“ شاید وہ لوگوں کے ظاہر سے متاثر ہونے کی عادی ہو چکی تھی۔

”السلام علیکم۔“ لڑکی قریب آ کر اس سے بڑے تپاک سے ملی۔

”علیکم السلام۔“ اس کے انداز میں گرم جوشی کا فقدان تھا اس لڑکی کا کیا نام تھا وہ سن سالا رہتی بس اس کا اتنا تعارف ہی زینب کے لیے کافی تھا۔

”سالار نے آپ کی جتنی تعریف کی تھی آپ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔“

زینب نے حیرت سے اسے ٹکا، کسی قسم کا کوئی حسد اس کے لہجہ میں نہ تھا زینب کو دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوئی تھی جس کا احساس اس کے چہرے کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا اور نہ عام طور پر کوئی عورت اپنے میاں کے منہ سے کسی دوسری عورت کی تعریف سننا پسند نہیں کرتی، جانے یہ کیسی لڑکی تھی، زینب ابھی تک حیران تھی۔

”اوہو یہ سالار صاحب یہاں کیسے آ گئے۔“

وہ اس لڑکی کا جائزہ لینے میں اتنی مگن تھی کہ فرہاد کب واپس آیا اسے پتا ہی نہ چلا۔ اب جو پلٹ کر دیکھا تو فرہاد کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گر کا تھیلا دیکھ کر عجیب شرمندہ سی ہوئی۔

”میں ابھی کچھ دیر قبل جب آپ سامنے ٹھیلے پر کھڑے تھے۔“ سالار نے بھی فرہاد کے انداز میں ہنستے ہوئے جواب دیا مگر جانے کیوں اسے محسوس ہوا جیسے اس نے ٹھیلے کا ذکر جان بوجھ کر کیا ہے۔

فرہاد نے ہاتھ میں پکڑا تھیلا ان کی جانب بڑھایا، زینب شرمندگی سے وہیں زمین میں گڑ گئی سالار کی موجودگی میں اسے خود بھی ٹھیلے سے خریدے گئے یہ برگر کچھ عجیب سے لگ رہے تھے اوپر سے ستم ظریفی کہ فرہاد انہیں بھی آفر کر بیٹھا۔

”نہیں شکریہ فرہاد بھائی اصل میں ہم سامنے ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے جا رہے ہیں بلکہ میں تو آپ سے یہ کہوں گا کہ آپ لوگ بھی آجائیں مل کر انجوائے کریں گے۔“

سہولت سے فرہاد کو انکار کرتے ہوئے اس نے خود اپنی آفر دے دی۔

”نہیں یار پھر کسی ٹائم اکٹھے انجوائے کریں گے ابھی تو ہم گھر جا کر آرام کریں گے بچے کافی تھک گئے ہیں۔“

سالار سے گلے مل کر وہ گاڑی میں آ بیٹھا، گاڑی کے آگے بڑھتے ہی غیر ارادی طور پر زینب نے سائیڈ کے شیشے سے پیچھے اس جگہ دیکھا جہاں سالار اپنی بیوی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر زینب کی گاڑی کو جاتا دیکھتا رہا اور پھر قریب موجود اپنی بڑی سی سلور کار میں بیٹھ گیا اور جب فرہاد نے اگلے روڈ سے موڑ کاٹ کر گاڑی دوسری سڑک پر ڈالی تو سڑک کے دوسری جانب بنے ریسٹورنٹ کے دروازے سے سالار اور اس کی بیوی اندر داخل ہو رہے تھے۔ زینب نے جوس ختم کر کے خالی ڈبا باہر روڈ پر پھینک دیا، برگر کھانے کو اس کا دل بالکل بھی نہ چاہا حالانکہ جب فرہاد یہ برگر خریدنے گیا تھا تو اس وقت اس کی بھوک خوب چمک رہی تھی اور وہ بے صبری سے فرہاد کی واپسی کی منتظر بھی مگر اب ایسے لگ رہا تھا جیسے اسے کبھی بھوک تھی ہی نہیں، بھوک کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی مر سا گیا ایسا لگا جیسے آج کی ساری تفریح سالار کی ایک ملاقات نے غارت کر دی ہو۔ اس کی وجہ کیا تھی، سارے راستے سوچنے کے باوجود وہ سمجھ نہ پائی۔

اک ساگر ہے زندگی

حبیبہ کی شاہ زین سے اگلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ایئر پورٹ پر واپس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ شام سے ہی وہ اس کی آمد کا منتظر تھا۔ مگر جانے کیوں اس نے ایک فون کر کے یہ بھی نہ بتایا کہ وہ کس وقت تک واپس آئے گی اور جب ایئر پورٹ جانے کا وقت ہوا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے پایا کو اطلاع دینا پڑی۔ کیونکہ اس کے پاس حبیبہ کا سیل نمبر نہ تھا۔

”پاپا حبیبہ کل رات اپنی آنٹی کے گھر گئی تھی اور وہاں سے اب تک واپس نہیں آئی اور نہ ہی اس نے اس سلسلے میں مجھے کوئی اطلاع دی ہے۔“

”ہاں میری اس بات ہو گئی ہے۔ تم ایئر پورٹ جاؤ، وہ وہیں پہنچ جائے گی۔“

پاپا کے جواب نے اسے تھوڑا سا غصہ دلادیا۔ ”پتا نہیں خود کو سمجھتی کیا ہے۔ اگر میرا نمبر اس کے پاس تھا تو اس کا فرض تھا کہ مجھے خود اطلاع دیتی۔ مطلب میں ہی بے وقوف ہوں جو اس کے لیے اس قدر پریشان ہو رہا ہوں۔ اسے تو میرا رشتی بھر احساس بھی نہیں ہے۔ احساس ہوتا تو اپنی خیریت کی اطلاع ضروری دیتی۔“

اسی طرح سوچتا، کھلتا وہ ایئر پورٹ پہنچ گیا۔ وہ کندھے پر اپنا واحد چھوٹا سا بیگ لیے کھڑا تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی، حسب معمول بالکل فریش۔ وائٹ کاٹن کی شلوار قمیض میں اس کا سادہ سا چہرہ خاصا نکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ گل والے ہینڈ بیگ کے علاوہ ایک خاصا بڑا بیگ بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ جسے تھامے وہ اس کے قریب آگئی۔

”السلام علیکم سر۔“

”وعلیکم السلام۔“ جواب دے کر وہ سامنے چلنے والی اسکرین دیکھنے لگا۔ جہاں مختلف ڈومینک فلائٹس کے ٹائم چل رہے تھے۔ اپنی مطلوبہ فلائٹ کا ٹائم اسکرین پر نظر آتے ہی وہ اندر کی جانب چل دیا، بتایہ دیکھے کہ حبیبہ اس کے پیچھے ہے کہ نہیں اور یہ ہی ہوا، جب وہ اندر پہنچا تو حبیبہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے اب یہ لڑکی۔

اس نے کوفت سے سوچا ہی تھا کہ وہ لاؤنچ کے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے پاس کوک کے دوٹن تھے، جن میں سے ایک اس نے شاہ زین کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ.....“ شاہ نے ٹن تھامتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”ویلم.....“ مختصر سا جواب دے کر وہ سامنے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ شاہ زین بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا اسی کاؤنٹر پر آگیا اور پھر کلیئرٹنس کے بعد وہ جہاز میں جا بیٹھے، جہاں سے اگلے چند گھنٹوں میں انہوں نے اپنے اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ جانا تھا۔ اس چوبیس گھنٹے کے ساتھ میں شاہ زین نے محسوس کیا کہ حبیبہ خاصی سرد مزاج لڑکی ہے جس سے دوستی کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔



”بھائی آپ شام کو کتنے بجے تک فارغ ہوں گے؟“

وہ کھانا کھا رہا تھا۔ جب رابعہ نے اس سے سوال کیا۔

”کیوں..... کوئی کام ہے؟“ روٹی کا لقمہ ہلاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”خالدہ خالہ نے ایک لڑکی بتائی ہے اور میں چاہ رہی تھی کہ آپ بھی میرے ساتھ چلتے، تاکہ بار بار نہ جانا پڑے اور آپ خود بھی سب کچھ پہلی دفعہ میں ہی دیکھ لیں۔ مطلب لڑکی کا خاندان اور گھر بار وغیرہ.....“ جھجکتے ہوئے رابعہ نے اپنی بات مکمل کی۔

اک ساگر ہے زندگی

”ہوں.....“ صرف اتنا جواب دے کر اس نے اپنے قریب رکھا پانی کا جگ اٹھالیا۔ تھوڑا سا پانی گلاس میں اٹھیل کر دو، تین بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور پھر کھانا درمیان میں ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ راجہ کو لگا وہ ناراض ہو گیا ہے۔

”لڑکی کی عمر کیا ہے؟“ اس نے بڑی سنجیدگی سے سوال کیا۔ اس کے سوال نے راجہ کا حوصلہ تھوڑا سا بڑھا دیا۔ ورنہ وہ تو مارے خوف کے اب آگے کوئی بات بھی کرنے والی نہ تھی۔

”خالہ نے تو چوبیس، پچیس سال بتائی ہے۔“ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”انہیں پتا ہے میری عمر کیا ہے؟“

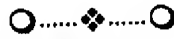
”ہاں میں نے بتا دی تھی چالیس سال؟“ راجہ نے جواب دیتے ہوئے یہاں وہاں نظریں گھمائیں۔

”جبکہ تم جانتی ہو میں پینتالیس کا ہو چکا ہو، پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟“ اس نے اپنی گہری نظریں راجہ پر گاڑیں۔

”افوہ بھائی..... آپ تو چالیس کے بھی نہیں لگتے اور ویسے بھی پہلے لڑکی تو دیکھ لیں..... پھر ہی پتا چلے گا کہ اس کی بھی اصل عمر کیا ہے۔“

”دیکھو راجہ اگر تمہیں میرے لیے کوئی رشتہ دیتا ہے تو چالیس سال سے اوپر کا دیکھو یہ بچیاں مت ڈھونڈو۔“

رابطہ کے لیے اتنا ہی غنیمت تھا کہ وجاہت نے ہاں تو کی..... ورنہ اسے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے راجہ کی اس حرکت پر وہ اسے بے تحاشا سنانے والا ہے۔ مگر اس کی توقع کے برخلاف اس نے رضا مندی کا عندیہ دے دیا تھا اور راجہ کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔



رات کا جانے کون سا پہر تھا جب گھبراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی کمرے میں مکمل طور پر اندھیرا طاری تھا۔ شاید لائٹ چلی گئی تھی۔ اس نے تاراج کی تلاش میں یہاں وہاں ہاتھ مارا جب اچانک اس کی نگاہ بیڈ کے انتہائی قریب کھڑے اس شخص پر پڑی۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے بستر کے دوسری جانب ہاتھ مارا۔ وہ حصہ خالی پڑا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے کمرے میں بالکل تنہا تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جب سامنے کھڑے بیوے میں حرکت ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آ گیا۔ اس شخص کے سامنے آتے ہی اندھیرے میں بھی اس کے نقوش واضح ہونے لگے۔ اسے احساس ہوا، وہ اس شخص کو جانتی ہے اور پھر اس کا چہرہ واضح ہو گیا۔

”تم.....“ اس کے حلق سے دہی دہی آواز نکلی۔

”مگر تم تو مر چکے ہو۔“ وہ بیڈ پر پیچھے کی طرف سرکتے ہوئے چلائی۔ سامنے موجود شخص بنا کوئی جواب دیے اس کے انتہائی قریب آ گیا۔ اتنا قریب کے اس کی سانس کی آواز اتنے خوف کے عالم میں بھی اس کے کانوں سے نکل رہی تھی مارے دہشت کے اس کے حلق سے تیز چیخ نکل گئی۔ اتنے میں روشنی کا تیز جھماکا ہوا۔ شاید لائٹ آگئی تھی۔ مگر اتنی دیر میں وہ بے ہوش ہو کر اپنے بستر پر گر گئی۔



جبا کی سالگرہ قریب تھی جو ہر سال فضلہ بھابی بڑی دھوم دھام سے مناتی تھیں۔ جبا، حذیفہ اور مریم سے تقریباً دو سال چھوٹی اور فضلہ بھابی کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باعث خاصی لاڈلی تھی۔ نرنب نے حساب لگایا بھی اس کی سالگرہ میں پورے دو ماہ باقی تھے۔ اس بار نرنب کا ارادہ بھی اس تقریب کے لیے نیا سوٹ بنانے کا تھا۔ جس کے لیے وہ پچھلے کئی ماہ سے بچت کر

اک ساگر ہے زندگی

رہی تھی۔ اس نے اپنے گھر کے اسٹور میں رکھے بڑے سے ٹریک سے اپنا ولیمہ کے سوٹ کا گرین دوپٹا نکال لیا تھا۔ جس پر ہنا گوٹے کا کام آج بھی پہلے دن جیسا تھا۔ سادیہ کے ساتھ جا کر وہ دوپٹے کی میچنگ کا سادہ سوٹ لے آئی تھی اور پھر خود ہی مشین رکھ کر سی بھی ڈالا۔ فرہاد، مریم اور جگنو کی فرمائشیں خرید لیا تھا۔

ویسے بھی زینب کو اس بار سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ فنکشن میں شرکت کرنے اپنی ذاتی گاڑی سے جائے گی۔ اسے کبھی بھی اسفند بھائی یا صمد کا اپنے لیے گاڑی بھیجنا اچھا نہ لگا تھا اور اپنی اسی خوشی میں وہ بڑے دل سے تیاریوں میں مصروف تھی کہ سالگرہ کا دن بھی آن پہنچا۔ سالگرہ کا یہ فنکشن ایک چھوٹے سے مقامی ہال میں رکھا گیا تھا۔ تیاریوں کے بعد سادیہ نے اس کے بالوں کا بڑا سا ہڈا بنا دیا۔ گرین کمراس پر ویسے بھی خوب کھل رہا تھا۔ شاید زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کسی خاندانی فنکشن میں شرکت کے حوالے سے اس قدر بے جوش تھی۔ جس کا اندازہ اس کی کئی ماہ قبل شروع کی گئی تیاریوں کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ مگر اس کا یہ سارا جوش و خروش اس وقت بالکل ماند پڑ گیا جب وہ تقریب میں شرکت کے لیے پہنچی۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ یہاں آئی ہی کیوں اور اس کا یہ افسوس آنے والے دنوں میں پچھتاوے میں تبدیل ہو گیا۔



فضل دین کی کئی مس کالز آچکی تھیں۔ مگر انہیں ابھی تک اتنا نام ہی نہ ملا تھا کہ کال بیک کر سکتے۔ دراصل آج وہ صبح سے ہی اپنے آفس ورک میں بری طرح مصروف تھے اور فضل دین سے ہونے والی ان کی گفتگو خاصی تفصیلی ہوتی تھی۔ جس کے لئے وقت درکار تھا۔ لہٰذا سے فارغ ہوتے جیسے ہی انہیں موقع ملا فضل دین کا نمبر پہلی فرصت میں ملایا۔

”السلام علیکم سر جی۔“ وہ یقیناً ان ہی کی کال کا منتظر تھا۔ پہلی ہی جمل پر فون ریسو کر لیا گیا۔

”وعلیکم السلام فضل..... تمہیں پیسے مل گئے ہیں؟“

”جی سر جی اسی لیے میں آپ کو کال کر رہا تھا۔“ وہ جلدی جلدی ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”میں نے چھوٹی بی بی جی کی داخلہ فیس جمع کروادی ہے، کتابوں اور یونیفارم کے بعد جو رقم باقی بچی تھی، وہ ان کے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہے۔“ اس نے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

”گڈ..... بہت اچھا کیا۔“ وہ جانتے تھے فضل دین پچھلے کئی سالوں سے ان کی یہ ذمہ داری بڑی ایمان داری اور راز داری کے ساتھ بخوبی نبھا رہا ہے۔ اس پر وہ اتنا ہی بھروسہ کرتے تھے جتنا خود اپنی ذات پر۔

”اور بی بی جی..... ٹھیک ہے؟ پڑھائی کیسی جا رہی ہے اس کی۔“

”سب کچھ بہت بہترین ہے سر جی..... اللہ تعالیٰ کا شکر ہے بس وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا۔ اسی ہفتہ وہاں کا ایک چکر لگاؤں اور ہاں میں تمہیں کچھ اضافی رقم بھیج رہا ہوں۔ ایسا کرو تم اسے اپنے ساتھ بازار لے جاؤ اور کچھ شاپنگ وغیرہ کروادو..... کالج کے حساب سے اسے جس چیز کی ضرورت ہو لے دینا۔“

”پیسے تو سر جی جو آپ نے پہلے بھیجے تھے وہ بھی میرے پاس موجود ہیں۔ کیونکہ بی بی جی نے کچھ بھی نہیں خریدا تھا۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ خود آئیں اور انہیں اپنے ساتھ لے جا کر شاپنگ کروادیں۔ ہو سکتا ہے اس طرح وہ کچھ خرید لیں۔“

اک ساگر ہے زندگی

وہ جانتا تھا وہ کبھی بھی اس طرح بازار جا کر شاپنگ نہ کرے گی۔ وہ گزشتہ تین سالوں میں اس کی ہر عادت سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ وہ صرف ضروری گھریلو سامان کی لسٹ بنا کر اسے دیا کرتی جو فضل دین خود خرید کر اس کے حوالے کر دیتا۔ کپڑے وغیرہ تو وہ..... وہی استعمال کرتی جو ملک صاحب اس کے لیے لایا کرتے۔ فضل دین نے دیکھا۔ وہ کافی قناعت پسند تھی۔ ہر حال میں خوش رہنے والی یا شاید وقت کی کارگری اسے یہ سب کچھ سکھا گئی تھی اور یہ سب کچھ ملک صاحب بھی جانتے تھے۔ پھر بھی شاید اپنی تسلی کے لیے اسے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ رقم بھیج دیا کرتے۔ چاہتے تھے اس کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہے اور اس سلسلے میں وہ ہر ممکن کوشش کرتے۔

”ٹھیک ہے تم اسے بتا دینا..... میں ہفتہ کی صبح آؤں گا۔“ انہوں نے دل ہی دل میں حساب لگا کر فضل دین کو بتا دیا۔

”ایک اور بات کہوں سرجی اگر آپ برائہ مانیں۔“ فضل دین نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں کوئی بھی بات کرنے کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، جو کہنا چاہتے ہو بلا جھجک کہو..... میں

سن رہا ہوں۔“

”شکر یہ سرجی یہ سب آپ کی عزت افزائی ہے۔“ وہ انکساری سے بھرپور لہجہ میں بولا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو فضل دین اپنی بات بتاؤ۔“

”سرجی بات یہ ہے کہ اس بار آپ جب آئیں تو اپنے ساتھ ایشال صاحب کو بھی لے آئیں۔ اگر ممکن ہو تو.....“

یہ وہ بات تھی جو کئی بار خود ان کے دل میں بھی آئی تھی۔ مگر اس سلسلے میں وہ آج بھی شاید اتنے ہی مجبور تھے۔ جتنے پہلے دن تھے اور یہ بات فضل دین بھی جانتا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں ان سے ایسی خواہش کر بیٹھا۔

”ہاں سوچا تو تھا کہ اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گا۔ مگر وہ ابھی تک یو کے میں ہی ہے۔“

جانتے تھے..... اگر وہ یہاں ہوتا تو بھی کبھی ان کے ساتھ نہ جاتا۔ مگر یہ بات وہ خود کبھی بھی اپنے منہ سے فضل دین کو نہ کہہ سکتے تھے۔ شاید اس سے انہیں اپنی بکی کا احساس ہوتا تھا۔

”اور یہ بات شاید میں نے تمہیں پہلے بھی بتائی تھی؟“

”جی سرجی.....“ وہ آہستہ سے بولا۔

”میں چھوٹی بی بی کو آپ کے آنے کا بتا دوں؟“ اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”ہاں..... ہاں..... بالکل بتا دو۔“ اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے فون بند کر دیا۔ کاش وہ ایشال کو اس رشتہ کی اہمیت

کا احساس دلا سکتے، جس میں وقت کے ہاتھوں وہ بندھ چکا تھا۔ مگر اپنی لاعلمی کے باعث غفلت کا شکار تھا، نہ صرف یہ بلکہ وہ لا شعوری طور پر ایشال کی دل آزاری کا سبب بھی بن چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی نہ تھا۔ وہ جس مضبوط بندھن میں بندھا ہوا تھا اسے تو ذکر ایشال سے کوئی تعلق جوڑنا اتنا آسان نہ تھا، جتنا ان دونوں ماں بیٹا نے سوچ رکھا تھا۔ یہ بات ایشال سے زیادہ اس کی ماں کو سمجھنی چاہیے تھی اور وہ بھی یہ سب کچھ سمجھنے کو تیار نہ تھی۔ ورنہ شاید سب کچھ اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا ہو چکا تھا۔

انہوں نے اپنے ماتھے کو دو انگلیوں کی مدد سے دہاتے ہوئے کرسی کی بیک سے ٹک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ ٹینشن جو اس وقت بری طرح ان کے دماغ پر سوار تھی۔ اس سے پیچھا چھڑانے کا سب سے آسان حل اس وقت..... یہ تھا کہ خود کو ریلیکس چھوڑ دیا جائے۔ ایسے وقت وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے تھے۔ آنکھیں بند کر کے، ٹانگیں لمبی کرتے ہوئے اپنے دماغ

کو تمام سوچوں سے آزاد کر دینا۔



وہ جیسے ہی فرہاد کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی وہاں کی رونق دیکھ کر چکا بکا رہ گئی۔ ہر طرف چمکتے دھکتے لباس والے لوگ، رنگ و نور کا ایک سیلاب سا اس کے چاروں طرف موجزن تھا۔ ایسی ہولنگ تو شاید کسی غریب کی شادی میں بھی نہ ہوتی ہوگی جو اس سالگرہ کے فنکشن میں دکھائی دے رہی تھی۔ روپے کا بے تحاشا اسراف ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ یہاں وہاں نظر دوڑانے پر بھی اسے فضا بھابی کہیں دکھائی نہ دیں۔ وہ فرہاد کے ساتھ ایک قریبی ٹیبل پر جا کر بیٹھی۔ جب اچانک ہی سالار اپنی بیگم کو لیے ان کے ٹیبل کی جانب آ گیا۔ جبکہ اسے سالار کی وہاں موجودگی کی بالکل بھی امید نہ تھی۔ اسی لیے وہ تھوڑا سا حیران ہو گئی۔

”میں کب سے وہاں اکیلا بیٹھا ہوں اور ہاتھ کہ اچانک آپ لوگوں کو دیکھا تو سوچا کیوں نہ مل کر ایک دوسرے کی کہنی کو انجوائے کیا جائے۔“

وہ بے تکلفی سے کرسی کھینچتا ہوا فرہاد کے قریب ہی بیٹھ گیا، جبکہ نازیہ، زینب کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس کے بیٹھنے کے دوران ہی زینب ایک سرسری سی نگاہ میں اس کا مکمل جائزہ لے چکی تھی۔ قیمتی کپڑے کا سفید سوٹ، جو بے شک اس کے سانولے رنگ پر اتنا نہیں کھل رہا تھا۔ مگر پھر بھی قیمتی لباس، عالیشان چپواری اور مہنگے پرفیوم کی مہک سب مل جل کر زینب کو ایک عجیب سے کمپلیکس کا شکار کر رہے تھے۔ اس نے بے اختیار ہی ایک نظر اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالی جہاں کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں ذرا بھی نہ بچ رہی تھیں یا شاید اسے ہی محسوس ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ دوپٹے کے اندر کر لیے۔ عین اسی وقت فضا بھابی ہال میں داخل ہوئیں۔ جب وہ نازیہ سے مرعوب بیٹھی تھی۔ ان کے ہمراہ اسٹائل اور میک اپ کو دیکھ کر با آسانی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ پارلر سے سیدی ہال ہی آئی ہیں۔ بلیک ستاروں والی ساڑھی کے ساتھ بلیک ہی اسٹون کی میپنگ چپواری ان پر خوب کھل رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی سیدی وہ اسی ٹیبل پر آ گئیں۔

”زینب کو تو میں نے پیچھے سے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“

قریب آ کر گلے ملتے ہوئے انہوں نے بظاہر سرسری سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

”شاید اس کا دوپٹا اپنے ولیمہ کے سوٹ کا ہے۔ جسے دور سے دیکھتے ہی میں سمجھ گئی یہ یقیناً زینب ہی ہوگی۔“ ہنس ہنس کر انہوں نے خوب اپنی زبان کے تیر چلائے۔ زینب جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔

”ویسے تمہارا وہ پٹا ابھی تک ویسے کا ویسا ہی ہے۔ اتنے سالوں میں ذرا گونا گونا خراب نہیں ہوا۔ چلو اچھا ہے ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ استعمال میں لے آئیں۔“

”ان کی شادی کو زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ سال ہوئے ہوں گے اور میرا نہیں خیال کہ اتنے کم عرصہ میں کچھ خراب ہو جائے۔ بشرطیکہ سنبھال کر رکھا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زینب خاصی گھڑ ہے۔ کیوں زینب ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔“

سالار کی یہ کوشش اس کے چہرے پر چھائی شرمندگی کو دور کرنے کے لیے تھی۔ زینب نے کوئی جواب دیئے بنا فرہاد پر ایک نظر ڈالی۔ جو فضا بھابی کے قریب کھڑے اسفند بھائی سے باتوں میں اسی بری طرح مصروف تھا کہ شاید اسے پتا ہی نہ چلا کہ فضا بھابی..... زبان کی کارگیری بڑی خوب صورتی سے دکھا کر اگلی ٹیبل کی جانب بڑھ گئی ہیں۔ اس کے بعد نازیہ اور سالار نے کافی کوشش کی کہ اپنی باتوں سے اس کے بگڑے موڈ کو بحال کر سکیں۔ مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ وہ فرہاد کے کئی بار کہنے

پر بھی ایک کانٹے وقت اسٹچ پر نہ گئی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس نے کچھ بھی نہ کھایا۔ وہ تمام خوشی جو اس تقریب میں شریک ہونے سے قبل اسے تھی۔ یک دم غارت ہو گئی اور جب تک وہ وہاں سے گھر واپس آئی نازیہ اس کا ایڈریس لے چکی تھی۔

”میں ان شاء اللہ تم سے ملنے جلد ہی تمہارے گھر آؤں گی۔“ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ نہایت پیار سے بولی۔

”ضرور آنا..... میں انتظار کروں گی۔“ نہایت آہستہ سے کہتے ہوئے وہ آگے کی جانب بڑھ گئی۔ فضا بھابی سے ملے بنا ہی وہ خاموشی سے باہر کھڑی اپنی گاڑی میں آن بیٹھی۔ سارے راستے فرہاد اس تقریب کے گیت کا گاتا رہا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھنے میں مگن رہی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا فرہاد کیا کہہ رہا ہے شاید اسے فرہاد کی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں اس کے کانوں میں صرف اور صرف فضا بھابی کی آواز گاہے بگاہے سنائی دے رہی تھی باقی دنیا کی ہر آواز ختم ہو گئی تھی۔ وہ وقفہ وقفہ سے فرہاد کی بات کے جواب میں ہوں یا ہاں کر دیتی بالکل ایسے جیسے غائب دماغ ہو اور یہ بات شاید فرہاد نے بھی محسوس کر لی۔

”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ بالآخر اس کی ہوں ہاں سے تنک آ کر وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

”کیوں میری طبیعت کو کیا ہوتا ہے؟“ جواباً اس نے چڑتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

”ہاں نہیں جب سے واپس آئی خاموش خاموش سی ہو اسی لیے پوچھ بیٹھا۔“ جگنو اور مریم دونوں راستے میں ہی سو گئی تھیں انہیں بستر پر لٹا کر جیسے ہی وہ واپس کمرے میں آئی ایک بار پھر فرہاد نے سوال و جواب کی عدالت میں گھسیٹ لیا۔

”ایک بات تو بتائیں؟“ وہ بستر پر فرہاد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

”ہاں پوچھو.....“ فرہاد نے ٹکڑی اپنی کمر کے پیچھے درست کرتے ہوئے کہا۔

”یہ فضا بھابی ہر وقت مجھ سے اتنا جلیس کیوں رہتی ہیں؟“

اپنی بات کی وضاحت شاید اس سے زیادہ بہتر انداز میں وہ نہیں کر سکتی تھی۔

”تم سے جلیس.....“

فرہاد نے اسے حیرت سے نکا، زینب کی بات سن کر اس کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے ہو گئے تھے۔

”وہ بھلا تم سے کیوں جلیس ہوں گی۔“ اس کی بات نے فرہاد کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

”اگر جلیس نہ ہوتیں تو کیوں میرے اچھے خاصے سوٹ میں سب کے سامنے کیڑے نکالنے کھڑی ہو گئیں۔“

وہ اپنا دل فرہاد کے سامنے ہلکا کرنا چاہتی تھی جو جانے کب سے بھرا پڑا تھا۔

”حد ہے زینب تم ہر بات کو اتنا غلط رخ کیوں دیتی ہو وہ تعریف کر رہی تھیں کہ تم نے اپنے ولیمہ کا دوپٹا اس قدر سنبھال

کر رکھا ہے کہ آج تک نیا ہی دکھائی دے رہا ہے۔“

”ضروری تھا سب کے سامنے یہ وضاحت کرنا کہ میں نے پرانے دوپٹے کے ساتھ سوٹ بنایا ہے۔“ وہ قطعاً ہار ماننے

کو تیار نہ تھی۔

”میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ تم بلاوجہ فضا بھابی سے اس قدر خار کیوں کھاتی ہو جو ان کی ہر اچھی بات میں

بھی برائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتی ہو۔“

”اس لیے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی کبھی کوئی اچھی بات کی ہی نہیں ہے۔“

فضہ بھابی نے جان بوجھ کر سالار اور نازیہ کی موجودگی میں جو آگ اس کے دل میں لگائی تھی وہ کسی طرح بجھنے میں ہی نہیں آ رہی تھی ورنہ عام طور پر وہ کبھی بھی فرہاد کے ساتھ اس طرح بحث نہ کیا کرتی تھی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم خود ان کے گھر کی رونق دیکھ کر جیلنس ہو گئی ہو۔“

”میں جیلنس ہو گئی ہوں؟“ فرہاد کے بے رحمی سے کیے گئے تجزیہ نے اسے مزید دکھی کر دیا۔

”ہاں تم جو کبھی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتیں کہ ہر انسان اتنا ہی خرچ کرتا ہے جتنی اس کی حیثیت ہوتی ہے اور نہ ہی تم یہ مانتی ہو کہ ہم حیثیت اور رتبہ میں اسفند اور صمد بھائی کے مقابلے میں کہیں کمتر ہیں اس لیے کیا ضرورت ہے کسی بھی معاملے میں ان کے ساتھ محاذ آرائی کرنے کی، جب کہ یہ پتا بھی ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے ان جیسی کم ظرف عورت سے مقابلہ بازی کرنے کا۔“

اس نے غصہ سے جواب دیتے ہوئے کروٹ بدل لی اس طرح شاید وہ اپنی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی تھی۔ اس وقت اسے فرہاد کے سامنے بھی اپنے آنسو نظر آنا اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔

”ہر بات اپنے دل پر مت لیا کرو نہ نب۔“ وہ اسے سمجھائے ہوئے بولا۔

”مجھے نیند آ رہی ہے اب باقی بات ہم بعد میں کریں گے لائٹ بند کر دیں۔“

اپنے لہجہ کی نمی کو چھپاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی اور پھر اس کی رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہی گزر گئی۔ فضہ بھابی کا حقاقت آمیز انداز اسے رہ رہ کر یاد آتا گیا وہ ساری رات کوئی ایسا طریقہ سوچتی رہی جس سے انہیں نچا دکھا سکے۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی تھی، مگر کیسے اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور پھر اس طرح جلتے کڑھتے کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہ چلا۔



”اف خالہ اتنی موٹی لڑکی.....“ گھر کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی فائزہ نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔

”اے لوتم نے ہی تو کہا تھا لڑکی خوب گوری چٹی اور خوب صورت ہو۔“

خالہ نے برقعہ کا نقاب اٹھتے ہوئے فائزہ کو گھورا۔

”گوری چٹی اور خوب صورت لڑکی اک ذرا سی موٹی ہو گئی تو کون سی قیامت آگئی۔“ خالہ قدرے برا مناتے ہوئے بولیں۔

”اللہ معاف کرے خالہ یہ ذرا سی موٹی تھی۔“ فائزہ، رابعہ کے گھورنے کے باوجود پھر بول پڑی۔

”خالہ تم کیوں اتنا ناراض ہو رہی ہو، اچھی طرح جانتی ہو دو جاہت بھائی نے لڑکی کے سلسلے میں کوئی ڈیمانڈ نہیں رکھی سوائے خوب صورتی کے، کم عمری، اعلیٰ تعلیم، حیثیت و رتبہ کچھ بھی تو ان کے نزدیک اہم نہیں ہے سوائے شکل کے، عمر بھی بے شک تم سے اوپر ہو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

رابعہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کچھ دور کھڑے رکشا کو اشارے سے قریب بلایا۔

”دیکھو بی بی صاف بات اتنی ہے کہ تمہارا بھائی شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تب ہی تو ایسی شرط رکھی ہے۔“

”خالہ اب خوب صورت بیوی کی خواہش رکھنا ایسا بھی برا نہیں کہ تم ہمارے بھائی پر اس طرح کے الزام لگانے لگو۔“

فائزہ ایک بار پھر درمیان میں بول پڑی۔

”پینتالیس سال کے مرد کو تو سلیقہ شعار عورت کی خواہش کرنی چاہیے تاکہ کسی حسن کی دیوی کی، تیس سال کے بعد تو ویسے ہی عورت کا حسن ماند پڑ جاتا ہے اور پھر اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کم عمر لڑکی بھی اسے پسند نہیں ہے۔ اسے سمجھاؤ صورت چھوڑے سیرت دیکھے زندگی، اچھی سیرت کے ساتھ نبھانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اچھی صورت کے۔“

”دیکھو خالہ سچ تو یہ ہے کہ ایک ملاقات میں کسی کی ایک اچھی سیرت کا پتا نہیں چلتا البتہ صورت دکھائی دے جاتی ہے تو پھر کیوں نہ اس پر توجہ دی جائے جو نظر آتا ہے۔“

اس نے باقاعدہ جتاتے ہوئے جواب دیا۔

”چلو خالہ آ جاؤ رکشا میں بیٹھو باقی باتیں گھر جا کر کر لیں۔“ اتنی دیر میں رابعہ رکشا والے سے رقم طے کر چکی تھی۔

رابعہ کو لگا خالہ ابھی تک ناراض ہیں بنا کوئی بات کیے اس نے خاموشی سے اپنے پرس سے دس، دس کے کچھ نوٹ نکال کر ان کے حوالے کر دیئے۔ ”ایک بات اور ہے بیٹا، جو دل میں آئی تو سوچا کہہ دوں یاد رکھنا جب مرد کو باہر کے کھانے کی عادت ہو جائے تو وہ گھر میں راشن ڈالنے سے گریز کرتا ہے اور اب شاید مشکل ہی ہے کہ تمہارے بھائی کو بھی اس عمر میں کوئی لڑکی پسند آئے۔“

”لو خالہ ابھی تو کوئی چار پانچ لڑکیاں بھی بمشکل تم نے دکھائی ہیں اس پر بھی اتنی باتیں اور ناراضی کا اظہار کرنے لگی ہو کہ بنا جانے ہی میرے شریف بھائی پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے جا رہی ہو۔“

فائزہ کو ایک بار پھر سے ان پر غصہ آ گیا اس سے قبل رابعہ کچھ کہتی خالہ نے بنا کوئی جواب دیئے تیزی سے روڈ کر اس کیا اور آگے کی جانب بڑھ گئیں۔ ”کیا ضرورت تھی فائزہ تمہیں ان سے اس قدر الجھنے کی۔“

رابعہ نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے فائزہ کو سمجھایا۔

”میں بلاوجہ نہیں الجھتی وہ ہی بنا کسی سبب کے ناراض ہوئے جا رہی تھیں، ہم نے انہیں رشتہ دکھانے کے پیسے دینے ہیں اب جب کوئی لڑکی پسند آئے گی تو ہاں کریں گے، ضروری تھوڑی ہے ان کی دکھائی گئی عجیب و غریب کسی بھی لڑکی کو گھر لا کر اپنے ہیرے جیسے بھائی کے ماتھے منڈھ دیں۔“

”بہی بات فائزہ، کسی کی بیٹیوں کے بارے میں اس طرح کے الفاظ منہ سے نہیں نکالتے اور جہاں تک خالہ کا سوال ہے ان کی تو عادت ہے جلدی غصہ کرنے کی۔“

رابعہ نے اسے گھر کا وہ بنا کوئی جواب دیئے رکشے سے منہ باہر نکالے آتے جاتے نظارے دیکھنے لگی بالکل ایسے جیسے اس نے رابعہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”میرا خیال ہے اب جب خالہ خالہ کہیں تو رشتہ دیکھنے کے لیے میں اکیلی ہی جاؤں کیونکہ تم دونوں کے آپس کے اختلافات ہمیں اپنی کوششوں میں جلد کامیاب نہ ہونے دیں گے۔“ رابعہ نے دل ہی دل میں کیا جانے والا فیصلہ اسے سنا دیا۔

”جیسے تمہاری مرضی کرو۔“ فائزہ نے مختصر جواب دے کر بات ختم کر دی اور پھر سارے راستے ان دونوں کے درمیان اس موضوع پر دوبارہ بات نہ ہوئی۔

اک ساگر ہے زندگی

”جانتے ہو میں کب سے صرف تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ اپنے دونوں بازو کھولے آہستہ آہستہ ایٹال کی جانب بڑھی۔ آس پاس پھیلے اندھیرے کے باعث وہ اسے پہچان نہ پایا پھر بھی جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بھی اسے جانتا ہو۔

”کون ہو تم.....“

وہ خوف زدہ ہوتے ہوئے پیچھے کی جانب سرک گیا، اتنی دیر میں وہ سبز دوپٹے والی لڑکی اس کے انتہائی قریب آچکی تھی پھر بھی اس کی شکل واضح نہ ہوئی تھی۔

”تم نے مجھے ابھی بھی نہیں پہچانا.....“ وہ اس کے کان کے قریب آکر بولی اس کی سانس لینے کی تیز آواز ایٹال کے کانوں سے ٹکرانی ایٹال نے دیکھا اس کے سامنے کے دونوں دانت بڑے ہو چکے تھے اور آنکھوں کی جگہ بڑے بڑے حلقے تھے۔ سوکھے سوکھے بازو جو وہ اس کی طرف پھیلائے ہوئے تھے ایٹال کو محسوس ہوا کہ خوف کے مارے اس کی سانس بند ہو جائے گی۔ اب وہ مزید پیچھے نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ پیچھے کی جانب دیوار تھی اور آگے بالکل سامنے وہ سبز دوپٹے والی لڑکی۔ یک دم وہ عالم خوف میں چلا یا۔

”مما.....مما“

”کیا ہوا ایٹال!“ کسی نے اسے بری طرح جھنجھوڑ کر جگایا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں سامنے اریشہ اور اس کی روم میٹ دیوینا کھڑی تھیں شاید وہ برابر والے کمرے سے ایٹال کی چیخ کی آواز سن کر آئی تھیں وہ مارے شرمندگی کے اٹھ بیٹھا وہ پسینہ میں بری طرح شرابور تھا جب کہ وہاں اس وقت اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔

”کیا ہوا کیوں اتنی بری طرح چیخ رہے تھے؟“ اسے خاموش دیکھ کر اریشہ نے اپنا سوال ایک بار پھر سے دہرایا۔

”کچھ نہیں شاید میں خواب میں ڈر گیا تھا۔“

”افوہ اتنے بڑے ہو کر بھی تم ابھی تک خوابوں میں ڈر جاتے ہو۔“

اریشہ اپنے خوبصورت دانت نکال کر ہنسی اسے ہمیشہ سے ہی اریشہ کے موتیوں جیسے دانت بے حد پسند تھے سفید چمکیلے بالکل پرل جیسے قیمتی دانت۔

”پہلے تو کبھی نہیں ڈرا آج پتا نہیں کیوں ایسا ہوا۔“ وہ اپنے، اس بری طرح چیخنے پر ابھی تک شرمندہ تھا۔

”چلو کوئی بات نہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے ڈونٹ وری۔“ دیوینا اس کی شرمندگی دور کرتے ہوئے بولی۔

”آ جاؤ باہر بارش میں تھوڑا سا داک کرتے ہیں تم بھی فریش ہو جاؤ گے۔“ اریشہ نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

”داؤ باہر بارش ہو رہی ہے۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اسے ہمیشہ سے ہی بارش بہت اچھی لگتی تھی۔

”ہاں تم تو سرشام ہی سو گئے تھے اس لیے ہم نے نہیں جگایا ابھی بھی ہم دونوں سریش کے ساتھ باہر ہی نکل رہے تھے کہ ایک دم تمہاری چیخ کی آواز نے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اب سریش تو شاید باہر جا چکا ہے لہذا بہتر ہوگا کہ تم ہمارے ساتھ آ جاؤ۔“ اریشہ نے اسے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

”وائے ناٹ..... شیور!“ اس نے جلدی جلدی بیڈ کے قریب رکھے اپنے سلیپر پہنے، جیکے کے نیچے رکھا والٹ نکال کر نرا در کی جیب میں ڈالا اور ان دونوں کے پیچھے باہر آ گیا دلچسپ روڈ کے دونوں جانب لگے بلب کی روشنی میں بڑی سی تارکول

اک ساگر ہے زندگی

کی سڑک پر گرتی چھوٹی چھوٹی بارش کی بوندیں بہت اچھی لگ رہی تھیں اس کی طبیعت پر چھایا بوجھل پن فوراً ہی دور ہو گیا وہ ایک دم فریش ہوا تھا۔

”آ جاؤ آئیں کریم کھائیں۔“ تھوڑی ہی داک کے بعد سڑک کے دوسری جانب موجود آئیں کریم پارلر کی لائٹس نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا اور وہ بنا کسی کا جواب سنے اس جانب بڑھتا چلا گیا۔



”مجھے تو یہ فضا بھابی خاصی عجیب سی لگیں۔“ نازیہ نے اپنے کپڑے تہہ کر کے رکھتے ہوئے سالار کی جانب دیکھا جو بالکل چپت لیٹا ایک ٹک چھت پر جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔

”میں آپ سے بات کر رہی ہوں سالار۔“

کچھ دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد اس نے سالار کا کندھا ہلکے سے ہلایا۔

”آں.....ہاں۔“ وہ یک دم چونک اٹھا۔

”کیا کہہ رہی ہو پھر سے کہنا میں نے سنا نہیں۔“ وہ بالکل غائب دماغی سے بولا۔

”میں کہہ رہی تھی یہ فضا بھابی کچھ عجیب سی ہیں، بجائے نینب کی خوبصورتی کو سراہنے کے اس کے دوپٹے کی تاریخ بیان کرنے بیٹھ گئیں۔ مجھے تو بہت عجیب لگا ان کا اس طرح تبصرہ کرنا جب کہ نینب اس سوٹ میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔“

نازیہ نے سادہ دلی سے کھل کر نینب کی تعریف کی وہ سالار کے دل کی حالت سے بالکل بے خبر تھی۔

”واقعی نینب بہت خوبصورت ہے۔“

وہ دیر سے بولا بالکل ایسے جیسے سوائے اس ایک جملے کے اس نے نازیہ کی کوئی اور بات سنی ہی نہ ہوتا نازیہ الماری کھولے اپنی جیولری رکھنے میں اس بری طرح مگن تھی کہ اس تک سالار کی آواز تو ضرور پہنچی مگر یہ نہ سمجھ پائی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”کچھ کہا آپ نے.....؟“

الماری کے پٹ بند کر کے اس نے پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں میں سن رہا ہوں جو تم کہہ رہی ہو۔“

”آپ نے شاید دیکھا نہیں ہال میں داخل ہوتے ہی فضا بھابی کی جوں ہی پہلی نگاہ نینب پر پڑی ان کے چہرے کے تاثرات اس قدر عجیب سے ہو گئے تھے کہ میں تو حیران رہ گئی۔ مجھے فوراً ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جیلس ہو گئی ہیں جس کی تصدیق فوراً ان کی دوپٹے پر کی جانے والی تنقید نے کر دی۔ بھلا کیا تک تھی سب کے سامنے یہ جتانے کی کہ دوپٹہ تمہارے ولیمہ کے سوٹ کا ہے مجھے تو ان کی یہ بات بہت ہی فضول لگی۔“ وہ مسلسل بولے جا رہی تھی یہ جانے بغیر کہ اس کی یہ باتیں کس طرح سالار کے دل پر جا کر لگ رہی ہیں اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو اس طرح نینب کے حسن کے قصیدے نہ پڑھتی مگر وہ اپنی لاعلمی کے باعث سالار کے دل میں آگ لگانے کا سبب بن رہی تھی۔ ”لائٹ آف کرو مجھے نیند آرہی ہے۔“

سالار کا بالکل دل نہ چاہا کہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے اسی لیے آنکھیں موند کر سوتا بن گیا وہ فوری طور پر خوابوں کی وادی میں اترنا چاہتا تھا جہاں کئی دنوں سے نینب کا راج تھا۔ اس کی آنکھیں نینب کے خواب دیکھنے کی خواہش میں ہی بند

ہوتی تھیں وہ خواب جن میں ہمیشہ وہ اس کے سنگ ہوتی فرہاد اور تازیہ دونوں کا ان خوابوں میں کہیں دور دور تک گزر نہ تھا۔ ابھی بھی ایسا ہی ہوا آنکھیں بند کرتے ہی زینب کا خوبصورت ہولہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا سالار کا دل اندر تک خوشی سے بھر گیا اب ساری رات زینب اس کے ساتھ تھی صبح کے اگلے تک وہ صرف اور صرف اس کی تھی بے شک خوابوں میں ہی سہی۔



”امی مجھے اس بار عید پر اچھا والا نیا سوٹ لینا ہے بالکل روما جیسا۔“
وہ ضد کرتے ہوئے بولی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ وہ تو کافی صابر و شاکر سی بچی تھی ہمیشہ اپنے حال میں خوش رہنے والی۔

”کل جو میں نے تمہیں سوٹ سی کر دیا ہے وہ اچھا نہیں ہے کیا؟“
اپنی بیٹی کی اس فرمائش نے انہیں تھوڑا سا حیران کر دیا۔
”نہیں میں سب کے عید کے کپڑے دیکھ کر آئی ہوں وہ بہت اچھے اور خوبصورت ہیں میرا سوٹ بالکل بے کار ہے مجھے نہیں پسند، آپ مجھے ویسا سوٹ بنا کر دیں جیسا مبین کی امی نے اس کے لیے آپ سے سلوایا ہے یا پھر زویا جیسا لے کر دیں یہ سوٹ میں نہیں پہنوں گی۔“

اس نے چار پائی پر رکھا سوٹ اٹھا کر اپنی ماں کے سامنے لا بٹھا۔
”ان کے سروں پر ان کے باپ سلامت ہیں جب کہ تم یتیم ہو تمہاری پرورش کے اخراجات میں نے ہمیشہ ان جیسے لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے پورے کیے ہیں پھر بھلا ان سے کیا مقابلہ؟“
وہ شروع سے ہر بات اتنی ہی سفاکی سے سمجھانے کی عادی تھیں تاکہ بیٹی کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔
”کیوں شاہین کے بھی تو ابو نہیں ہیں پھر کیوں اس کی ہر چیز اتنی اچھی ہوتی ہے۔“
آج وہ مکمل طور پر بحث کرنے کے موڈ میں تھی۔

”شاہین کا سب کچھ کرنے کے لیے اس کے چچا اور ماموں سلامت ہیں اور تمہارا کوئی بھی نہیں، اسی لیے میں اتنا ہی کر سکتی ہوں جتنی میری اوقات ہے، اس سے نہ کچھ کم نہ زیادہ۔ اگر سوٹ پسند نہیں ہے تو باہر رکھے کچھ رے کے ڈرم میں ڈال دو، میں تمہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں لے کر دے سکتی۔“
انہوں نے سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے ہر بات یکسر ختم کر دی یہ جانے بنا کر ان کی اس بات کے رد عمل میں معصوم بیٹی کے دل کو کس قدر ٹھیس پہنچی ہے؟

”بیٹا دیکھ لو شاہنگ مکمل ہو گئی یا کچھ اور بھی لینا ہے۔“
وہ ماضی کی یادوں میں اس بری طرح گم تھی کہ اسے ملک انکل کی آواز بھی سنائی نہ دی جو نہ جانے کب سے اسے پکار رہے تھے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”جی انکل.....“ اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے بے اختیار بولی۔

”تمہیں کچھ اور لینا ہے۔“

ملک انکل کے پوچھے گئے سوال کے جواب دینے کے بجائے اس نے فضل دین کے ہاتھوں میں تھامے ڈھیروں

اک ساگر ہے زندگی

ڈھیروں شاپنگ بیگز پر ایک نظر ڈالی۔

”واہ میرے مولا تیرے بھی انداز نزلے ہیں جب ماں تھی تو ہر خواہش لا حاصل رہی اور آج ماں کے مرنے کے بعد ہر خواہش پایہ تکمیل پر پہنچنے کے لیے میرے ایک اشارے کی منتظر ہے۔ آج جو رشتہ میرے پاس ہے وہ اپنے پیسے کے زور پر میری ہر خواہش پوری کرنے کے لیے ہر وقت تیار مگر خواہشیں ایسے جیسے ختم ہی ہو گئی ہوں۔“

”نہیں انکل جی بہت بہت شکریہ آپ جو کچھ میرے لیے کر رہے ہیں میں تو شاید اس کے قابل بھی نہ تھی۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بھرا سی گئی۔

”بری بات بیٹا، انہوں کا اس طرح شکریہ ادا نہیں کیا جاتا جو کچھ میں تمہارے لیے کر رہا ہوں وہ کوئی احسان نہیں بلکہ تمہارا حق ہے مجھے تو افسوس ہے اتنا عرصہ میں کیسے تم لوگوں سے غافل رہا۔“

انہوں نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا وہ بالکل خاموش تھی۔

”فضل دین، گاڑی کسی اچھے سے ریٹائرمنٹ کی جانب لے چلو مجھے اور میری بیٹی کو بہت سخت بھوک لگی ہے۔“ اسے اپنے ساتھ لگائے گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے انہوں نے فضل دین کو حکم دیا۔

”جی سر جی.....“ فضل دین نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے تمام شاپنگ بیگ اندر رکھ دیئے اور خود رائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ وہ جانتا تھا کہ ملک صاحب کو اس شہر میں کہاں کا کھانا پسند ہے لہذا اس نے اپنی گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔



”یہ لڑکی کون ہے؟“ وہ کمپیوٹر میں ڈیٹا فیڈ کرنے میں بری طرح مصروف تھا جب اچانک اپنے قریب سنائی دینے والی ماما کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”کون سی لڑکی؟“ وہ سمجھ نہ پایا وہ کس کی بات کر رہی ہیں۔

”وہ جو سامنے والے کمپن کے دروازے کے باہر کھڑی ہے۔“

شاہ زین نے ان کے متوجہ کروانے پر اپنی نگاہ شیشے کی دیوار کے اس پار دوڑائی جہاں رائل بلیو جار جٹ کے سوٹ میں ملبوس حبیبہ کھڑی کرن سے باتیں کر رہی تھی۔ کرن کو اس کی ماں جانتی تھی تو یقیناً ان کا سوال حبیبہ کے لیے ہی تھا۔

”یہ حبیبہ ہے ماما، آفس کے اکاؤنٹنٹ سیکشن میں ہوتی ہے۔“

وہ اسے دیکھتا ہوا بولا اتنی دور سے بھی حبیبہ کی خوب صورتی بالکل الگ سے دکھائی دے رہی تھی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“ وہ اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے بولیں۔

”ضرور دیکھا ہوگا یہ کہنی کے سالانہ ڈنر میں بھی موجود تھی۔“

”مجھ سے ملی تھی؟“ وہ ابھی بھی اسے ہی دیکھتے جاری تھیں جو ان سے بے خبر کرن سے جانے کس گفتگو میں بری طرح مصروف تھی۔

”نہیں کیوں کہ اس کے آنے کے چند ہی لمحوں بعد آپ ماموں کی طرف چلی گئی تھیں۔“

”اوہ اچھا.....“ وہ کچھ ابھی ہوئی تھیں۔

”دیے ایک بات ہے یہ لڑکی بہت خوب صورت ہے۔“ وہ ابھی بھی اس کی طرف متوجہ تھیں۔

”صحیح کہا آپ نے اتنا مکمل اور پرفیکٹ حسن کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔“

شاہ زین نے بھی کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔

”پتا نہیں کیوں مجھے عورت کے اس قدر حسن سے ڈر لگتا ہے نصیب کا تعلق کبھی بھی حسن سے نہیں رہا اور میں تو ہمیشہ سے

یہی دعا کرتی ہوں اے اللہ شکل سے زیادہ نصیب اچھا کرنا۔“

وہ ایک جھرجھری سی لیتے ہوئے بولیں۔ ان کی یہ نرالی منطق شاہ زین کی سمجھ میں بالکل نہ آئی مگر جواباً وہ خاموش رہا اس

کا ارادہ اپنی ماں سے کسی بھی قسم کی بحث کرنے کا بالکل نہ تھا۔

”اچھا بیٹا میں چلتی ہوں۔“ وہ اپنے موہائل پر بجنے والے میوزک کی آواز سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”نیچے ڈرائیور آگیا ہے اس نے ابھی مجھے بس کال دی ہے ہم سب تمہارے ماموں کی طرف جا رہے ہیں تم بھی

فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔“

اپنا قیمتی ہینڈ بیگ اٹھا کر انہوں نے بازو پر ڈالا اور گاگلز بالوں پر اچھی طرح جاتے ہوئے باہر کی جانب چل دیں۔ شاہ

زین انہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی ماں کرن یا حبیبہ

کے پاس ایک ہل رک کر ان کی خیریت ضرور دریافت کرے گی مگر ایسا نہ ہوا وہ دونوں کو تکر نظر انداز کرتی ہوئی گزر گئیں۔ وہ

ایسی ہی تھیں اگر کسی سے دوستی کرتیں تو جان تک لٹا دیتیں ورنہ عام طور پر کسی سے سلام دعا بھی بمشکل لیا کرتیں ان کی اس

عادت سے شاہ زین بچپن سے ہی واقف تھا۔



”یاد رکھو بیٹا انسان کو زندگی میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے نصیب میں لکھا جا چکا ہو نہ اس سے رتی بھر کم اور نہ ہی

زیادہ۔“

اماں جی نے اپنی تسلیج کے دانے آہستہ آہستہ گراتے ہوئے زینب کو سمجھایا جو ان کے سامنے شکایات کی ایک پوٹلی

کھولے بیٹھی تھی۔

”اچھا تو پھر انسان کو کوشش کرنے کا حکم کیوں دیا گیا جو کچھ نصیب میں لکھا گیا ہے تو بنا کوشش کیے بھی مل جاتا ہے۔“

وہ اماں جی کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

”کیا بات ہے بیٹا کیوں اس قدر ناراض ہو؟ تم نے تو کبھی بھی زندگی میں اس طرح بحث نہ کی جیسے آج کر رہی ہو۔“

اماں جی نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا وہ زینب کی دلی کیفیت ابھی تک سمجھ ہی نہ پائی تھیں۔

”اماں جی انسان جب جب محنت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نوازتا ہے اسے وہ سب عطا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ پھر وہ

اللہ ہی کے دیئے ہوئے میں سے دوسروں پر خرچ کرتے ہوئے اتنا بخیل کیوں ہو جاتا ہے؟ کیوں نہیں احساس کرتا ان لوگوں

کا جو اس کے زیر کفالت ہیں۔ اماں جی کیا ہمارے مذہب نے کجی اور بخل سے بچنے کا حکم نہیں دیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک

وہ مال سب سے بہترین نہیں ہے جو اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا جائے؟ اور پھر بھی جو شخص ایسا نہ کرے اللہ کے حکم سے رُو

گردانی کرے اللہ کے نزدیک اس کے لیے کیا حکم؟ آپ مجھے وہ بتائیں۔“

وہ نرموٹھے انداز میں اماں جی کی جانب نکلتے ہوئے بولی۔ اماں جی کو سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اسے کیا جواب دیں جس سے

وہ مطمئن ہو سکے اسی لیے بنا کچھ کہے خاموشی سے تسلیج کے دانے گراتی رہیں۔

”آپ جانتی ہیں کل دوپہر فضلہ بھابی لدی پھندی میرے گھر آئیں۔“
یہاں تک کہہ کر وہ رک گئی اور ایک نظر اماں جی کے چہرے پر ڈالی جو تسبیح والا ہاتھ روکے اسی کی جانب ہمدن گوش تھیں۔

”ڈھیروں ڈھیر اپنے سوٹوں کے کپڑے جو ہنا کبے مجھے دکھاتی چلی گئیں اور پھر پتا ہے مجھ سے کیا کہتی ہیں؟“
اس نے ایک بار پھر رک کر اماں جی کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا جو اس کے غصہ کی ایسی کیفیت سے کسی قدر آشنا ہو چکی تھیں۔

”تم بتاؤ گی تو پتا چلے گا تاہنا کہ اس نے ایسا کیا کہا جس نے تم جیسی میری صابر و شاکر بچی کی قوت برداشت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔“

”پوچھنے لگیں کوئی اچھا سا ٹیلر تو بتاؤ، میرا ٹیلر آج کل بیمار ہے اور مجھے ان کپڑوں کو جلدی سلائی کر دانا ہے اس لیے سوچا تمہارے ٹیلر کو دے دوں..... حالانکہ اچھی طرح جانتی ہیں، میں اپنے سالانہ بننے والے چار یا پانچ جوڑے خود گھر میں سلائی کرتی ہوں۔“

نہنب کے لہجے کے دکھ نے اماں جی کے دل کو بھی دکھی کر دیا۔

”دیکھو بیٹا ہر انسان اپنی حیثیت اور ظرف کے مطابق خرچ کرتا ہے۔ اسفند اور صد کو اللہ تعالیٰ نے خوب نواز رکھا ہے جس کا مظاہرہ ان کی بیگمات ہمدقت کرتی نظر آتی ہیں۔ جہاں تک فرہاد کا تعلق ہے وہ حیثیت اور مرتبہ کے لحاظ سے اپنے دونوں بھائیوں سے کم تر ہے، ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا کرو اپنی چھت کے نیچے اچھا کھا کر سوتی ہو۔ گھر اور گھر والا اللہ تعالیٰ کی عطاء کردہ بہترین نعمتوں میں سے ایک ہیں جس پر اپنے رب کریم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ آج اس نے اتنا دیا کل اور بھی دے گا اس کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہو اور ہر دم یہ دعا کرو اللہ تمہارا سہاگ سلامت رکھے۔ یاد رکھنا عورت کے پاس کتنا بھی روپیہ پیسہ کیوں نہ ہو اسے وہ تحفظ کوئی نہیں دیتا جو ایک مرد دیتا ہے یہ معمولی معمولی آسائشوں کو دیکھ کر اپنا دل برا مت کیا کرو میری بچی۔“

وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے بولیں جو اب نہنب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ان کی جانب دیکھا۔
”اماں آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں فرہاد کی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک ہے اللہ نے ہمیں بہت نوازا ہے۔ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور میں تو کبھی اس سے کوئی گلہ نہیں کرتی بھی نہیں ہوں، گلہ تو مجھے فرہاد سے ہے جو اپنے روپے میں سے صرف اور صرف میری ذات پر خرچ ہونے والی رقم کو فضول خرچی سمجھتا ہے۔ اپنی بھابیوں کا ہر وقت تیار رہنا اسے خوب بھاتا ہے مگر جب میری ذات پر خرچ کرنے کی باری آتی ہے تو ہمیشہ سلیقہ شعاری اور کم خرچ کا درس دیتا ہے۔“

”تم اپنے ماہانہ خرچ کے پیسوں میں سے بچت کرنے کی عادت ڈالو۔“

سب کچھ جانتے ہوئے بھی اماں جی اسے مشورہ دے بیٹھیں جسے سن کر وہ یک دم پوری جان سے جل اٹھی۔

کون سے خرچے کے پیسے؟ آپ تو ایسے مشورہ دے رہی ہیں جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہوں۔“

وہ خفگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا بیٹا ناراض مت ہو اب جب فرہاد تمہیں لینے آئے گا میں اسے سمجھاؤں گی کہ اپنی حیثیت کے حساب سے تمہیں ایک لگا بندھا خرچہ دیا کرے جو تمہارا حق اور اس کا فرض ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے دونوں بھائی اور میرے دونوں

بیٹے دیتے ہیں اپنی اپنی بساط کے مطابق وہ بھی اپنا فرض ادا کرنے کی عادت ڈالے اور یہی ہمارے اسلام کا بھی حکم ہے۔“
 ”رہنے دیں آپ، انہوں نے وہ ہی پرانا جواب دینا ہے کہ میں ضرورت کی ہر چیز خرید کر گھر لے آتا ہوں سردی، گرمی، عید شب برأت پر کپڑے بھی بنادیتا ہوں پھر کس بات کا خرچہ۔“
 فرہاد کی باتیں دہراتے ہوئے وہ پاؤں میں چنل ڈال کر اندر کی جانب چل دی اماں جی اس کی پشت پر لگا ہیں جمائے اسے دیکھتی رہیں۔
 ”اماں جی کھانے میں کیا بنے گا۔“ وہ اس کی جانب دیکھنے میں اس قدر محو تھیں کہ اپنی بہو کی کچن سے آتی آواز سن کر ایک دم چونک اٹھیں۔

”نہنہ آئی ہے اس سے پوچھو جو اس کا دل کھانے کو چاہے وہ ہی بنا لو۔“
 اپنی بیٹی کی محبت ان کے لہجہ میں گندمی ہوئی تھی، غزالہ ان کا جواب سن کر اندر نہنہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ اماں جی نے اپنی تسبیح ختم کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔
 ”اے اللہ میری بچی کو شکر ادا کرنے والوں میں شامل کر۔“
 نہنہ کے حق میں اس سے بہتر دعا ان کے نزدیک کوئی اور نہ تھی۔



”یہ ایصال کب تک واپس آرہا ہے۔“ انہوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا اس کا آخری سمسٹر ختم ہوئے تقریباً ایک ماہ سے زیادہ وقت ہو چلا تھا اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔
 ”شاید ابھی تو نہیں.....“ ملک صاحب نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی اپنی نصف بہتر ڈالی جو بڑی نزاکت سے گھونٹ گھونٹ جوس حلق سے نیچے اتار رہی تھیں۔
 ”دراصل ابھی وہ انٹرن شپ کر رہا ہے پھر وہ اور ایشیا اسکاٹ لینڈ گھومنے کے لیے جائیں گے اس کے بعد ان کی واپسی ہوگی اب دیکھو کتنا ٹائم لگتا ہے۔“
 نہایت لا پرواہی سے انہوں نے ایصال کا سارا شیڈول ملک صاحب کے گوش گزار کر دیا، جسے سنتے ہی وہ کچھ بے چین سے ہوا ٹھے۔

”دیکھیں بیگم صاحبہ آپ بہت اچھی طرح جانتی ہیں ایصال ایک شادی شدہ مرد ہے۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے باعث مجھے اس کا اس طرح ایشیا کے ساتھ تنہا گھومنا کچھ زیادہ پسند نہیں اور پھر مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح سب کچھ جانتے بوجھتے آپ اور آپ کے بھائی صاحب نے ان دونوں کو اس طرح دیارِ غیر میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔“

کئی سالوں سے دل میں لمبی ایک بات آج ان کے لبوں تک بھی آن پہنچی۔ ”حیرت ہے آپ ابھی تک وہ پرانا اور فرسودہ قصہ نہیں بھولے۔“

انہوں نے ابرو چڑھاتے ہوئے ملک صاحب کی جانب دیکھا۔
 ”قصہ.....“ ملک صاحب نے ان کے الفاظ کو حیرت سے دہرایا۔
 ”آپ شاید بھول رہی ہیں وہ واقعہ کوئی قصہ کہانی نہ تھا بلکہ ایک جیتی جاگتی اٹل حقیقت تھا جس کا سب سے بڑا گواہ میں

اک ساگر ہے زندگی

خود ہوں، کتنا بھی وقت گزر جائے زمانے کی دھول سے ایسی باتیں مٹا نہیں کرتیں۔ نکاح ایک حقیقت ہے جس سے انکار کرنا آپ کے یا ایصال کے لیے ممکن نہیں ہے، بلکہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ گزرتے وقت کے ساتھ سچائی کو قبول کرنے کے قابل ہو جائیں گی اور ایصال کو بھی سمجھالیں گی مگر حیرت ہے آپ آج تک اپنی اس پرانی ضد پر اڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی اس سخت دلی کے باعث ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹی جیسی عظیم رحمت سے نہیں نوازا۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی ملک صاحب کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”زندگی مجھے نہیں ایصال کو گزارنی ہے اور اپنی زندگی وہ خود ایشہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو خود اس سے پوچھ لیجئے گا اس سارے قصہ کہانی سے، میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر آپ کا بیٹا راضی ہو تو سو بسم اللہ، جسے دل چاہے، ہو بنا کر اس گھر میں لے آئیں میں کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ غصہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب مزید کوئی بات کرنا ملک صاحب کے نزدیک بالکل بے کار اور بے معنی تھا ملک صاحب کیا چاہتے ہیں انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ملک صاحب کا کوئی جواب سننے بغیر وہ بیڑھیوں کی طرف بڑھیں اور کھٹاکٹ کرتی اوپر چڑھتی چلی گئیں ملک صاحب جانتے تھے کہ اب ان کا یہ موڈ کئی دنوں تک اسی طرح آف رہنا ہے۔

کاش ایصال ایک بار فیصلہ کرنے سے پہلے میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ لے، مجھے یقین ہے اسے دیکھنے کے بعد وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی ضرور کرے گا مگر اس کا ملک صاحب کے ساتھ جانا ہی ایک ناممکن امر تھا۔ یہ ملک صاحب کی ایک ایسی خواہش تھی جو بالکل لا حاصل تھی وہ جانتے تھے کہ ایصال، ایشہ کی محبت کے جنون میں بری طرح مبتلا ہے۔ اسے اس سے ہٹ کر دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی۔ وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ کئی سال قبل کیا جانے والا ملک صاحب کا فیصلہ ایک جذباتی عمل تھا جس کا نقصان انہیں اور اس معصوم لڑکی کو ہوا تھا۔ جسے انہوں نے بنا سوچے سمجھے ایصال کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔

ملک صاحب کو لگاتار ش کے سارے پتے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں وہ اپنی جیتی ہوئی بازی ہارتے جارے ہیں ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کریں۔ اس عالم پریشانی میں ایک خیال روشنی بن کر ان کے دماغ میں کوندادہ یک دم سیدھے ہو بیٹھے ابھی ایک آخری تریپ کا پتا ان کے ہاتھوں میں باقی تھا جسے کھیلنے کا فیصلہ انہوں نے اسی دم کر لیا۔ اس کے بعد جو ہوتا وہ اس بچی کا مقدر جسے وقت کی گردش نے بنا کسی قصور کے اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا۔ انہیں ایک آخری کوشش کرنی تھی اس لڑکی کو اس کا حق دلانے کی اور ملک صاحب کو اتنی فیصد یقین تھا وہ اپنی اس کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے باقی بیس فیصد انہوں نے اپنے رب پر چھوڑ دیا۔



وہ مسلسل شاہ زین کی نگاہوں کی زد میں تھی جو اپنے سارے کام چھوڑے شیشے کے اس پار سے مسلسل اسے تک رہا تھا اور شاید اس کی اس بے خودی کا علم حبیبہ کو بھی نہ تھا۔ بلیک سوٹ میں اوپر کر کے بال بنائے وہ بڑی تیزی کے ساتھ کمپیوٹر پر مصروف تھی جب اسے ظہور بلانے آیا۔

”آپ کو زین صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔“

”اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔“ ظہور کے جاتے ہی اس نے اپنے سامنے رکھی فائل اٹھائی یقیناً شاہ زین نے اس سلسلے میں کوئی بات کرنی ہوگی اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ شاہ زین کے آفس میں داخل ہوئی۔

”السلام علیکم سر!“

”وعلیکم السلام بیٹھ جاؤ۔“

بظاہر اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ اپنے سامنے رکھی فائل میں مصروف ہو گیا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا۔“ حبیبہ نے ٹیبل کے دوسرے سرے پر کھڑے کھڑے ہی سوال کیا۔

”ہاں یہ کچھ مختلف کمینز کے ٹینڈر ہیں انہیں ذرا چیک کر لو۔“ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل حبیبہ کی جانب سرکا دی۔

”اوکے سر!“ حبیبہ فائل اٹھا کر واپس ہی پلٹی تھی کہ شاہ زین کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم رک دیئے۔

”حبیبہ.....“

وہ اس کا نام بکار کر رک گیا حبیبہ منتظر تھی کہ وہ آگے کچھ کہے مگر وہ تو بالکل ہی خاموش تھا ایسے جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو مگر

کہہ نہ پائے وہ کسی الجھن کا شکار تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”کافی دن ہو گئے آپ اپنے گاؤں نہیں گئیں؟“

حبیبہ نے حیرت سے اسے دیکھا یقیناً یہ وہ بات نہ تھی جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

”اصل میں سرگاؤں میں میرے چچا ہوتے ہیں جو آج کل خود یہاں کراچی آئے ہوئے ہیں۔“

”اوہ اور تمہارے والدین؟“ شاید وہ صرف اور صرف حبیبہ سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔

”وہ یہاں نہیں ہوتے۔“

اس دفعہ حبیبہ کا جواب دینے کا انداز پہلے سے خاصا روکھا تھا جسے شاہ زین نے فوراً محسوس کر لیا وہ جان چکا تھا کہ اب وہ

مزید کسی سوال و جواب کے موڈ میں نہیں ہے اور پھر حبیبہ کے اگلے سوال نے اس کی بات کو درست ثابت کر دیا۔

”اب میں جاؤں سر؟“

شاہ زین کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ شیشے کا دروازہ دھکیلتی باہر نکل گئی۔

”لعنت ہے مجھ پر جو ہر بار اس لڑکی سے ذلیل ہونے کے بعد دوبارہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ اس

نے اپنے سامنے رکھی فائل زور سے ٹیبل پر پٹائی۔

”آج کے بعد مجھے دوبارہ اس سے کبھی کوئی بات نہیں کرنی خود کو جانے کیا سمجھتی ہے۔“ اس نے غصہ میں خود سے وہ

عہد کیا جو کبھی پورا نہ ہوتا تھا۔

○.....◇.....○

”ارے آپ کب آئے؟“ وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے سالار اور نازیہ کو دیکھ کر سچ جیران رہ

گئی اسے مریم نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع تو دی تھی مگر وہ یہ نہ جانتی تھی کہ آنے والے نازیہ اور سالار ہوں گے۔

”جب آپ نے دیکھ لیا۔“

سالار اس کی جانب بخوردیکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

نازیہ سے گلے ملتے ہوئے اس کے جسم سے پھوٹی قیمتی پرفیوم کی مہک اسے شرمندہ سا کر گئی جبکہ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی

تھی ملگجالباس پسینے سے شرابور وہ جھل سی ہو گئی۔

”آپ بیٹھیں میں پانی لے کر آتی ہوں۔“

وہ وہیں سے واپس پلٹنے لگی جب نازیہ نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔
 ”ارے نہیں تم یہاں آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو کوئی تکلف مت کرو ہم صرف تم سے ملنے آئے ہیں۔“
 اس نے بازو سے تھام کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا اس پل فرہاد کو لڈر تک ہاتھ میں تھاے اندر داخل ہوا جو اس نے
 ان دونوں کے سامنے رکھ دیں فرہاد کی یہ حرکت اسے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ کیا تھا جو اتنی گرمی میں یہ دو کو لڈر تک ہمارے
 لئے بھی لے آتا اس کا تو ویسے بھی دل چاہ رہا تھا کچھ ٹھنڈا ٹھار پینے کو۔
 ”میں کو لڈر تک نہیں پیتا پلیز یہ آپ لے لیں۔“ سالار نے اپنی بوتل اس کی جانب بڑھائی وہ ایک دم شرمندہ سی ہو گئی
 اسے ایسا لگا جیسے وہ زینب کے دل کی بات جان چکا ہے اس نے بوتل کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔
 ”تم سوچ نہیں سکتیں تمہارے اس طرح میرے گھر آنے پر مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔“ وہ نازیہ کا ہاتھ تھاے ہوئے
 خلوص دل سے بولی۔

”صرف اس کے آنے پر۔“ سالار نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔
 ”نہیں آپ دونوں کی آمد نے ہمیں دلی خوشی سے نوازا ہے۔“
 فرہاد کے جواب نے اس کی مشکل کو قدرے آسان کر دیا جواباً وہ صرف مسکرا دیا۔ اس دن زینب کو بار بار ایسا محسوس ہوا
 جیسے وہ مسلسل سالار کی نگاہوں کی گرفت میں ہے جتنی دیر وہ بیٹھا رہا بہانے سے اسے ہی تکتا رہا اس کے اس طرح دیکھے
 جانے سے زینب کچھ نروس سی ہو گئی۔

”اچھا اب ہمیں اجازت دو۔“ کچھ دیر یہاں وہاں کی باتیں کرنے کے بعد نازیہ نے اس سے اجازت چاہی۔
 ”اور ہاں یہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کچھ تحائف میں اور سالار اسلام آباد سے لے کر آئے ہیں امید ہے
 تمہیں پسند آئیں گے۔“ اس نے اپنے قریب رکھے کچھ شاپرڈ اٹھا کر زینب کی جانب بڑھا دیئے۔
 ”ارے ان سب کی کیا ضرورت تھی۔“ وہ انہیں تھاٹتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچاسی گئی۔
 ”تھخہ تحائف ضرورت کے لیے نہیں دیئے جاتے بلکہ یہ تو محبت کے اظہار کا ایک خوبصورت طریقہ ہے۔“
 نازیہ نے بڑی محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھاٹتے ہوئے کہا۔
 ”اور ہاں فرہاد بھائی اب آپ نے جلد ہی اسے اور بچوں کو لے کر میرے گھر آنا ہے۔“

باہر نکلتے نکلتے وہ فرہاد کو تاکید کرنا نہ بھولی جبکہ سالار خاموشی سے پہلے ہی باہر نکل چکا تھا، ان کے جاتے ہی زینب نے
 جلدی جلدی سب کچھ کھول کر دیکھا دو قیمتی کپڑے کے زنا نہ سوٹ، ایک پرنیوم، ہینڈ بیگ، مریم اور جگنو کی ایک ایک فراک
 اس کے علاوہ ایک شاپرڈ میں اسلام آباد کی مشہور بیکری کا کافی سارا سامان تھا۔ ان تمام تحائف کو دیکھتے ہوئے اسے ایک دم
 یاسمین آ پایا آگئیں جو ہمیشہ ان کے مقابلے میں اسفند اور صمد کے بچوں پر زیادہ خرچ کرتیں کیونکہ انہیں وہاں سے واپسی کی
 امید زیادہ ہوتی۔ شاید ان کے نزدیک تحائف کا تبادلہ بھی ایک کاروبار تھا وہ ہمیشہ دوسری طرف سے زیادہ بہتر ملنے کی امید
 میں خرچ کیا کرتیں جبکہ یہاں نازیہ کو علم تھا کہ اس کے دیئے گئے قیمتی تحائف کا بدلہ وہ کبھی نہیں دے سکتی۔ ان تحائف نے اس
 کے دل میں نازیہ کی قدر کئی گنا بڑھا دی فرہاد نے بھی ایک ایک چیز کو اچھی طرح ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ ان بیش قیمت تحائف
 نے اسے کچھ پریشان سا کر دیا اس سے رہانہ گیا اور وہ بول ہی پڑا۔

”وہ جو اتنا سب کچھ تمہیں دے گئے اب بھلا بتاؤ تم جو ان کے گھر ملنے جاؤ گی تو کیا لے کر جاؤ گی اصل میں تمہیں یہ

سب لیتا ہی نہیں چاہیے تھا۔“
 وہ ہر شخص کو اس کسوٹی میں پرکھنے کا عادی تھا جس میں اس کے بہن بھائی اس سے ملا کرتے تھے۔
 ”آپ پریشان مت ہوں وہ میری حیثیت جانتے ہوئے مجھے یہ سب دے کر گئے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ
 انہیں مجھ سے واپسی کی کوئی امید یا ضرورت نہیں ہے۔“
 سب سامان سمیٹ کر اس نے واپس ڈالا اور تمام شاپنگ بیگز اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی اسے فرہاد کا جواب سننے
 سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔



اس دفعہ خالد کی دکھائی گئی لڑکی رابعہ اور فائزہ دونوں کو بہت پسند آئی، کئی سالوں بعد اس لڑکی کے رنگ و روپ کو دیکھ کر
 اسے اپنے پرانے گھر کے سامنے رہنے والی استانی جی کی بیٹی یاد آگئی جس کا نام اسے کئی بار سوچنے پر بھی یاد نہ آیا البتہ یہ ضرور
 یاد تھا کہ کس طرح اس کا معصوم حسن سارے محلے میں مشہور تھا۔ کبھی کبھی تو وہ ایسا بھی محسوس کرتی تھی جیسے وجاہت بھی اسے
 پسند کرتا تھا۔ ایسا اسے اس وقت محسوس ہوتا جب وہ اکثر اوقات اس وقت چھت پر جاتا جب سامنے والی چھت پر وہ لڑکی
 موجود ہوتی اور ان ہی دنوں جب اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس لڑکی کا رشتہ وجاہت بھائی کے لیے مانگ لیا
 جائے اس کی شادی کا کارڈ ان کے گھر آگیا اور اس طرح اس کی خواہش زبان پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی اور اب جب
 وجاہت نے بیوی کے لیے صرف خوبصورت ہونا شرط قرار دیا رابعہ کے دل میں خود بخود استانی جی کی بیٹی جیسے حسن والی لڑکی کی
 خواہش نے ایک بار پھر سے جنم لے لیا اور آج اس لڑکی کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا جسے اس کی خواہش بنا کہے پوری ہونے کا
 وقت آگیا ہے۔ وہ دونوں بہنیں خالد کے ساتھ بڑی خوشی خوشی گھر واپس آئیں وجاہت پہلے سے ہی رابعہ کے گھر موجود تھا یہ
 وقت اس کے دوپہر کے کھانے کا تھا۔

”خالد ہمیں تو لڑکی بہت پسند آئی ہے بس اب آپ بسم اللہ کریں لڑکی والوں سے بات کر لیں اگر انہیں کوئی اعتراض نہ
 ہو تو ہم جلد ہی شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

رابعہ نے جلدی جلدی اپنے پروگرام سے خالد کو آگاہ کیا وہ بہت خوش تھی اور اپنی خوشی میں اس نے خالدہ خالدہ کی
 خاموشی کو محسوس بھی نہ کیا۔

”کیوں بھائی ٹھیک ہے نا۔“ اس نے سامنے چار پائی پر بیٹھے وجاہت سے بھی تصدیق چاہی جو جانے کن سوچوں میں
 گم تھا ویسے بھی وہ ایسا ہی تھا بہت کم بات کرنے والے نہایت کم گوسا۔

”جو تمہارا دل چاہے کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ اپنی رضامندی کا عندیہ تو پہلے ہی دے چکا تھا۔
 ”بس تو خالد پھر ہماری طرف سے تو ہاں ہے۔“

اس نے جلدی جلدی اپنے گھر کے فریق میں رکھی مٹھائی پلیٹ میں نکال کر خالد کے آگے لا رکھی۔
 ”چلو اللہ کا شکر ہے تمہیں کوئی لڑکی تو پسند آئی۔“ خالد نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا مگر ابھی تک انہوں نے مٹھائی کی
 جانب اپنا ہاتھ نہ بڑھایا جبکہ وہ مٹھائی کی بے حد شوقین تھیں۔

”مگر بیٹا یہاں ایک مسئلہ ہے جو اتنا بڑا تو نہیں مگر پھر بھی۔“
 خالد کہتے کہتے رک گئیں اور وجاہت پر ایک نگاہ ڈالی۔

اک ساگر ہے زندگی

”اعتراض تو لڑکی والوں کو بھی نہیں ہے آخر پینتیس سال کی بیوہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ انہیں کیا ملے گا مگر پھر بھی اپنی بیٹی کی سکیورٹی کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی شرط ہے جس پر اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں بات آگے بڑھاؤں۔“
خالہ نے سوالیہ انداز میں رابعہ کی جانب دیکھا۔

”کیسی شرط خالہ؟“ رابعہ ان کی بات سن کر تھوڑا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”لڑکی کا بھائی چاہتا ہے کہ نکاح سے قبل ان کی بہن کے نام وہ مکان لکھ دیا جائے جس میں وجاہت میاں رہتے ہیں اور ویسے بھی بیٹا مکان میاں بیوی میں سے کسی کا بھی ہو، رہنا تو دونوں نے ہی ہے نا۔“ خالہ نے شرط بتانے کے ساتھ ساتھ انہیں قائل کرنے کی بھی کوشش کی۔

”یہ کیسی فضول شرط ہے۔“ رابعہ کے جواب دینے سے قبل ہی وجاہت درمیان میں بول پڑا۔

اس کے ماتھے پر پڑی ٹکٹیں اس کی ناگواری کو صاف ظاہر کر رہی تھیں۔

”ہم نے بھی اپنی دو، دو بہنیں بیاہی ہیں۔ ہم نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی۔ ویسے بھی گھر تو محبت سے بنائے جاتے ہیں۔ خالی کھڑی دیواروں کو اپنے نام کرنے کا کیا فائدہ اور خالہ ذرا پوچھنا اس کے بھائی سے بہن کا رشتہ کر رہا ہے یا سودا، جو نکاح سے قبل مکان چاہیے۔“

”ارے بیٹا تم تو خواہنا ہی برا مان گئے۔ آخر حق مہر شرعی طور پر عورت کا حق ہے اور وہ حق مہر میں ہی مکان مانگ رہے ہیں، تا کہ ان کی بہن کا مستقبل محفوظ رہے۔ اب دیکھو بیٹا برا مت منانا، تم نے پچیس چھبیس سال کے لڑکوں کو اپنی بہنوں کے رشتے دیئے تھے۔ جبکہ وہ پینتالیس سال کے مرد کو بہن دے رہے ہیں اور ایک دفعہ پہلے بھی وہ سب یہ بھگتے کے بعد ہی مختاط ہوئے ہیں۔ پہلی بار بچی کے نام کچھ بھی نہ تھا۔ سسرال والوں نے میاں کے مرتے ہی نکال باہر کیا مرنے والا اگر کچھ بیوی کے نام کر گیا ہوتا تو وہ بچی پچھلے پانچ سالوں سے ایسے نہ زل رہی ہوتی۔“
خالہ نے اپنی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ وجاہت کو قائل کرنے کی۔

”تو کیا وہ جانتے ہیں کہ میں دو چار سال میں ہی مر جاؤں گا۔“ وجاہت نے ٹیکھے انداز سے سوال کیا۔ وہ بات جو خالہ سمجھانا چاہتی تھیں وہ خوب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا۔

”اور فرض کرو خالہ اگر میں جلد ہی مر بھی گیا تو کون ہے جو میری بیوی کو بازو سے پکڑ کر میرے گھر سے باہر کرے گا۔ میرا جو کچھ ہے میری بیوی اور بچوں کا ہی ہوگا اور یہ بات سب جانتے ہیں..... اس لیے اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے۔“
”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا۔ مگر.....“

”بس خالہ بات کو ختم کریں۔ مجھے کسی بھی شرط کے تحت رشتہ کرنا منظور نہیں ہے۔ آپ انہیں ہماری طرف سے انکار کر دیں۔“

وہ کھانا کھانے آیا تھا۔ مگر خالہ کی باتیں سن کر اس کی بھوک اڑ گئی اور اس نے اپنے سامنے رکھی ٹرے ہاتھ سے سرکا کر پرے کر دی۔

”ایسے لالچی لوگ جو میری موت کی صورت میں بہن کا تحفظ چاہ رہے ہیں، مجھے وہاں رشتہ ہی نہیں کرنا۔“ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”بھائی کھانا تو کھالیں۔“ رابعہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

”نہیں آج چودھری صاحب کے مکان کی چھت ڈالنے والی ہے اور میرا کھانا وہیں ہے۔ تم یہ برتن اٹھا لو۔“
جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ..... مگر اب وجاہت کو روکنا بالکل بے کار تھا۔ رابعہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا جو فائزہ راستے سے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ورنہ آج اس کا اور خالہ کا باقاعدہ جھگڑا ہونا لازمی تھا۔ وجاہت پاؤں میں سلپرز پہن کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا بیر دنی گیٹ سے باہر نکل گیا۔

”دیکھو بیٹا کسی بھی بات کو اس طرح اپنی انا کا مسئلہ بناؤ گے تو رشتہ کرنا مشکل ہو جائے گا اور لڑکی تو تم نے خود بھی دیکھی ہے۔ ایسی خوب صورت بچی دوبارہ ڈھونڈنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ اس لیے میں تو یہ ہی مشورہ دوں گی کہ اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ خواہ مخواہ جذباتی نہ ہو۔ جذبات سے رشتے ناتے بنتے نہیں۔ بگڑتے ہیں اور مزید وقت گزر گیا تو جو آج مل رہا ہے وہ بھی نہ ملے گا۔ دو چار سال بعد بھلا کون اسے رشتہ دے گا۔ تم خود سمجھ دار ہو اپنے بھائی کو بھی سمجھاؤ۔“

وجاہت کے باہر نکلنے ہی خالہ کی زبان پھر سے چل پڑی، جانتی تھیں کہ رابعہ زیادہ بحث و مباحثہ نہیں کرتی۔
”ہونا تو خالہ وہ ہی ہے جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ بہر حال پھر بھی میں کوشش کروں گی۔“
رابعہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب وجاہت کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرنا خاصا مشکل امر ہے۔ پھر بھی خالہ کا دل رکھنے کے لیے وعدہ کرتی تھی۔

”تم نے آج پکایا کیا ہے؟“ رابعہ کے ہاتھ میں وجاہت کے کھانے کی ٹرے دیکھ کر خالہ سے مبرنہ ہوا۔

”آلو قہیر.....“ جواب دیتے ہی اس نے ٹرے خالہ کے سامنے رکھ دی۔

”چلو..... وہ تو بنا کھائے چلا گیا۔ اب کھانا ضائع کیوں کیا جائے۔“

خالہ اطمینان سے برقعہ اتارتے ہوئے بولیں۔ رابعہ نے بنا کوئی جواب دیئے ان کے قریب ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا جگ بھی رکھ دیا اور خود کچن کی جانب چل دی، تاکہ اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنا سکے۔ آج اس رشتہ کے حوالے سے اس کا دل بہت دکھا تھا۔ وہ تو پوری امید باندھے ہوئے تھی کہ آج دیکھی جانے والی لڑکی جلد ہی بھابی بن کر اس کے بھائی کے آگن میں اتر جائے گی۔ مگر جانے اللہ کی اس کام میں کیا بہتری تھی۔ یہ تو وہ ہی سوہنارب جانتا ہے۔ ہم تو صرف کوشش کے پابند لوگ ہیں۔



وہ کسی الجھن کا شکار تھی۔ جس کا اندازہ اس کی مسلسل چٹپاتی انگلیوں کو دیکھ کر با آسانی لگایا جاسکتا تھا۔ فرہاد نے ناشتا ختم کر کے برتن پرے سرکا دیئے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ زینب جانتی تھی کہ اب وہ صحن کے نلکے سے ہاتھ دھو کر باہر نکل جائے گا۔ کیونکہ یہ وقت اس کے دکان پر جانے کا تھا اور پھر وہاں سے اس کی واپسی عشاء کے بعد ہونی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ اپنی دکان پر ہی کھاتا تھا۔ لہذا یہ ہی وقت تھا جو زینب اس سے کوئی بات کر سکتی، ورنہ آج سارا دن بے کار جاتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس نے ہمت باندھی اور فرہاد کے پیچھے ہی باہر صحن میں آگئی۔ وہ ہاتھ دھو کر تولیہ سے صاف کر رہا تھا۔ جب اس نے پکارا۔
”فرہاد.....“

اس کی آواز سن کر باہر کی طرف بڑھتے فرہاد کے قدم رکنے لگے۔

”خیریت.....“

زینب کبھی اس طرح اس کے پیچھے نہ آتی تھی۔ اس لیے اس کی حیرت بجا تھی۔

”وہ مجھے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس ہوں تو.....“

اپنی انگلیاں چٹختی وہ رک رک کر بولی۔

”پانچ سو روپے.....؟“ فرہاد نے حیرت سے رقم دہرائی۔

”تم نے اتنے پیسوں کیا کرنا ہے۔“ وہ جانتا تھا نذیب کو اس طرح پیسے مانگنے کی عادت ہی نہیں ہے۔

”مجھے آج شام میں نازیہ کے گھر جانا ہے۔ اس لیے سوچا جانے سے پہلے سادیہ کے ساتھ قریبی مارکیٹ جا کر اس کے

لیے کوئی اچھا سا گفٹ لے لوں۔ جیسے کوئی ڈیکوریشن پیس وغیرہ..... کیونکہ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔“

”اچھا.....“ فرہاد نے جواب کے ساتھ ہی اپنی جیب سے پرس بھی نکال لیا۔ نذیب حیرت سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔

اسے امید تھی کہ فرہاد اس طرح مانگنے پر اسے پانچ سو روپے دے دے گا۔ مگر اس کی یہ حیرت جلد ہی ختم ہو گئی۔ فرہاد نے پرس

سے پیسے نکال کر گننے اور پھر انہیں دوبارہ واپس اندر رکھ دیا۔ اب جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا تھا۔

”ایسا کرو تم تیار ہو جانا، میں چار بجے تک گاڑی لے کر آؤں گا۔ ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ اس طرح میری بھی

سالار سے ملاقات ہو جائے گی ویسے بھی پہلی بار تمہارا ان کے گھر اکیلے جانا اچھا نہیں لگتا، جہاں تک ڈیکوریشن پیس کا تعلق

ہے ان کا گھر جانے کتنے قیمتی سامان سے بھرا ہوا ہے۔ وہاں ہمارا دیا ڈیکوریشن پیس کیا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے ایسا کرتے

ہیں جاتے ہوئے راستے میں سے کچھ پھل اور مٹھائی خرید لیں گے۔“

اس نے اپنا پرس واپس جیب میں رکھتے ہوئے ہر بات کی وضاحت کی۔

”آپ کسی کو جو تحفہ دیتے ہیں۔ وہ آپ کی اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہوتا ہے، ضروری نہیں ہے کہ اگر وہ بہت قیمتی

سامان استعمال کرتے ہیں تو ہمارا تحفہ ان کی نظر میں حقیر ہو جائے گا قیمت تحفہ کی نہیں، خلوص کی دیکھی جاتی ہے اور جو لوگ خود

دوسروں سے خلوص نیت سے ملتے ہیں۔ وہ ایسے تحفوں کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔“

اسے فرہاد کا اس طرح پرس واپس رکھنا بالکل بھی اچھا نہ لگا۔

”کیا تھا جو مجھے ایک پانچ سو روپے دے دیتے اور پھر راستے میں سے پھل، مٹھائی بھی لے لی جاتی۔ اس میں کوئی

حرج تو نہ تھا۔“ اس نے کھستے ہوئے سوچا۔

”میں چار بجے تک آ جاؤں گا، تم تیار رہنا۔“

فرہاد اس کی کسی بھی بات کا جواب دیئے بنا ایک بار پھر سے یاد دہانی کروانا بیرونی گیٹ عبور کر گیا اور نذیب مرے

مرے قدموں کے ساتھ کچن کی طرف آ گئی۔ تاکہ مریم کے لیے ناشتہ تیار کرے۔ کیونکہ اس کے اسکول جانے کا ٹائم ہونے

والا تھا۔ وہ اسے خود ہی اسکول چھوڑنے اور پھر چھٹی کے وقت واپس لینے جاتی تھی۔ ویسے بھی مریم کا اسکول اس کے گھر سے

صرف دس منٹ کی واک پر ہی تھا۔



آج صبح سے ہی وہ کافی چپ چاپ سی تھی۔ اسے اپنا ٹوٹا ہوا آنگن، اس میں لگانیم کا بڑا سا بیڑا، اپنی بیمار ماں اور سگی

ساتھی بری طرح یاد آرہے تھے۔ اپنی ماں کو یاد کر کے اس کا دل کئی بار بھر آیا۔ اسے وہ فاقے یاد آئے جو وہ اپنی ماں کے ساتھ

کرتی تھی اور آج اس کے آس پاس دنیا کی ہر آسائش موجود تھی۔ اے سی جس کے بارے میں اس نے مر کر بھی نہ سوچا تھا۔

اشیائے خورد و نوش سے بھر افرت، جس میں دنیا کی وہ تمام نعمتیں وافر مقدار میں موجود تھیں جن کے لیے ترستے ہوئے اس کا

بچپن گزر گیا۔ ان میں سے کئی چیزیں تو اس نے اپنے بچپن میں دیکھی بھی نہ تھیں۔ جو آج اس کے پاس موجود تھیں۔ مگر اب یہ تمام اشیاء اپنی اہمیت کھو چکی تھیں۔ شاید کسی بھی چیز کی زیادتی اس کی قدر کو کم کر دیتی ہے۔ جس کا احساس ہر گزرتا دن اسے دلا رہا تھا۔

سب کچھ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی وہ آج بھی پہلے ہی کی طرح تہی دامن تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ رشتوں کی کمی رہی تھی۔ پہلے صرف ایک ماں کا رشتہ تھا اور بچپن میں دیکھا ہوا باپ جس پر وقت نے دھول ڈال دی تھی اور ایک بوڑھی نانی جس سے ملنے وہ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ جایا کرتی تھی اور آج صرف ایک ملک انکل اور فضل دین اس کے علاوہ ایک رشتہ اسے اور بھی یاد تھا۔

وہ آج تک اپنے گھر میں اترنے والی وہ شام نہ بھولی تھی۔ جب ایٹال بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس اس کے گھر کے ٹوٹے پھوٹے آگن میں کھڑا تھا۔ اتنے اندھیرے میں بھی اس کے چہرے پر چھائی بے زار کن کیفیت اسے دور سے ہی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایٹال کا صرف وہی ایک آخری تصور اس کے ذہن میں تھا۔ اس دن کے بعد سے لے کر آج تک اس نے کبھی ایٹال کو دوبارہ نہ دیکھا تھا۔ کئی بار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فضل دین سے کہہ کر اس کی ایک تازہ تصویر ہی منگوالے۔ مگر پھر شرم و جھجک آڑے آ جاتی، ہر بار جب ملک صاحب اس سے ملنے آتے وہ لاشعوری طور پر ان کے ساتھ ایٹال کی آمد کی بھی منتظر ہوتی، مگر گزرے ہوئے اتنے سالوں میں وہ کبھی بھی اس سے ملنے نہ آیا۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ اس رشتہ سے خوش ہی نہ ہو اور یہ خیال اکثر ہی اسے بے چین سا کر دیتا۔

وہ جانتی تھی کہ اگر ان نامساعدہ حالات میں ایک ملک انکل اس کے ساتھ نہ ہوتے تو جانے آج وہ کہاں کہاں رُل رہی ہوتی۔ وہ پورے دل سے ان کی احسان مند تھی۔ مگر پھر بھی اس کے دل میں ایٹال سے ملنے کی خواہش ہر وقت ہسکتی رہتی۔ یہاں تک کہ جب وہ رات میں اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کے لیے لیٹی تو بلیک ٹی شرٹ میں ایٹال کا تصور چہم سے ان کے دماغ میں اتر آتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے دماغ سے نہ نکال پاتی۔

جلد ہی اس کے کالج میں گریجویشن کی تقریب منعقد ہونے والی تھی جس میں ملک صاحب کی آمد متوقع تھی۔ اس کا دل چاہتا اسے کاش اس تقریب میں شرکت کے لیے ایٹال بھی ان کے ساتھ آجائے۔ بنا جانے کہ اس کی یہ تمنا لا حاصل تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی تمنا کیا کرتی۔ حالانکہ کئی بار باتوں میں فضل چاچا نے اسے بتایا تھا کہ ایٹال پاکستان میں نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس بار بھی وہ ملک صاحب کے ساتھ نہ آیا وہ ضرور فضل دین سے اس کے بارے میں پوچھے گی۔ وہ فضل دین اور اس کی بیوی کے ساتھ ملک صاحب کے دیئے ہوئے اس فلیٹ میں ہی رہتی تھی۔ اس سے قبل اپنا اسکول کا زمانہ اس نے ہاسٹل میں گزارا اور پھر ملک صاحب نے اسے یہ فلیٹ لے دیا، تاکہ وہ زیادہ آرام اور سکون کے ساتھ رہ سکے۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ اتنے سالوں میں نہ صرف ایٹال بلکہ آنٹی اور ایٹال کا چھوٹا بھائی جس کا اس نے کبھی نام بھی نہ پوچھا تھا کوئی بھی اسے ملنے کبھی نہ آیا۔ سوائے ملک انکل کے جو ہمیشہ ہر موقع پر اس سے ملنے آتے رہے اور اب اس کا دل چاہتا وہ ان سے ایٹال کے بارے میں دریافت کرے، جانے کیوں اسے ایسا لگتا جیسے وہ سب لوگ اس کے وجود سے ہی یکسر لاعلم ہیں اور یہ ہی بات اکثر کانٹے کی طرح اس کے دل میں چھا کرتی، مگر ایٹال تو اس کے وجود سے واقف تھا۔ پھر وہ کیوں نہیں..... آج اس بار جب ملک انکل اکیلے آئے تو میں ضرور ان سے ایٹال کے بارے میں بات کروں گی۔

دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور جلد ہی نیند کی گہری دلدلیوں میں اتر گئی جہاں وہ ہر قسم کی فکروں سے مکمل طور پر آزاد تھی۔



فرہاد گھر آیا تو برآمدے میں موجود بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اس سے پہلے ان بچوں کو کبھی اپنے گھر نہ دیکھا تھا۔

”یہ بچے کون ہیں؟“ اس نے تخت پر بیٹھی سبزی کاٹتی زینب سے سوال کیا۔

”ہمارے کرایہ داروں کے ہیں ایک سادیہ اور ایک بیجی مریم کے ساتھ اس ہی کے سکول میں پڑھتی ہے۔“

زینب نے تمام بچوں کا مکمل طور پر تعارف کر دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہ سب یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ ابھی تک حیران تھا۔

”مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آئے ہیں۔“

زینب نے سبزی کاٹ کے چھلکے قریب رکھے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”تم ٹیوشن پڑھاؤ گی؟“ فرہاد نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

”تم نے تو خود کئی سال قبل میٹرک کیا تھا۔ اب بھلا تم ان بچوں کو کیا پڑھاؤ گی؟“

”آپ فکر نہ کریں، ان کے کورس میں ابھی بھی وہی سب کچھ شامل ہے جو سالوں قبل ہم نے پڑھا تھا۔ کچھ ایسا نیا نہیں

آیا جو مجھے پڑھانے میں مشکل ہو۔“

فرہاد کے مذاق کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیتی وہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے کچن میں آگئی۔ کریلوں کو نمک لگا کر اچھی

طرح مسل کر دی ہیں سنک پر رکھ دیا اور فرہاد کے لیے ایک کپ چائے کا بنا کر دوبارہ برآمدے میں آگئی۔

”ویسے تمہیں کیا ضرورت ہے اس طرح لوگوں کے بچوں کو پڑھانے کی، تم تو بس اپنی بیٹی کو پڑھا لو اتنا ہی کافی

ہے۔“

فرہاد چائے کا کپ تھامتے ہوئے بولا۔ زینب نے کوئی جواب نہ دیا۔

”چلو اب تم سب چھٹی کرو اور کل یاد سے اسی وقت پڑھنے آ جانا۔“ اس نے تمام بچوں کو ایک ساتھ ہی مخاطب

کیا۔

”اماں میں بھی ان کے ساتھ کھیلنے جاؤں؟“ چھٹی کا سن کر سب سے زیادہ خوشی مریم کو ہوئی۔

”ہاں پر مٹی میں مت کھیلاؤ؟“

اتنا کہہ کر وہ کچن کی جانب چل دی۔ اس سے قبل کہ مریم تمام بچوں کو لیے گھر سے باہر نکلتی، کسی نے بیرونی گیٹ کو زور،

زور سے بجایا۔ ساتھ ہی اطلاعی گھنٹی پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ کون آ گیا؟“ فرہاد فوراً کپ ٹرے میں رکھ کر باہر کی جانب لپکا۔ زینب بھی اس کے پیچھے ہی باہر آگئی۔ تاکہ پتا چلے

کون آیا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی اس کے عین سامنے سالار کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر اڑی ہوئیاں کسی انہونی کی اطلاع

دے رہی تھیں۔

”خیریت تو ہے سالار کیا ہوا؟“

نہیں کے کانوں سے فرہاد کی آواز نکلائی۔ سالار کا جواب سننے کے لیے وہ وہیں رک گئی۔
 ”فرہاد بھائی میں نہ نہیں کو لینے آیا ہوں۔ دراصل نازیہ آج صبح سیرھیوں سے گر گئی تھی۔ اس کی حالت کافی خراب ہے۔
 اس کی والدہ ہسپتال پہنچ چکی ہے۔ مگر اپنی عمر رسیدگی اور کچھ بیٹی کی پریشانی کے تحت ان سے سب کچھ سنبھالا نہیں جا رہا میری
 صباحت آپا سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ نہ نہیں کو لے آؤں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پلیز اسے
 میرے ساتھ بھیج دیں، اس طرح شاید میری پریشانی بھی کچھ کم ہو جائے۔“
 وہ پوری تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔

نازیہ پر یکےٹ تھی اور اس حالت میں اس کا سیرھیوں سے گرنا کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کا اندازہ وہ
 بخوبی لگا سکتی تھی۔ تین سال بعد ہونے والے اپنے اس بچے کے معاملے وہ دیسے بھی خاصی حساس تھی۔ یہ خیال دل میں آتے
 ہی نہ نہیں کا دل بھی اس کے دکھ سے بھر گیا۔
 ”تم اندر آؤ، میں نہ نہیں کو بھیجتا ہوں۔“

فرہاد کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ گئی، تاکہ جلدی سے تیار ہو کر سالار کے ساتھ جاسکے اور پھر صرف
 پندرہ منٹ بعد ہی وہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہسپتال جانے والے رستے پر رواں دواں تھی۔



وہ رات خاصا لیٹ گھر واپس آیا تھا کافی عرصہ بعد اس نے اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر خوب آؤٹنگ کی اور
 اپنے کالج کی یادوں کو ایک بھر پھر سے تازہ کیا۔ پہلے مال گھومنا..... پھر مودی دیکھنا اور آخر میں ایک اچھا سا ڈنر کرنے کے بعد
 جب وہ گھر واپس پہنچا تو تقریباً رات کے دو بج چکے تھے۔ کپڑے تبدیل کر کے سوتے سوتے تین بج گئے۔ اسی سبب صبح اس
 کی آنکھ ہی نہ کھلی اور نہ ہی اسے کسی نے جگایا اور ابھی بھی جانے وہ کتنی دیر سوتا رہتا۔ اگر اس کا موبائل نہ بج اٹھتا مسلسل بجتے
 موبائل کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

”ہیلو.....“

لیس کا بٹن پر لیس کر کے اس نے فون اپنے کان سے لگا لیا۔
 ”تم ابھی تک سو رہے ہو؟“ دوسری طرف پایا تھے جو اس کی غنودگی بھری آواز سن کر حیران ہوتے ہوئے بولے۔
 ”میں رات کو کچھ دیر سے سویا تھا۔ اسی لیے آنکھ نہ کھلی۔“

جواب دیتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی گھڑی پر ایک نظر ڈالی جہاں تین بج رہے تھے۔ وہ شرمندہ سا
 ہو گیا۔ وہ تو عام طور پر کبھی بھی اتنی دیر تک سونے کا عادل نہ تھا اور آج تو ویسے ہی پایا نے اسے اپنے کسی کام کے سلسلے میں صبح جلد
 آفس آنے کی ہدایت کی تھی جو وہ بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اب سمجھ نہ آیا۔ معذرت کس طرح کرے۔
 ”اوہ سوری پایا میں بھول گیا تھا کہ.....“

”اٹس اوکے.....“

انہوں نے پوری بات سننے بغیر ہی اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ”میں اور کریم دونوں بینک چلے گئے تھے اور وہ کام بھی ہو گیا۔
 اب تم ٹینشن مت لو اور ذرا جلدی سے فریش ہو کر آفس آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“
 اس کے ساتھ ہی انہوں نے کال ڈسکنیکٹ کر دی اور اگلے تیس منٹ بعد ہی وہ فریش ہو کر آفس جا پہنچا۔ ہال میں

اک ساگر ہے زندگی

داخل ہوئے ہی اس نے ایک غیر ارادی نظر جیبہ کے ٹھیل پر ڈالی جو اس کے وجود سے یکسر خالی تھی۔ شاید وہ آج آئی ہی نہ تھی۔ مگر اس کا یہ خیال پاپا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی غلط ثابت ہو گیا۔ وہ ان کے بالکل سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی غالباً کوئی ڈکٹیشن لے رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر اکاؤنٹس سیکشن کے ماحد صاحب بھی موجود تھے جو اپنے سامنے رکھی کسی فائل پر مصروف تھے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی سب پر ایک نظر ڈالی۔

”السلام علیکم۔“ اس کے مخاطب وہاں موجود تمام افراد تھے۔

”وعلیکم السلام۔“ پاپا کے ساتھ ساتھ ماحد صاحب نے بھی بڑی خوشدلی سے جواب دیا، جبکہ وہ اسے یکسر نظر انداز کیے اپنے کام میں مصروف تھی۔

”آپ آج شام میں فارغ ہیں؟“

پاپا نے اپنے سامنے موجود فائل کو بند کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

مختصر سا جواب دے کر وہ ان کے نزدیک رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”دراصل آج ہمارا ایک وفد بنگلہ دیش سے آرہا ہے شام چھ بجے کی فلائٹ سے۔“

انہوں نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”میں چاہتا ہوں اس وفد کو ایئر پورٹ ریسیو کرنے تم جاؤ اور چونکہ آنے والے مہمانوں میں ایک خاتون بھی شامل ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا اپنے ساتھ جیبہ کو لے لو۔ آفس کی گاڑی بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔ جس میں کرم دین اور ماحد صاحب دونوں ہی موجود ہوں گے۔“

انہوں نے مکمل تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا جی چاہا پاپا سے سوال کرے۔ کیا جیبہ تمہارے ساتھ چلی جائے گی؟ مگر چاہتے ہوئے بھی وہ یہ سوال نہ کر سکا۔

”آپ نے جیبہ سے پوچھ لیا ہے۔ انہیں میرے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بول ہی پڑا۔

”اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا؟“

پاپا نے چشمہ کے اوپر سے جھانکتے ہوئے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

”ویسے تو وہ کرم دین کے ساتھ بھی جاسکتی ہے، لیکن جب تم جارہے ہو تو میں نے بہتر سمجھا کہ اسے تمہارے ساتھ ہی بھیجوں۔“

جیبہ بالکل خاموشی سے اپنے سامنے رکھے پیپر ڈیسک میں مصروف تھی۔ ”اگر انہیں کوئی مسئلہ ہو تو میں کرم دین ہی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“

تمام کاغذ سمیٹ کر فائل میں لگاتے ہوئے اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ دل چاہا وہ اس کے خیال سے مکمل طور اتفاق کرتے ہوئے اسے مشورہ دے کہ وہ کرم دین ہی کے ساتھ چلی جائے۔ مگر جانتا تھا کہ اسے یہ مشورہ دینا خود ہی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ جبکہ جیبہ کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ چلی جائے شاہ زین کو اس کے ساتھ سفر کرنے کا

ایسا حسین موقع جانے دو بارہ کب ملتا۔ یہی سوچ کر جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔

”نہیں..... بھلا اسے کیا پرابلم ہوگا۔ تم جاؤ اس کے ساتھ۔“

اس تمام گفتگو کے دوران شاہ زین صوفی پر بیٹھا مسلسل اپنے سیل میں مصروف رہا۔ بالکل ایسے جیسے اس تمام مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم لوگ ذرا جلدی نکلنے کی کوشش کرو۔ اگر فلائٹ ٹائم پر آگئی تو ٹریفک کے رش کے باعث تمہیں ایئر پورٹ پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔“

پاپا کی بات سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حبیبہ کے باہر نکلتے ہی خود بھی دروازہ دھکیلتا ہوا کوریڈور میں آ گیا۔

”میں ذرا اپنا بیڈ بیک لے لوں۔“

اس کا جواب سنے بنا وہ اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور جب تک وہ کوریڈور سے گزر کر بڑے ہال تک پہنچا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ شاہ زین آہستہ آہستہ چلتا لفٹ تک آ گیا۔

”ایک ہی لفٹ میں چلیں یا آپ علیحدہ آئیں گی۔“

لفٹ کا بٹن پریس کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر حبیبہ سے سوال کیا۔

”جب گاڑی میں ایک گھنٹہ تھا آپ کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں تو دو سیکنڈ لفٹ کا ساتھ برداشت کرنے میں کیا قیامت ہے۔“

اس کے سوال کا بالکل اسی کے انداز میں جواب دے کر اس نے اپنے منہ پر آئے بالوں کو ہاتھ کی مدد سے پیچھے کیا اور پھر ایئر پورٹ تک سارے راستے وہ بالکل خاموش کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اسے مخاطب کرنے کی خواہش نے کئی بار شاہ زین کے دل میں سر اٹھایا۔ جسے اس نے بڑی مشکل سے جھٹک کر سلا دیا۔ ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہو کر خاموشی سے گاڑی لے کر جا کر پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ باہر نکل آیا۔

”ایک بات پوچھوں سر.....“ اس کے باہر نکلتے ہی جانے حبیبہ کو کیا یاد آ گیا۔

”پوچھیں.....“

وہ اپنی بیٹنٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نہایت سنجیدگی سے بولا۔ اسے حیرت تھی کہ حبیبہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“ یہ ایسا سوال تھا۔ جس کی توقع شاہ زین کم از کم حبیبہ سے تو بالکل بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حیرت کے باعث اس کا منہ کھلے کا کھلے رہ گیا۔

”حیرت ہے آپ بھی کسی کی ناراضی کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

وہ واقعی حیران تھا۔

”کیوں کیا میرا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا؟“

اس نے آج پہلی بار حبیبہ کو مسکراتے دیکھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کچھ مسکراہٹیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن پر جان قربان کی جاسکتی ہے اور یقیناً حبیبہ کی مسکراہٹ کا شمار بھی ان میں ہی ہوتا تھا۔

”آپ کی مسکراہٹ بے حد خوب صورت ہے۔“

اس نے تعریف کرنے میں بالکل بھی بخل سے کام نہ لیا۔

”شکریہ.....“

اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

اک ساگر ہے زندگی

شاہ زین کو ایسا لگا جسے اس کے آس پاس کوئی مدھر جھرتا بہہ رہا ہو حبیبہ کی ہنسی اس کی مسکراہٹ سے کہیں زیادہ دلفریب تھی۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ جیسے جیسے حبیبہ کو جان رہا ہے۔ ویسے ویسے اس کی محبت میں اور زیادہ غرق ہوتا جا رہا ہے اور شاید اس کی اس محبت کا احساس حبیبہ کو بالکل بھی نہ تھا اور یہی احساس اس کے دل میں جگانے کی امید لیے وہ ایئر پورٹ لاؤنج میں داخل ہو گیا۔



”کیا بات ہے گڑیا، تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی؟“

وہ کب سے اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں تھوڑے سے فرائیڈ رائس ڈالے انہیں کانٹے کی مدد سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ اس کا دھیان بالکل بھی کھانے کی طرف نہ تھا۔ جسے سیکینہ نے محسوس تو بہت پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر کچھ دیر تک خاموشی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

”بھوک نہیں۔“

اس نے پلیٹ اپنے آگے سے کھسکاتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

سیکینہ سمجھ گئی، آج پھر پرانی یادوں نے اس کے دل میں ڈیرہ ڈال لیا ہے اور یقیناً اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ ایسے میں ہمیشہ سیکینہ بالکل خاموش ہو جایا کرتی اس وقت تک جب وہ رو کر اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لیا کرتی اور سچ تو یہ تھا کہ سیکینہ کو اس سے اس تنہا اور معصوم سی لڑکی پر دل کھول کر ترس بھی آتا۔ جس کے پاس دنیا کی ہر آسائش ہوتے ہوئے بھی شاید سکون نہ تھا۔ کبھی کبھی تو اسے اس بات پر بھی حیرت ہوتی کہ ایسی کیا مشکل تھی جو ملک صاحب نے اسے یہاں اس طرح ان لوگوں کے سہارے چھوڑ رکھا تھا۔ کیوں اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر نہیں جاتے اور یہ سوال اس نے کئی بار فضل دین سے کیا۔ جس کا جواب وہ کبھی بھی نہ دیتا تھا اور یہ ہی اس کی اپنے مالک سے وفاداری کا ایک ثبوت بھی تھا۔ ابھی بھی اس نے بنا کوئی بات کیے خاموشی سے نیبل پر رکھے برتن سمیٹنے شروع کر دیئے۔

”آئی جی.....“

وہ ہمیشہ سیکینہ کو اسی نام سے پکارتی۔

”جی میرا بچہ؟“

اس کی پکار کا جواب سیکینہ اسی طرح اسے ہی پیار سے دیا کرتی۔

”آپ کبھی ملک انکل کے گھر گئی ہیں۔“

ایک ایسا سوال جس کی امید سیکینہ کو بالکل بھی نہ تھی۔

”نہیں.....“

مختصر سا جواب دے کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”ان کی بیگم یا فیملی کے کسی اور فرد سے کبھی ملی ہیں؟“

آج اس طرح کیے جانے والے اس کے ان سوالوں کا کیا مقصد تھا۔ فی الحال سیکینہ سمجھ نہ پاتی۔ ”نہیں میرا بچہ کبھی بھی نہیں۔“

”اچھا.....“

اب سیکینہ اپنے ہاتھ روکے منتظر کھڑی تھی کہ شاید وہ کچھ اور پوچھے گی۔ مگر دوسری طرف بالکل خاموشی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھی چپ چاپ اپنے ہاتھوں کو ننگے جا رہی تھی۔ جب سیکینہ نے اسے مخاطب کیا۔
وہ بھی بھی اسے بیگم صاحبہ یا چھوٹی بی بی نہ کہتی اور نہ ہی کسی اس کا نام لیا کرتی۔ بلکہ ہمیشہ گڑیا یا بچہ ہی کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔

”ہاں پوچھو کیا پوچھنا ہے۔“

وہ اپنا چہرہ تھیلی کی کٹوری میں جماتے ہوئے بولی۔

”ملک صاحب آپ کے سگے چچا ہیں؟“

وہ سوال جو وہ اکثر فضل دین سے کیا کرتی تھی۔ آج اس سے بھی کر بیٹھی اس امید پر کہ شاید یہاں سے ہی اسے کوئی جواب مل جائے۔

”پتا نہیں.....“

وہ جانتی نہ تھی یا پھر بتانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سیکینہ سمجھ نہ پائی۔

”سیکینہ آنٹی، چاچا فضل دین کبھی ملک انکل کی فیملی سے ملے ہیں۔ مطلب ان کی بیوی، بچوں کو کبھی دیکھا ہے؟“

بات جو وہ جانتا چاہتی تھی ابھی تک اس کے لبوں تک نہ آئی تھی۔

”پہلے تو اکثر ہی جایا کرتے تھے۔ مگر جس دن سے آپ کا نکاح.....“ سیکینہ نے اپنی بات درمیان میں ہی چھوڑ دی۔

ایک دم کمرے میں چھا جانے والی خاموشی پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کے عین درمیان میں فضل چاچا کھڑے تھے۔ وہ فوراً سے پیشتر سیکینہ کی خاموشی کی وجہ جان گئی۔ وہ سمجھ گئی۔ سیکینہ ضرور کوئی ایسی بات بتانا چاہتی تھی جسے بتانے سے اسے چاچا نے منع کیا تھا اور اب یقیناً سیکینہ اس موضوع پر اس سے دوبارہ بات نہ کرے گی۔ جس کا اندازہ اس وقت سیکینہ کی خاموشی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”السلام علیکم چاچا.....“

فضل دین کو سلام کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام بچے، کیا ہو رہا ہے؟“

فضل دین اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتا کچن کی جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ بازار سے آیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں کافی سارے سامان کے تھیلے تھے۔ جنہیں وہ کچن میں رکھ کر دوسرے ہی پل واپس پلٹ آیا۔

”آج میں چھوٹی بی بی کی پسندیدہ مچھلی لایا ہوں، تم اسے اچھی مرچ مسالا لگا کر روست کر دو۔“

”پلیز چاچا آپ مجھے بی بی جی مت کہا کریں۔“

اس لفظ سے وہ ہمیشہ ہی چڑ جایا کرتی تھی۔

”اچھا بیٹا معاف کرنا، کوشش تو بہت کرتا ہوں، مگر پھر بھی دل اور زبان سے آپ کا احترام نہیں جاتا۔ ارے یاد آیا آج

تو میں آپ کے لیے ڈھیروں ڈھیر انگوڑ بھی لایا ہوں۔ جاؤ سیکینہ جلدی سے باسکٹ میں ڈال کر دھولاؤ۔“

”رہنے دیں آنٹی مجھے انگوڑ نہیں کھانے۔“

اک ساگر ہے زندگی

جانے کیا ہوا، اس نے زوردار آواز سے کرسی کھینچ کر پیچھے کی، آج انگوروں نے اس کے دل میں ان پرانی یادوں کو پھر سے زندہ کر دیا۔ جن کی کمک سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے یہ آنسو سیکندہ یا فضل دین کے سامنے بہہ کر انہیں پریشان کریں۔ اس لیے تیزی سے آگے بڑھ کر لاؤنج کا دروازہ کھولتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ سچ ہے انسان جیتے جی اپنے ماضی سے کبھی بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس کا ماضی ہر پل، ہر گھڑی اور ہر دم اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے۔ جہاں ذرا حال نے آنکھیں دکھائیں، ماضی فوراً سے پیشتر سامنے آن کھڑا ہوتا اور وہ تو اپنے ماضی کو شاید تاحیات نہ بھول سکتی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازے کو لاک لگا دیا۔ اب اس خالی کمرے میں وہ تھی یا اس کا ماضی جہاں ہر لمحہ اس کے ساتھ اس کی ماں کا سایہ بھی تھا آج وہ اپنے ماضی میں پوری طرح ڈوب جانا چاہتی تھی۔ خود سے وابستہ ہر یاد کو پھر سے جگانے کی خواہش لیے وہ اپنے بستر پر گر گئی۔ اس کے سامنے اس کا بچپن آن کھڑا ہوا اور وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔



”یار پلیز یہ گرین کلر بہن کر میرے سامنے مت آیا کرو۔“

اریشہ جیسے ہی تیار ہو کر باہر نکلے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایٹال چیخ اٹھا۔

”کیوں کیا ہوا، اتنا خوب صورت کمر تو ہے؟“

وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتے ہوئے شرارت سے ہنسی۔

”تم اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ رنگ میری دکھتی رنگ ہے اور میری گزری ہوئی یادوں میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اس دن اس مقام پر جمع تمام لوگ۔“

اریشہ جانتی تھی کہ اس کے گرین کلر سے اس قدر نفرت کرنے کا پس منظر کیا ہے۔ مگر آج سے پہلے ایٹال نے اسے اس طرح کبھی نہ ٹوکا تھا جس طرح آج۔

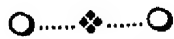
”ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی کہ کم از کم تمہارے سامنے آتے ہوئے یہ رنگ نہ پہنوں۔“

اس نے مصالحت آمیز انداز میں جواب دیا۔

”تم آئندہ اس کلر کا کوئی سوٹ ہی نہ بناؤ تو زیادہ بہتر ہوگا اور ہو سکے تو یہ شرٹ پہننا شروع کر لو۔“

”فی الحال تو یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ کلاس شروع ہونے میں صرف چند رہ منٹ رہ گئے ہیں اور تم جلدی سے آ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس رنگ کے چکر میں ہماری آج کی مائیکرو اکنائکس کی کلاس رہ جائے اور آج تو میری پریزنٹیشن بھی ہے۔“

وہ جلدی جلدی بولتی اپنا بیک کندھے پر ڈالے باہر کی جانب لپکی۔ ایٹال اپنی سوچوں میں گم سست رفتاری سے قدم اٹھاتا اس سے خاصا پیچھے رہ گیا۔



پورے دس دن اس نے جی جان سے نازیہ کی تیار داری کی۔ سالار اسے روزانہ صبح لے جاتا اور پھر شام میں واپس گھر چھوڑ دیتا۔ وہ اپنی بیٹیاں صبح میں سادیہ کے گھر چھوڑ دیا کرتی۔ جہاں سے واپسی میں انہیں لے لیتی۔ ویسے بھی مریم کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اس لیے بھی کوئی زیادہ مسئلہ کھڑا نہ ہوا۔ البتہ ان دس دنوں میں اسے سالار کے رویہ نے جگہ جگہ چونکایا۔ وہ جس طرح نازیہ کا خیال رکھتا۔ زینب کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ دوبارہ فرہاد کے بچوں کی ماں بننے پر بھی کبھی اس

نے نینب کا اتنا خیال نہ رکھا جتنا سالارا اپنا بچہ کھودینے پر بھی اپنی بیوی کا رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود کئی لوگوں کا تجزیہ کیا۔ اسے لگا دنیا کے زیادہ تر مرد سالار جیسے ہی ہوتے ہیں محبت کرنے والے اور اپنی بیوی کا ہر حال میں خیال رکھنے والے۔ شاید فرہادی ان تمام مردوں میں سے ایک الگ مرد تھا وہ دن میں کئی بار سالارا اور فرہاد کا موازنہ کرتی تو اسے ہمیشہ سالار ہی کا پلڑا بھاری لگتا۔ اس دس دنوں نے نینب کی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا۔ نینب پہلے والی نینب نہ رہی۔ سالار کے عارضی ساتھ نے اسے خود اعتمادی بخش دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار سالار کے ساتھ بیٹھ کر ایک فائینسٹار ہوٹل میں کھانا بھی کھایا۔ اس وقت جب وہ اسے واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ کسی فائینسٹار ہوٹل کو اندر سے دیکھنا بھی اس کی زندگی کا وہ خواب تھا جو شاید فرہاد کبھی بھی پورا نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو جب رات کو دوکان سے واپس آتا تھا تھکا ہوا ہوتا کہ اس سے اس طرح کی تفریح کی امید رکھنا تقریباً ایک ناممکن سی بات تھی۔ بہت ہوتا تو وہ انہیں چھٹی والے دن ساحل سمندر پر لے جاتا۔ جہاں دو گھنٹہ گھومنا اور واپسی میں کسی ٹھیلے سے برگر خرید کر کھانا ہی اس کی زندگی کی بہترین تفریح تھی۔ وہ تو زندگی کے ان رنگوں سے قطعی نا آشنا تھی۔ جن سے اسے سالار نے واقف کیا۔ ایک دن واپسی میں وہ اسے بازار بھی لے گیا جہاں اس نے نازیہ کی ضرورت کی کچھ اشیاء خریدنی تھیں اور ایسے میں اس نے نینب کو بھی کافی کچھ لے دیا۔ اس کے اور سالار کے درمیان جو ایک جھجک تھی ان دس دنوں میں وہ مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اور سالار کا چند روزہ ساتھ اب جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔ کیونکہ نازیہ تیزی سے صحت یاب ہونے کے بعد گھر منتقل ہو گئی جہاں اس کی خدمت کے لیے ہر وقت ملازم موجود تھے اور اب فرہاد بھی اس کے اس طرح روزانہ سالار کے ساتھ جانے پر تھوڑا سا چڑنے لگا تھا۔

مریم کے اسکول کھلنے والے تھے۔ اس کی عارضی تفریح ختم ہونے والی تھی۔ مگر ان چند دنوں میں ہی وہ سالار کے وجود کی عادی ہو گئی تھی سوتے جاتے، چلتے پھرتے وہ سالار کا موازنہ فرہاد سے کرتی تو اسے ہمیشہ سالار اخلاقیات کی بلندیوں پر دکھائی دیتا اور ہر روز فرہاد اتنا ہی ہستی میں پڑا نظر آتا۔ کچھ تو فرہاد کی اپنی بیوی سے لا پرواہی اور کچھ نینب کا کیا جانے والا موازنہ دونوں نے مل کر اس کے دل میں فرہاد کے خلاف کئی طرح کے منفی خیالات بھر دیئے اور ان ہی خیالات نے آگے چل کر اسے اپنی زندگی کا وہ بدترین سبق دیا جسے وہ مرتے دم تک نہ بھولی۔



وجاہت کی شادی کے سلسلے میں شروع ہونے والا راجہ کا جوش و خروش جلد ہی مابند پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ یہ معاملہ ایسے ختم ہوا جیسے کبھی شروع نہ ہوا تھا۔ خالدہ خالہ نے اس کے بعد انہیں کوئی ایسا اچھا رشتہ ہی نہ دکھایا کہ بات بنتی یا پھر شاید راجہ کو ہی اس رشتہ کے بعد کچھ پسند نہ آیا اور جہاں تک وجاہت کا تعلق تھا وہ اس مسئلے سے روز اول کی طرح بے گانہ تھا۔ رشتہ ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق پڑتا نظر نہ آتا۔ بظاہر وہ پہلے ہی کی طرح اپنی تنہا زندگی سے مطمئن تھا۔ مگر جب بھی کبھی وہ راجہ کے گھر کھانا کھانے آتا اس کا دل اپنے بھائی کی تنہائی کا سوچ سوچ کر جلتا، کڑھتا رہتا۔ اس کا بس کا نہ چلتا وہ کسی بھی طرح اپنے بھائی کا نکاح کر کے اس کا گھر آباد کر دیتی۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار رستم اور اس کی بیوی حرا سے بھی کہہ چکی تھی۔ اپنے شوہر عمر سے بھی کہا کرتی کہ اگر کوئی اچھی لڑکی نظر میں ہو تو وجاہت بھائی کے لیے دیکھنا، مگر لا حاصل ایسا لگتا جسے اس کے بھائی کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہ تھی یا پھر شاید ابھی بھی اس کا وقت نہ آیا تھا۔ اس وقت تو اسے قدرت کی ستم ظریفی پر بے حد غصہ آتا جب وہ کسی ساٹھ سالہ شخص کو دوسری یا تیسری شادی کرتا دیکھتی اور سوچتی۔

”اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب میں دو، تین شادیاں لکھ دیں اور میرے بھائی کے لیے ایک بھی نہیں۔“
مگر شاید قدرت کے کیے جانے والے کچھ فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن میں انسان مکمل طور پر بے اختیار ہے۔ جیسے زندگی، موت، اولاد اور پھر شادی اور یہ بات گزرتے وقت نے بہت اچھی طرح رابعہ کو سمجھا دی تھی۔

○.....◇.....○

”امی جی.....“

اس نے چٹائی پر ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کا گھٹنا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جب سے سکول سے آئی تھی۔ اس کی ماں اسی طرح اپنے سامنے مشین رکھے مسلسل سلائی کرنے میں مصروف تھی۔ شاید یہ کسی کا آرڈر تھا جو انہیں جلد مکمل کر کے دینا تھا۔ وہ کتنی دیر سے ہاتھ، منہ دھوئے، یونیفارم تبدیل کیے ان کے قریب بیٹھی اس بات کی منتظر تھی کہ کب اماں انہیں اور کچن سے کھانا لے کر آئیں۔ ہمیشہ سکول سے واپسی پر وہ دونوں ماں، بیٹیاں مل کر کھانا کھاتیں، مگر آج تو وہ اس قدر مصروف تھیں کہ شاید اس کی وہاں موجودگی بھی بھلائے ہوئے تھیں۔ مشین کی مسلسل گھر گھر کی آواز سے تنگ آ کر اس نے ان کا گھٹنا پکڑ کر ہلا دیا۔

”کیا ہوا.....“

سوئی میں دھاگا ڈالنے کے بعد انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنے نہایت قریب بیٹھی اپنی بیٹی پر ایک نظر ڈالی۔ جس کے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ بھوک کی شدت سے بے حال ہے۔ انہیں فوراً ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔

”معاف کرنا بیٹا میں نے یہ سارے کپڑے آج شام تک مکمل کر کے دینے ہیں۔ کیونکہ سامنے والی صوفیہ باجی آج رات میں کراچی جا رہی ہیں۔ وہاں ان کے بھائی کی شادی ہے اور تم تو جانتی ہوں کہ وہ پیسے بھی اسی وقت ادا کر دیتی ہیں۔“

بھوک کی شدت میں اسے یہ بھی یاد نہ آیا کہ صوفیہ باجی کون ہیں جن کا ذکر اس کی ماں کر رہی ہے اور نہ ہی اسے ان ساری باتوں سے کوئی غرض تھی۔

”اماں مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

ان کی ساری باتوں کو نظر انداز کر کے اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔ ویسے بھی صبح ناشتے کے نام پر کھایا جانے والا ایک پاپا جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ بریک میں بھی وہ کبھی کچھ نہ کھاتی، کیونکہ اس کے پاس پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔

”کچن کی الماری کھولو، کٹوری میں اچار رکھا ہے، وہیں قریب ہی کپڑے میں لپٹی روٹی بھی رکھی ہے۔ نکال کر لے آؤ۔“

”کیوں آپ نے کھانا نہیں کھانا۔“ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی ماں سے سوال کیا۔

آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس کی ماں بنا اس کا انتظار کیے اکیلے ہی کھانا کھالے۔ پھر آج ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔

”میں نے صبح ناشتے میں جو روٹی کھائی تھی وہ ہی ابھی تک ہضم نہیں ہوئی، تم کھانا کھاؤ۔ میں یہ سلائی مکمل کرنے کے

بعد خود ہی کھالوں گی۔“

اسے جواب دے کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کچن کی جانب آگئی۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے کا سن کر ہی اس کی بھوک قدرے کم ہو گئی تھی۔ اس نے اندر آ کر سبزی کی ٹوکری میں جھانکا۔ شاید کوئی آلو مل جائے تو خود ہی سالن بنا لے، مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

”امی جی آلو نہیں ہیں۔“ اس نے اندر سے ہی آواز لگا کر پوچھا۔

”نہیں بیٹا..... ابھی یہ کپڑے سلائی کر کے دے آؤں، پھر واپس آتے ہوئے لے آؤں گی، ابھی تم اچار سے کھانا کھا

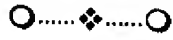
لو، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

اسے اچار کبھی بھی اتنا پسند نہ تھا یا شاید ہر بار اچار سے روٹی کھا کھا کر اب وہ قدرے تنگ آ چکی تھی۔ اس لیے منہ بسورتی کچن سے باہر آگئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ گھر میں راشن ختم ہے۔ اسی لیے اس کی ماں اپنی بھوک پیاس بھلائے تندہی سے سلائی کرنے میں مصروف ہے۔ باہر نکلتے ہی اماں نے سلائی والا ہاتھ تو روک کر ایک نظر اس کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

”دیکھو بیٹا جو طے بسم اللہ پڑھ کر کھایا کرو اور کھانے کے بعد ہمیشہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ جس کے حکم سے روٹی کا یہ نوالہ تم تک پہنچا اور نہ جانے اس وقت اس دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو بھوکے پیاسے روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترس رہے ہیں۔“ اپنی ماں کی بات سنتے ہی وہ دوبارہ کچن میں آگئی۔ الماری کھول کر روٹی نکالی، اس پر اچار کی ایک چمک رکھی اور باہر چار پائی پر آ بیٹھی۔

”یاد رکھنا بیٹا، جتنا شکر کرو گی اللہ اتنا ہی نوازے گا۔ ورنہ مجھ جیسے ناشکرے بندوں کو تو وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پھینچے میں منٹ نہیں لگاتا۔ اس لیے ہمیشہ اس سے ڈرتے رہو۔“

اس نے ہر وقت اور ہر حال میں اپنی ماں کو اللہ کا شکر ادا کرتے ہی دیکھا تھا۔ وہ تو سوتے جاگتے خالی پیٹ بھی اپنے رب کا شکر ہی ادا کرتی تھی تو پھر جانے وہ کون سی ناشکری تھی، جس کا ذکر اس نے اکثر اوقات اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی یہ سوال اپنی ماں سے نہ کر سکی۔ اسے لگتا اس ایک کے پیچھے کوئی ایسا درد ضرور چھپا ہے جو ہمیشہ اس کی ماں کی آنکھوں سے جھانکتا تھا۔



وہ جیسے ہی مارکیٹ سے باہر نکلیں اچانک ہی نگاہ روڈ کے دوسری جانب کھڑی زینب پر پڑی۔ پہلے تو کافی دیر تک انہیں یقین ہی نہ آیا کہ وہ زینب ہے۔ بے شک وہ خود کو کالی چادر میں اچھی طرح لپٹے ہوئے تھی۔ پھر بھی اس کی غیر معمولی تیاری انہیں روڈ کے دوسری طرف سے بھی صاف نظر آ رہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران تو انہیں زینب کے لیوں پر لگی ڈارک ریڈ لپ اسٹک نے کیا۔ انہیں سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ انہوں نے اس سے قبل کبھی زینب کو اتنی گہری لپ اسٹک لگائے دیکھا ہو وہ تو ہمیشہ سے ہلکے رنگ استعمال کرنے کی عادی تھی اور آج اس کے ہونٹوں پر لگی ریڈ لپ اسٹک نے کالی چادر میں بھی اس کے حسن کو کئی گنا بڑھادیا تھا۔ مگر انہیں سب سے زیادہ حیرت زینب کے اس طرح تن تھاروڈ پر کھڑے ہونے کی تھی۔

”یہ یہاں کیا کر رہی ہے، وہ بھی بالکل اکیلی۔“

یہاں وہاں نظر دوڑانے پر بھی انہیں اس کے آس پاس کوئی ایسا فرد دکھائی نہ دیا۔ جسے دیکھ کر سوچا جاسکے کہ وہ زینب

اک ساگر ہے زندگی

کے ساتھ ہے اتنے مہنگے شاپنگ مال کے بالکل سامنے کھڑی نینب کے ہاتھوں میں موجود مختلف شاپرز نے انہیں تجسس میں جکلا کر دیا۔ ایسی جگہ جہاں نینب کی رسائی بھی ان کے نزدیک ناممکن تھی۔ وہاں اس کے ہاتھوں میں ڈھیروں ڈھیر سامان انہیں کوئی اور ہی کہانی سنارہا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ روڈ کراس کر کے نینب کے پاس جاتیں، تاکہ اسے جکلا یا جاسکتا کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے ایک دم ہی بلیک کلر کی کرولا اس کے پاس آ کر رکی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود سالار کو دیکھ کر وہ حق و حق رہ گئیں۔ صباحت کی بہن کی شادی پر ہونے والی ایک سرسری سی ملاقات کہاں تک پہنچ چکی ہے۔

انہیں یقین ہی نہ آیا۔ سالار کی وہاں موجودگی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ نینب اسی کے ساتھ یہاں تک آئی ہے۔ ورنہ اسے تو شاید اس مارکیٹ کا نام بھی نہ پتا تھا۔ انہوں نے نینب کو فرنٹ ڈور کھول کر بڑے استحقاق کے ساتھ سالار کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے دیکھا۔ دوسرے ہی پل آہستہ آہستہ ریگتی گاڑی آگے کی جانب بڑھ گئی، جبکہ وہ ہکا بکا اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑی تھیں اور جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑی رہتیں، اگر ان کا ڈرائیور پارکنگ سے گاڑی لے کر نہ آ جاتا۔ ڈرائیور کے کئی بار بجائے جانے والے تیز ہارن کی آوازیں سن کر انہیں اپنی گاڑی کی آمد کا علم ہوا۔ ورنہ وہ تو حیران و پریشان اسی سمت جانب بنگے جا رہی تھیں۔ جس طرف سالار کی گاڑی میں بیٹھ کر نینب گئی تھی۔

”خان محمد گاڑی ذرا تیز چلانا، مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔“

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ان کا ارادہ نینب کے گھر جانے کا تھا۔ شاید اس طرح وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ سکیں۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کا یہ ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اب وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھیں۔ تاکہ صباحت کو فون کر کے اس نئی صورت حال سے آگاہ کر سکیں۔ جس کا سامنا ابھی کچھ دیر قبل انہوں نے کیا تھا۔



آج کل ایسا لکچر عجیب سی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔ آگے کو بڑھتا وقت اسے دھیرے دھیرے تمام رشتوں کی نزاکتوں سے آگاہ کرنا جا رہا تھا وہ جو ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہا کہ پاپا کا بحالتِ مجبوری جوڑا جانے والا رشتہ کسی اہمیت کا حامل نہیں ہے یا وہ جب چاہے اپنی مرضی سے کوئی دوسرا نیا رشتہ استوار کر سکتا ہے۔ وقت نے اس کی اس سوچ کو قدرے تبدیل کر دیا۔ اب اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجبوری میں ہاندھا گیا ایک بندھن اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا ہے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اپنی تعلیم کے مکمل ہونے سے وہ خوف زدہ تھا۔ اسے لگتا وطن واپس جاتے ہی نکاح کا آکٹوپس اسے جکڑ لے گا۔

وہ اس نکاح کو اتنا اپنے اوپر حاوی نہ کرتا جتنا اس کی ممانے بار بار ذکر کر کے کیا تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار ضرور اسے سمجھایا کرتیں کہ تم نے کبھی زندگی میں اس لڑکی سے شادی نہیں کرنی، جس سے تمہارا نکاح ہوا ہے۔ کیونکہ وہ ایک بد چلن ماں کی بیٹی ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ بیٹی ہمیشہ اپنی ماں کی خصلت لے کر دنیا میں آتی ہے۔ اس لیے یاد رکھنا، تمہاری بیوی کبھی بھی تمہاری وفادار نہ ہوگی۔ یہ سب باتیں اس کے نزدیک غیر اہم ہو سکتی تھیں۔ اگر اسے اریشہ سے محبت نہ ہوتی۔ وہ لڑکی کون تھی؟ اس کی ماں کا ایسا کون سا فعل تھا جو اس کی ممانے آج تک نہ بھولی تھیں۔ اسے ان سب باتوں سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔

اس کا اصل مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے اریشہ کے علاوہ کسی اور سے شادی ہی نہیں کرنا تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے پاپا سے اس مسئلہ پر کس طرح بات کرے۔ کیسے انہیں سمجھائے کہ مجھے آپ کی بھتیجی سے شادی نہیں کرنی۔ لہذا پلیز میری خوشی کی خاطر آپ اس رشتہ کو ختم کر دیں۔ اس کا کئی بار دل چاہا کہ وہ پاپا کو فون کرے اور ان سے رو، رو کر درخواست کرے کہ پلیز مجھے اس طوق سے نجات دلا دیں جو آپ نے میری لاعلمی میں میرے گلے ڈالا تھا۔ مگر وہ کبھی ایسا کرنے کی ہمت ہی نہ کر سکا۔ اسے کاش میں اس دن ان پیپر ز پر سائن ہی نہیں کرتا۔

کئی بار کا سوچا ہوا یہ خیال پھر سے اس کے ذہن میں آ کر اسے بے چین کر گیا۔ اسی پل جب وہ انتہائی کرب کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اس کے آس پاس ایک مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ اس کے کانوں میں کچھ عرصہ قبل کے کہے ہوئے اپنی ماں کے الفاظ گونجے۔

”دیکھو ایسا ل انسان کو زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ لہذا یہ اس کا حق ہے کہ وہ اسے اچھی طرح سوچ سمجھ کر گزارے، اپنی زندگی دوسروں کی خوشی کے لیے برباد کرنا بالکل بھی عقل مندی نہیں ہے۔ اگر تم اپنے پاپا کے جوڑے گئے رشتے سے مطمئن نہیں ہو تو انہیں صاف صاف لفظوں میں یہ بات سمجھا دو، یقیناً جانو آج تمہارا انکار ان کے دل کو دکھی ضرور کرے گا۔ مگر کل اس کا نتیجہ کئی زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچالے گا۔ سب سے پہلے تو تم خود ایک ناپسندیدہ زندگی گزارنے کے عمل سے بچ

اک ساگر ہے زندگی

جاؤ گے۔ اس لیے میری مانو تو اپنے پاپا سے بات کر کے جتنی جلدی ممکن ہو سکے اس لڑکی کو طلاق دے دو۔ اس کے پاؤں میں پڑی اپنے نام کی زنجیر سے اسے بھی آزاد کر دو۔ اس سے نہ صرف تمہارا بلکہ اس کا بھی بھلا ہوگا۔ آج اس کی عمر ہے جو کوئی اچھا لڑکا اس کے نصیب میں ہوگا اسے مل جائے گا اور تم بھی اپنی زندگی من پسند ساتھی کے ساتھ گزار سکو گے اور اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔“

اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب وہ اپنے پاپا کے ساتھ اس ٹوٹے ہوئے اندھیرے گھر میں گیا تھا جہاں وہ بیمار آنٹی اپنی سبز دوپٹے والی بیٹی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اسے آج بھی یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی کہ اس جس زدہ گھر میں وہ دونوں سانس بھی کس طرح لیا کرتی تھیں۔ اس گھر کی سیلن زدہ بو وہ اتنے سالوں میں بھی نہ بھولا تھا اس کے لیے اس گھر میں ایک ایک پل گزارنا نہایت مشکل امر تھا، جبکہ اس کے پاپا نہایت اطمینان اور سکون سے ان آنٹی کے قریب بیٹھے تھے جن کی شکل دیکھتے ہوئے بھی ایصال کو خوف محسوس ہو رہا تھا۔

اسے آج احساس ہوتا کہ اس کے پاپا کا اس وقت کا کیا ہوا فیصلہ جذباتی نہ تھا۔ بلکہ نہایت سوچ سمجھ کر کیا جانے والا ایک ایسا عمل تھا جس کی مکمل تیاری وہ پہلے سے کر کے اس گھر میں گئے تھے۔ اپنے پاپا کی اس وقت کی کیفیت وہ کبھی نہ بھول پاتا اور جب جب وہ یہ سب سوچتا اسے لگتا اپنی ماں کی سمجھائی ہوئی باتوں پر عمل کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا وہ سمجھ رہی تھیں۔ یہ تو سو فیصد طے تھا کہ وہ اپنی زندگی اس لڑکی کے ساتھ نہیں گزار سکتا تھا شاید گزارنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ بات اپنے پاپا کو کس طرح سمجھائے یہ فی الحال ایک قدرے مشکل امر تھا۔

”بہر حال جو بھی ہو پاپا مانیں یا نہ مانیں، مجھے اس لڑکی سے کبھی شادی نہیں کرنی۔ جسے نہ میں جانتا ہوں اور نہ ہی کبھی دیکھا ہے۔ میری زندگی میں اگر کوئی لڑکی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوگی تو وہ صرف اربیشہ ہو سکتی ہے اور کوئی نہیں۔“

اور یہ اس کا کیا جانے والا آج کا آخری فیصلہ تھا جسے کرنے کے بعد اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا۔



”تم جانتی ہو آج میں نے سالار کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں کسے گھومتے دیکھا ہے۔“

صباحت کے فون اٹھاتے ہی وہ بنا کسی سلام و دعا کے شروع ہو گئیں۔ ان کے لہجے میں دبا جوش و خروش کسی بہت ہی اہم خبر کی اطلاع دے رہا تھا اور ویسے بھی صباحت کو وہی رہتے ہوئے پاکستان کے تمام حالات سے آگاہی صرف اور صرف فضلہ بھابی کے دیئے گئے خبرنامہ کی بدولت ہی ہوتی تھی جس کا اعتراف وہ اکثر بڑی صاف گوئی سے ان کے سامنے کیا کرتی۔

”کسے دیکھ لیا آپ نے سالار کے ساتھ، اب بھلا بتائیں اتنی دور بیٹھ کر مجھے کیسے پتا چلے گا کہ وہ پاکستان کے کسی شاپنگ مال میں کس کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ جب تک آپ نہ بتائیں گی۔“ یہ جان کے کہ فضلہ بھابی کے پاس سالار کے حوالے سے کوئی اہم خبر ہے، وہ سر تاپا گوش ہوتے ہوئے بولی۔

”ننپ کے ساتھ تھا، وہ دونوں اتنے مزے سے گھوم رہے تھے کہ مانو مجھے تو یقین ہی نہ آیا۔“

بنا کوئی تجسس پھیلائے وہ کھٹ سے بولیں۔ اس بات میں کتنی مبالغہ آمیزی کا عنصر شامل تھا۔ یہ وہ خوب اچھی طرح جانتی تھیں اور ان کے اس جواب نے صباحت کے کسی نئی خبر کو جاننے کے جوش و خروش کو مکمل طور پر تھس نہیں کر دیا۔

”یقین جانو مجھے تو دیکھ کر یقین ہی نہ آیا کہ وہ ننب ہے، اتنی تیار کہ بس، میرا دل تو بہت چاہا کہ جا کر پوچھوں بی بی یہ تم یہاں کیا گل چہرے اڑا رہی ہو، کیونکہ تمہیں تو میرا پتا ہے کہ ہر بات منہ پر کہہ دینے کی عادی ہوں۔ دل میں بات رکھنے کی

عادت نہیں ہے میری۔“

ہر بات بنا سوچے سمجھے لوگوں کے منہ پر کہہ کر ان کے دل خراب کرنے والی ان کی یہ عادت فضہ بھابی کے نزدیک ایک ایسی خوبی تھی، جس کا ذکر وہ ہمیشہ بڑے فخر سے کیا کرتیں۔ صباحت کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ انہیں ان تمام باتوں کا کیا جواب دے۔

”لو تم تو اس خبر کو سن کر اتنی حیران ہوئی ہو کہ تمہاری تو لگتا ہے زبان ہی بند ہو گئی۔“

صباحت کی خاموشی سے انہوں نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔

”اصل میں بھابی شاید میں آپ کو بتانا بھول گئی کہ نازیہ پچھلے دنوں سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ جس کے باعث اس کا ابارش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ شادی کے تین سال بعد انہیں اولاد سے نوازنے لگا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ مگر چلیں جو اللہ کو منظور جب اس کی مرضی ہوگی ضرور دے گا۔“

بہر حال، آپ کو تو شاید یہ بھی علم نہیں کہ نازیہ کی والدہ خاصی عمر رسیدہ ہیں، جبکہ اس کی بھابی اور بہن بھی یہاں پاکستان میں نہیں، سالار کی اپنی والدہ کا انتقال بھی کئی سال قبل ہی ہو گیا تھا۔ ایسے میں جب اس نے انتہائی پریشانی کے عالم میں مجھے فون کیا تو میں نے ہی اسے نرنب کا مشورہ دیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پریشانی کے ان لمحات میں نازیہ کے لیے اس سے بہتر ساتھی کوئی اور نہ ہوگا اور اپنے اس فیصلے کے درست ثابت ہونے کی حقیقی خوشی مجھے اصل میں کل اس وقت ہوئی جب نازیہ نے فون کر کے میرا شکریہ ادا کیا۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس نے بتایا کہ بیماری کی حالت میں نرنب نے اس کی اس قدر خدمت کی کہ کیا ہی کوئی سگی بہن کرے گی اور میرے ہی کہنے کے مطابق سالار نے اسے کچھ تحفے تحائف بھی دیے ہیں۔ کیونکہ میرے نزدیک اس کی تمام خدمات کا بدلہ اس سے بہترین اور کوئی نہ تھا اور شاید اس سلسلے میں سالار سے ایک، دو بار بازار بھی لے گیا تھا۔ وہیں آپ نے اسے دیکھ لیا ہوگا۔ ویسے بھی بھابی اس نے نازیہ کی خدمت بڑے ہی خلوص اور محبت سے کی ہے اور اس طرح کے خلوص کا بدلہ کبھی ادا نہیں کیا جاسکتا۔ سوائے اس کے کہ بدلے میں ہم بھی پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ کوئی اچھا سا تحفہ دے دیں۔“

صباحت نے مکمل وضاحت کے ساتھ انہیں ہر بات سمجھانے کی کوشش کی، کیونکہ وہ فضہ بھابی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ جانتی تھی کہ اگر انہیں یہاں ہی نہ روکا گیا تو خبر مروج مسالے کے ساتھ خاندان بھر میں نشر ہو جانی ہے۔

”تو ضروری تھا کہ تحفہ لے کر دینے کے لیے اسے تنہا بازار لے جایا جائے۔“

وہ قطعی ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔

”ویسے بھی خوب صورت عورت ایک ساپ کی مانند ہوتی ہے، جہاں موقع ملا ڈنسنے سے گریز نہیں کرتی۔ یہ بات تم

اچھی طرح نازیہ کو بھی سمجھا دینا۔“

ان کا یہ بیان کردہ فلسفہ صباحت کی سمجھ میں بالکل بھی نہ آیا۔

”چلیں بھابی چھوڑیں، ہمیں کیا جب ان دونوں کے اس طرح بازار جانے پر فرہاد یا نازیہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے، تو پھر ہم کون ہوتے ہیں بلا وجہ کی انگلیاں اٹھانے والے، دفع کریں اتنی فضول باتیں سوچ سوچ کر آپ کیوں اپنا بلڈ پریشر ہائی کرتی ہیں۔“

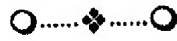
صباحت کے جواب نے ہر بات کو یکسر ختم کر دیا۔ فضہ بھابی تو ان دونوں کو ایک ساتھ شاپنگ سنٹر میں دیکھ کر جانے کون

اک ساگر ہے زندگی

کون سی کہانیاں سوچے بیٹھی تھیں جو انہوں نے صباحت کو سنائی تھیں۔ مگر یہاں تو صباحت نے سرے سے کسی بات میں دلچسپی نہ لی۔ فی الحال تو اس مسئلے پر خاموشی اختیار کرنا ہی انہیں زیادہ بہتر لگا۔ مگر ان کا دل کسی بھی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ کوئی عام سا منظر تھا۔ اس عام سے منظر کے پیچھے کوئی خاص بات ضرور تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ سالار اور زینب کی یہ غیر معمولی دوستی جلد ہی کوئی رنگ دکھائے گی۔ جس کا احساس ان دونوں سے منسلک لوگوں کو آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔

”چلو جب چاند چڑھے گا کل عالم دیکھے گا۔“

صباحت کی پیش کردہ تمام وضاحت کا جواب انہیں اس سے بہتر کوئی اور نہ ملا۔ انہیں امید تھی کہ جس بات پر آج صباحت ان سے اختلاف کر رہی ہے آنے والے کل میں وہ خود انہیں ایسی ہی کوئی خبر ضرور دے گی، جانے کیوں وہ زینب سے منسوب کوئی نہ کوئی غلط بات سننے کے لیے ہمیشہ تیار رہتیں۔ حالانکہ انہیں اپنی اس کوشش میں فی الحال کوئی کامیابی نہ ہوئی تھی۔



زندگی پیار کا گیت ہے، اسے ہر دل کو گانا پڑے گا
 زندگی غم کا ساگر بھی ہے جس کے اس پار جانا پڑے گا
 زندگی ایک احساس ہے ٹوٹے دل کی کوئی آس ہے
 زندگی ایک بن ہاس ہے کاٹ کر سب کہ جانا پڑے گا
 زندگی بے وفا ہے تو کیا اپنے روٹھے ہیں ہم سے تو کیا
 ہاتھ میں ہاتھ نہ ہو تو کیا ساتھ پھر بھی بھٹانا پڑے گا
 زندگی پیار کا گیت ہے اسے ہر دل کو گانا پڑے گا
 زندگی ایک مسکان ہے درد کی کوئی پہچان ہے
 زندگی ایک مہمان ہے چھوڑ سنسار جانا پڑے گا

گانے کا ایک ایک بول اس کے دل میں اتر رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش چت لیٹی اوپر چھت کو یک ٹک گھورے جا رہی تھی۔

”زندگی کیا ہے۔“ اس کی بہتر عکاسی اس گانے سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی یا شاید یہ گانا اس کی زندگی کا مکمل عکاس تھا۔ اسی لیے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جو بھی تھا گانے کا ایک ایک بول اس کی ہر رگ میں درد بھر رہا تھا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کی آنکھوں کے کونے پانی سے بھر گئے۔ پھر اس بے پانی نے پورا نکیہ بھگودیا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز رونے لگی۔ اپنے دل کا بوجھل پن اس طرح رو کر دور کرنا کبھی کبھی اسے بہت اچھا لگتا، جانتی تھی کہ کھل کر رونے کے بعد اس کے اگلے چند دن سکون سے گزر جائیں گے۔ وہ اپنی زندگی کے ایسے دوراں پر کھڑی تھی جہاں سے آگے جانے والے سارے راستے بند تھے۔ اس کی ساری طنائیں وقت کے ہاتھ میں تھیں۔ وقت جس طرف چاہتا اسے لے جاتا۔ ایسے میں جب اسے اپنے چاروں طرف پھیلے اندھیرے میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تو وہ اس طرح یاسیت کی کیفیت کا شکار ہو جاتی اور پھر رو، رو کر اپنے دل کا بوجھ اسی طرح ہلکا کرتی جیسے اس وقت کر رہی تھی۔



اک ساگر ہے زندگی

73

وہ بچن میں کام کر رہی تھی۔ جب باہر سے آتی سالار کی آواز سن کر اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں اگلے ہی پل وہ آن کھڑا ہوا تھا۔

”کیا پکایا ہے؟“ اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”آلو قیہ۔“ سالن میں چچہ چلاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”آپ کو کھانا دوں۔“ سالار کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے پیچھے مڑ کر خود ہی پوچھ لیا۔

”ہاں.....“ وہ ایک عجیب بے خودی کی کیفیت میں گرفتار اسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ وہ سالن والا چولہا بند کر کے سسک کی جانب آگئی۔ تاکہ قتل سے اپنے ہاتھ دھو سکے۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا بالکل اس کے پیچھے آن کھڑا ہوا اتنا پیچھے کہ اگر وہ مڑتی تو سر اس کے سینے سے ٹکراتا۔

”آج جب آفس میں کام کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ تم میرے گھر ہو تو دل چاہا پر لگا کر اڑتا ہوا آ جاؤں اور تمہیں اپنے سامنے بٹھا کر اس وقت تک دیکھتا رہوں جب تک جی نہ بھرے، جانتی ہو اب تو مجھے اس وقت تک سکون نہیں ملتا جب تک دن میں ایک بار تمہارا دیدار نہ کر لوں۔“

اس نے آہستہ سے بڑے پیار کے ساتھ اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ نینب نے ایک گہری سانس کے ساتھ سالار کے جسم سے آتی کلون کی مخصوص خوشبو کو اپنے اندر اتارا، وہ آنکھیں بند کیے بے خود کھڑی اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ کو اپنے دل میں اتارنا چاہتی تھی کہ ایسے میں باہر سے آتی نازیہ کی آواز سننے ہی جیسے وہ ہوش میں آگئی، کرنٹ کھا کر پلٹی، تیزی سے آگے بڑھ کر دروازے پر لٹکا اپنا دوپٹا اتار کر کندھے پر ڈالا اور سلیپ پر رکھے برتنوں کی جانب آگئی۔ سالار بھی فوراً دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا، جب نازیہ بچن کے دروازے پر نمودار ہوئی۔

”یہ بشری پونچھا مارنے میں اس طرح ڈنڈی مارتی ہے۔ آدھا فرش سوکھا پڑا ہے۔“ اس نے اپنے زور، زور سے بولنے کی وضاحت کی۔

نینب نے بنا کوئی جواب دیئے پاس رکھے ڈونگے میں سالن نکالنا شروع کر دیا۔

”آپ کب آئے؟“ نازیہ نے سالار کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی ابھی آیا ہوں، سوچا تم سو رہی ہوگی۔ اسی لیے سیدھا بچن کی طرف آ گیا۔ تاکہ نینب سے کہہ کر کھانا لگوا لوں۔“

نینب کو اس کا لہجہ عجیب شرمندہ سا لگا۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”اب تو اللہ کا شکر ہے کافی بہتر ہوں۔ آپ چل کر ٹیبل پر بیٹھیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔“

سالن ڈونگے میں نکالتی نینب نے اپنا ہاتھ وہیں روک دیا۔

”بشری ہاتھ دھو کر اندر آؤ، صاحب جی کے لیے روٹی بنانی ہے۔“

بشری کو آواز دیتی وہ فریج کی جانب بڑھ گئی۔

”میں نے روٹیاں پکا دی ہیں۔ تم جاؤ اپنا کام مکمل کرو۔“

بشری کے بچن میں آتے ہی نینب نے اسے واپس کر دیا۔

”تم نے روٹیاں یہ پکائیں۔ بشری کو کہیں وہ بنا دیتی۔“

نازیہ فریح سے وہی نکال کر سلیب کی طرف آگئی۔

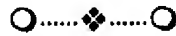
”لاؤ مجھے وہی دو، میں رائیہ بنا دیتی ہوں، تم باہر چل کر بیٹھو، ابھی تمہیں ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔“
 زینب نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا باؤل تھام لیا اور ایک نظر بچن سے ذرا دور رکھی ڈاکٹنگ ٹیبل پر بیٹھے سالار پر ڈالی جو جانے کن سوچوں میں گم تھا کچھ دیر قبل اس کے دل میں پیدا ہونے والی شرمندگی اب کافی حد تک کم ہو چکی تھی۔
 ”میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتی، زینب تم نے اس موقع پر جس طرح میرا ساتھ دیا ہے کوئی سگی بہن بھی ہوتی تو شاید کبھی نہ دیتی، تمہاری وجہ سے ہی میں اپنے دکھ اور درد کو برداشت کرنے کے قابل ہوئی ہوں۔“
 وہ اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔ اظہار تشکر سے اس کا لہجہ قدرے بوجھل ہو گیا تھا۔ زینب کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے تپتے صحرا میں پھینک دیا ہو، وہ ایک بار پھر شرمندگی میں ڈوب گئی۔
 ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، بلکہ انسانیت کے ناتے جو میرا فرض تھا اسے پورا کرنے کی ایک ہلکی سی کوشش ضرور کی ہے۔“

وہی پھینٹ کر اس نے جلدی جلدی رائیہ تیار کیا۔

”تم اندر چل کر لیٹو میں تمہارا دلیہ لے کر آتی ہوں۔“

وہ چاہتی تھی کہ نازیہ جلد از جلد وہاں سے ہٹ جائے۔ نازیہ کی موجودگی اسے بلا وجہ کی شرمندگی سے دوچار کر رہی تھی۔
 ”نہیں میں لیٹ کر تھک چکی ہوں۔ اس لیے ابھی باہر سالار کے ساتھ بیٹھتی ہوں، تم بشری کے ساتھ مل کر وہیں کھانا لگا دو، ہم سب آج ایک ساتھ مل کر کھانا کھائیں گے۔“
 اپنی ازلی سادگی سے جواب دیتی وہ مچن سے باہر نکل گئی، مگر زینب کو ایسا لگا جیسے وہ سالار اور اس کے دل میں چھپے چور کو بھانپ چکی ہے۔ شاید اب اس کے اور سالار کے درمیان کھیلا جانے والا گیم جلد ختم ہونے والا ہے
 ”چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

سالار نے چند دنوں میں ہی اسے خاصا بہادر بنا دیا تھا اور اب اس نے ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے گھبرانا چھوڑ دیا تھا۔
 بتایا جانے کہ آنے والا وقت اسے کن مشکلات سے دوچار کرنے والا ہے۔ فی الحال وہ اپنے حال میں مست تھی۔



وہ کٹہرے میں کھڑی تھی۔ اس کے سامنے پوری ایک عدالت بچی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کے چہرے پر چھایا اطمینان انتہائی قابل دید تھا۔ عدالت کیا فیصلہ سنانے والی ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہ تھی اور نہ ہی کسی قسم کا خوف اس پر سوار تھا۔
 وہ بالکل مطمئن تھی، کیونکہ اپنا فیصلہ وہ خود کر چکی تھی۔ اب اسے کسی کے فیصلے کا کوئی انتظار نہ تھا۔
 ”اس جیسی فاحشہ کو تو سر عام پھانسی دے دینی چاہیے، تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔ استغفر اللہ اتنا دھوکا اس قدر بے حیائی۔“

اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بنا بھی پہچان سکتی تھی کہ کس کی ہے۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ایک نظر اپنے سامنے موجود ڈاکٹر پر رکھی اونچی سی کرسی پر ڈالی، جس پر بیٹھا شخص یقیناً اس عدالت کا جج تھا جو اپنے دونوں ہاتھوں کی کہانیاں ٹیبل پر لٹکائے وکیل صفائی کا بیان سننے میں بری طرح محو تھا۔ سامنے موجود کالے کوٹ والا شخص ضرور سرکاری وکیل تھا۔

اک ساگر ہے زندگی

اتنے دنوں میں اس پر جانے کتنے الزامات عائد کیے جا چکے تھے۔ اس کے کردار کی دھجیاں اس بری طرح اڑا لی گئیں کہ وہ ہکا بکار ہو گئی۔ وہ خود پر لگائے گئے کسی بھی الزام کا جواب دینے کے لیے بالکل بھی راضی نہ تھی۔ اسے اگر کوئی جواب دینا تھا تو اس عدالت میں جو رد و محشر لگائی جانے والی تھی اور جہاں موجود منصف کا ہر فیصلہ اسے منظور تھا۔ اس نے اپنی سزا اور جزا کا فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

سرکاری وکیل نے دوبارہ اس کی طرف اشارہ کیا۔ پھر اس کا نام پکارتے ہوئے کچھ کہا۔ مگر اس کی کوئی بھی آواز اس کے کانوں تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اپنے دائیں ہاتھ پر کھڑی پولیس والی پر ایک نظر ڈالی جو چہرے پر انتہائی سخت تاثرات لیے بالکل سیدھا سامنے دیکھ رہی تھی۔ اب اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی عدالت میں موجود حاضرین پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی، بالکل سامنے والی پہلی ردو میں بیٹھے ہوئے ہر فرد کو وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی یہ تمام وہ لوگ تھے جنہیں کبھی اس کے رشتہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مگر آج ان کے اجنبی چہروں پر اس کے لیے سوائے نفرت کے کچھ نہ تھا۔ ان سب کی آنکھوں میں اپنے لیے حقارت ہی حقارت نظر آئی۔ سوائے ایک شخص کے جس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے جھکے کندھے اپنی شکست کا اعتراف کر رہے تھے۔

ساری زندگی وہ اس ایک شخص کی، ایک نظر کرم کی پیاسی رہی، مگر شاید وہ عورت کے نازک جذبات و احساسات کو سمجھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ روپیہ سینٹ کے رکھنا اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بہترین فعل تھا۔ جب تک وہ اس کی دسترس میں تھی بالکل خالی دامن اور تہی دست رہی اور اب جب وہ یہ سب کچھ بہت پیچھے چھوڑ کر اندھا دھند آگے کی جانب نکل آئی تو یہ شخص اس کی محبت کا مطلب گارہن کر راہ میں آ گیا۔

واہ ری تقدیر تو نے سب کچھ تب دیا جب میری ضرورت ہی ختم ہو گئی۔

اس نے اپنے ہاتھ کی لکیروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا، اس سوچ کے آتے ہی وہ بے اختیار ہنس دی۔ یہ سوچے بنا کہ وہ کہاں اور کس حال میں کھڑی ہے۔ وہ جو ہنسا شروع ہوئی تو ہنستی ہی چلی گئی۔

”شاید بے درپے صدموں نے میری مٹکھ سے ان کا دماغی توازن چھین لیا ہے۔“

جانے یہ کون بے وقوف تھا، جو اس قسم کے گھٹیا تجربے پیش کر کے خود کو عقل مند ثابت کر رہا تھا، وہ ہنستے ہنستے رک گئی۔

”میرا خیال ہے وکیل صاحب آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ورنہ الحمد للہ میں دماغی طرد پر بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس کی پُر اعتماد آواز عدالت میں گونجتے ہی ہر طرف ایک سناٹا سا چھا گیا۔



وہ ایشہ کے ساتھ کے این ٹاور آیا تھا اسے ہمیشہ یہاں کی بلندیوں میں بیٹھ کر لچ کرنا اچھا لگتا، دن کے وقت اس ریو لوئیک ریسٹورنٹ کی شیشے کی دیوار کے عین قریب بیٹھ کر پورے لندن کا نظارہ اتنا حسین لگتا کہ ایٹال کا جی چاہتا ہمیشہ یوں ہی یہاں بیٹھا رہے اور زندگی گزرتی جائے، وہ واپس جانے سے قبل اچھی طرح پورا لندن گھومنا چاہتا تھا ان دونوں کے ساتھ سریش اور یوینا بھی تھے۔ پُر تکلف ماحول میں ایک اچھا سا لچ کر کے جیسے ہی وہ باہر نکلے ایشہ ایک جیولری شاپ کے سامنے رک گئی، ایٹال جانتا تھا اچھی جیولری ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہی ہے وہ بھی اس کے قریب ہی جا کر کھڑا ہوا جبکہ یوینا اور سریش آہستہ آہستہ چلتے آگے کی جانب بڑھ گئے۔

”اف ایٹال یہ رنگ کس قدر حسین ہے۔“

اپنے قریب ایٹال کی موجودگی محسوس کرتے ہی اریشہ نے اسے مخاطب کیا۔ ایٹال نے دیکھا سامنے نظر آنے والے شخصے کے ہاگس میں موجود سفید رنگ والی انگوٹھی نے اریشہ کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کروا رکھی تھی۔
”تمہیں پسند ہے۔؟“

ایٹال نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
”آف کورس اسی لیے تو تمہیں دکھا رہی ہوں۔“
جواباً وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے قیمت پوچھ لو کتنے کی ہے؟“ ایٹال کی بات سنتے ہی وہ شخصے کا ڈورڈھکیلیٹی شاپ کے اندر داخل ہو گئی ایٹال نے اس کے پیچھے جانے کے لیے جیسے ہی اپنا قدم اٹھایا اس کا سیل بج اٹھا، پاکستان کا نمبر دیکھتے ہی اس نے فوراً کال ریسید کی۔

”السلام علیکم!“

لیس کا بٹن دبا کر سیل اپنے کانوں سے لگا کر وہ وہیں دروازے کے باہر رک گیا۔
”وعلیکم السلام بیٹا کیسے ہیں آپ؟“

دوسری طرف سے ملک صاحب تھے، غیر متوقع طور پر اپنے بابا کی آواز سنتے ہی وہ خوش ہو گیا عام طور پر پاپا سے اس کی بات کم ہی ہوا کرتی تھی جبکہ مہما سے تو وہ تقریباً روز ہی بات کیا کرتا تھا اگر کسی دن کبھی کسی وجہ سے ان سے بات نہ ہو پاتی تو اسے ساری رات نیند ہی نہیں آتی تھی۔

”بالکل ٹھیک اور فٹ آپ سنا کس طبیعت کیسی ہے؟“
وہ بولا تو خوشی اس کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں یہ بتاؤ واپس کب آرہے ہو، میرا خیال ہے تمہارا لاسٹ سمسٹر ختم ہوئے بھی کافی دن ہو گئے۔ آ جاؤ یا رہم سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں۔“
جواباً وہ ہلکا سا ہنستے ہوئے بولے۔

”آپ کو مہمانے نہیں بتایا۔“ وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔

”میں نے انہیں بتایا تھا کہ ہم لندن گھومنے کے بعد واپس آئیں گے آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مجھے لندن ہمیشہ سے بہت پسند رہا ہے میرے خوابوں کا شہر ہے لندن۔“

”چلو اب واپس آ جاؤ دو بارہ پھر چلے جانا لندن کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہے۔“ پاپا کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔
”پتا نہیں کیوں پاپا مجھے لگتا ہے کہ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد انسان شاید زندگی کو اتنا انجوائے نہیں کر سکتا جتنا اس وقت ہم کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”اچھا تو پھر ایسا کرتے ہیں تمہارے واپس آتے ہی تمہاری شادی کر دیتے ہیں اور تم اپنا اپنی مومن لندن جا کر منانا پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ شادی کے بعد کا سفر زیادہ انجوائے فل ہوتا ہے اور یقیناً تمہیں اس سے زیادہ اچھا لگے گا جتنا اس وقت تم محسوس کر رہے ہو۔“

ان کی سرسری انداز کی جانے والی گفتگو اس کے آس پاس ایک خطرے کی گھنٹی سی بجائی اس نے نظریں اٹھا کر شاپ

کے اندر جھانکا سامنے کاؤنٹر کے قریب کھڑی اریشہ منتظر لگا ہوں سے اس کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔
”کہیں ایسا نہ ہو میرے واپس جانے سے قبل ہی یہ میری ڈیٹ فکس کر دیں اور میرے پہنچنے پہنچنے کا رڈ بھی تقسیم ہو چکے ہوں۔“

آج کی گفتگو نے ایک دم ہی اسے کئی طرح کی منفی سوچوں میں پھنسا دیا۔
”فی الحال پاپا مجھے ابھی شادی نہیں کرنی اور میں آپ کو کچھ دیر بعد کال بیک کرتا ہوں اللہ حافظ۔“
ان کا جواب سنے بغیر ہی اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کر کے فون بند کر دیا اسے اندازہ تھا کہ اندر موجود اریشہ کا موڈ اس وقت کافی خراب ہو چکا ہوگا یہ ہی سوچ کر اس نے تیزی سے شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر قدم رکھا ہی تھا کہ باہر آنے والی کسی شخصیت سے بری طرح ٹکرا گیا۔
”اوہ سوری آئی ڈٹ ناٹ سی یو۔“

آواز کسی لڑکی کی تھی ایصال نے ناک رگڑتے ہوئے اپنا سر اٹھایا گرین ٹی شرٹ پر گرین ہی پرنٹڈ اسکارف گلے میں ڈالے ایک گوری جیٹی لمبی سی لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔
”اٹس اوکے.....“ اس نے بمشکل جواب دیا، پاپا کی بات ختم ہوتے ہی سبز لباس والی ایک لڑکی سے ٹکراؤ اسے وہم میں مبتلا کر گیا ایسا لگا جیسے یہ رنگ اس کے اور اریشہ کے درمیان حائل ہو گیا ہو حالانکہ وہ تو ہم پرست نہ تھا پھر بھی جانے کیوں اس عجیب و غریب سوچ نے اس کے دماغ کو بالکل مآؤف سا کر دیا اور وہ بنا کچھ کہے اریشہ کا بازو تھامے دکان سے باہر نکل آیا۔



وہ جیسے ہی آفس میں داخل ہوا نگاہ ہال میں رکھی کرسی پر بیٹھی جیب پر پڑی جس کے بالکل سامنے ہنگ سیکشن کا عمر لغاری اپنی ٹانگیں لمبی کیے بیٹھا جانے ایسی کیا باتیں کر رہا تھا کہ جیب کی ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی، شاہ زین کا اچھا بھلا موڈ فوراً ہی آف ہو گیا وہ تیزی سے ان کے پاس سے گزرتا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔
”جی سر.....“ فوراً سے پیشتر ہی علی احمد حاضر ہو گیا وہ باہر ہی اپنے صاحب کے موڈ کا اندازہ لگا چکا تھا۔
”مس جیب کو بلائیں۔“ کرسی کھینچ کر بیٹھنے سے قبل ہی اس نے حکم صادر فرما دیا دوسرے ہی پل جیب اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”آپ نے مجھے بلایا۔“

عام طور پر اسے کبھی بھی شاہ زین نے اس طرح نہیں بلایا تھا اسی لیے اس کی حیرانی بجا تھی جبکہ دوسری جانب شاہ زین خود بھی اپنی اس غیر اختیاری حرکت کو محسوس کرتے ہوئے کچھ نروس سا ہو گیا تھا اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ جیب کو کیا جواب دے اس لیے خاموشی سے دراز کھولے اس میں مصروف ہو گیا جب جیب نے ایک بار اپنا سوال پھر سے دہرایا۔

”آپ نے مجھے بلایا تھا سر۔“

”لغاری صاحب کی فائل آپ کے پاس ہے؟“ بروقت اس سے بہتر سوال اس کی سمجھ میں اور کوئی نہ آیا۔

”جی میرے پاس ہی ہے آپ کو چاہیے۔“

”پلیز اگر زحمت نہ ہو تو ابھی علی احمد کے ہاتھ بھیج دیں۔“

”اوکے سر۔“ وہ جیسے ہی واپس پلٹی، شاہ زین کی آواز نے اس کے آگے بڑھتے قدم روک دیئے۔

”ایک منٹ جیبہ۔“

”جی سر.....“ اس نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”یہ عمر لغاری کو آپ کیسے جانتی ہیں؟“

”مطلب؟“ شاہ زین کے سوال نے اسے تھوڑا سا حیران کر دیا۔

”وہ یہاں ہمارے ہی آفس کا بندہ ہے سر یعنی میرا کو لیگ تو پھر میں کیسے اسے نہیں جانوں گی۔“ اس کا جواب خاصا معقول تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر چونکہ اس کا ڈیپارٹمنٹ بالکل علیحدہ ہے اس لیے پوچھ لیا اگر میرا سوال آپ کو برا لگا ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔“

”برائو لگا، کیونکہ کسی سے جان پہچان میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق میری جاب سے نہیں ہے مگر پھر بھی بتا دیتی ہوں ہم دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں ہوتے ہیں۔ میں جاؤں اب۔“ بات ختم کر کے اس نے سوالیہ انداز میں شاہ زین کی جانب دیکھا۔

”جی.....“ اس نے آہستہ سے جواب دے کر سامنے رکھی فائل قریب کر لی۔

”میں آپ کی مطلوبہ فائل بھیجتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں، تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے شاہ زین کچھ غل سا ہو گیا۔ اپنی جلد بازی میں کی جانے والی اس حرکت پر وہ خاصا شرمسار تھا۔



”کتنے ہی دن ہو گئے زینب سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنے قریب بیٹھے سالار کو مخاطب کیا جو ٹیبل لیپ کی روشنی میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔

”خیریت..... یہ تمہیں اتنی رات گئے زینب کیسے یاد آگئی؟“

سائینڈ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے اس نے نازیہ پر اک حیرت بھری نظر ڈالی۔

”یاد تو خیر وہ ہمیشہ ہی رہتی ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”عام طور پر میری اس سے فون پر بات ہو جاتی ہے مگر اب ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا مجھے اس سے بات کیے ہوئے،

شاید اس کا فون خراب ہے، آج صبح بھی کیا تھا مگر کوئی رسپانس ہی نہیں ملا۔“

”اچھا چلو تم بھی کیا یاد کرو گی، کل شام میں تیار رہنا، اس کے گھر جا کر مل آتے ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ خوشی سے جواب دیتے ہوئے وہ کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھی۔

”سالار.....“ اسے پھر شاید کچھ یاد آ گیا۔

”ایک بات پوچھوں.....“ وہ ہنسوج لگا ہیں سالار کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”پوچھو یا رکھا پوچھنا ہے تمہیں، کوئی بات پوچھنے کے لیے میری اجازت کی ضرورت کب سے پڑ گئی۔“ وہ اپنی کتاب بند کر کے پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اک ساگر ہے زندگی

”آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ ہمارے بھی بچے ہوں جو ہم سے فرمائش کریں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد کریں اور.....“ اس کی آواز بھیگ گئی اور اس سے آگے وہ بول ہی نہ پائی۔

”دیکھو نازیہ یہ ایک فطری خواہش ہے۔ جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی نہیں، کیونکہ مجھ سے زیادہ یہ خواہش تمہارے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا۔“

انتخاب کہہ کہ وہ رکا اور نازیہ کی جانب تصدیق طلب نظروں سے دیکھا۔

”ہاں.....“ اس نے فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اعتراف کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ جسے سالار نے دیکھا ضرور مگر نظر انداز کر دیا۔

”دیکھو نازیہ یہ ان خواہشوں میں سے ایک ہے جسے پورا کرنا کسی بھی انسان کے بس کی بات نہیں اور جو خواہش ہم خود پوری کرنے میں ایک فیصد بھی قادر نہ ہوں اس کے لیے بھلا اپنے دل کو برا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جس طرح زندگی اور موت پر ہمارا اختیار نہیں، بالکل اسی طرح اولاد بھی ہمارے اپنے اختیار کی چیز نہیں، اگر تمہارے نصیب میں ہوا تو یقیناً وہ تمہاری اس خواہش کو ضرور پورا کرے گا اور اگر نہ کرے تو جان لینا اس میں بھی اس پروردگار کی کوئی مصلحت ہے۔ یہ ہی سوچ کر ہمیشہ اس کا شکر ادا کرتی رہو، یاد رکھو وہ شکر کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔“

نازیہ کے آنسو سالار کے دل کو دھکی کر گئے۔ اسی لیے وہ اسے اچھی طرح سمجھاتے ہوئے بولا۔

”ویسے میری ڈاکٹر ذکیہ عالم سے بات ہوئی ہے۔ وہ اگلے ہفتے پاکستان آرہی ہیں۔ پھر ہم ان سے ملیں گے تمہاری رپورٹس میں نے انہیں فلیس کر دی تھیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور ہمیں کوئی اچھی خبر دیں گی۔ تمہاری خواہش پوری کرنے کی، جس حد تک میں کوشش کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔“

اس نے نازیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے سارے ہال بکھیر دیئے۔

”پھر بھی سالار اگر کبھی آپ کو ایسا لگے کہ میرا وجود آپ کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ادھورا ہے تو پلیز بنا کوئی خیال دل میں لائے آپ دوسری شادی کر لیجئے گا۔“

اس نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کھلے دل سے مشورہ دیا۔

”اچھا چلو اب تم سو جاؤ، ہم اس مسئلے پر پھر کبھی بات کریں گے۔“

سالار جانتا تھا کہ اس وقت وہ کافی آپ سیٹ ہے اس لیے بہتر تھا کہ اس لمحہ اس سے کوئی بحث نہ کی جائے۔ نازیہ اس کی بات سن کر بغیر کوئی ضد کیے اپنا تکیہ سیدھا کرتے ہوئے لیٹ گئی۔ سالار بھی ٹیبل یسپ آف کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔



اماں اپنا پرانا باکس کھولے جانے اس میں کیا تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے ایک، دو بار نظر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سے اپنے ہوم ورک میں مصروف ہو گئی۔ آج صبح سے ہی گرمی بہت زیادہ تھی۔ سورج چھ بجے سے ہی سوانیزے پر کھڑا تھا۔ جس کی برقی گرم کرنوں نے ان کے کپے آگن کو خوب اچھی طرح تپانے کے بعد اس اکلوتے کمرے کا رخ کر لیا تھا۔ جہاں چھت پر لگا پنگھا بالکل ہولے ہولے گھوں گھوں کرتا ایسا گھوم رہا تھا۔ جیسے گرم آگ ہوا کی صورت اندر پھینک رہا ہو۔ ایک، دو بار اس نے اپنا ہوم ورک روک کر دھیرے دھیرے گردش کرتے پچھلے کی جانب بھی دیکھا۔ مگر شاید گرمی صرف اس کو ہی زیادہ محسوس

اک ساگر ہے زندگی

ہو رہی تھی۔ جبکہ اس کی ماں اس کی شدت سے بالکل بے نیاز اپنے کام میں بری طرح مصروف تھی۔ کمرے میں چھائی خاموشی کا احساس ہوتے ہی وہ یک دم گھبرا گئی، اٹھی اور اس خاموشی کو توڑنے کے لیے بے اختیار ماں کو پکار بیٹھی۔
خاموشی کو توڑتی اس کی آواز کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔

”کیا بات ہے؟“ اماں نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے اپنا بکس بند کر دیا۔
”آج بہت گرمی ہے۔“ وہ اپنی کاپی اٹھا کر بالکل پچھلے کے نیچے آگئی۔ اس کی قمیص پیسے سے بھیگ کر کمرے سے چپک سی گئی تھی۔

”مٹی کے مینے میں ہمیشہ اتنی ہی گرمی ہوتی ہے۔“ اماں اپنا بکس بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”ہاں مگر آج شاید کچھ زیادہ ہی ہے یا پھر ہمارا پنکھا بہت سلو چل رہا ہے۔“
”ہو سکتا ہے۔“ وہ ہمیشہ اتنی ہی مختصر بات کرنے کی عادی تھیں، جواب دے کر وہ کمرے کے داخلی دروازے کے جانب بڑھ گئیں۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔“
اتنی کڑکٹی دھوپ میں ماں کو کمرے سے باہر جانا دیکھ کر وہ برداشت نہیں کر سکی اور فوراً ہی بول اٹھی۔
”صبح کپڑے بھگوئے تھے سوچ رہی ہوں انہیں دھو کر خود بھی نہالوں۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔
”اماں نہا کر آئیں تو میں بھی نہا لیتی ہوں۔“ یہ خیال دل میں آتے ہی وہ جلدی جلدی اپنا ہوم ورک ختم کرنے لگی اور جب فارغ ہو کر باہر نکلی تو دھوپ کی شدت میں خاصی کمی تھی۔ سامنے والی دیوار کا سایہ بڑھ گیا تھا۔ شاید آسمان پر بادل آگئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کا چھبسا سا بنا کر اوپر دیکھا۔ سورج بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ اس نے اپنی کاپی بند کر کے بیک میں ڈالی اور خود دروازے کی چوکھٹ پر آ بیٹھی اس دم اماں دھلے ہوئے کپڑوں کی بالٹی ہاتھ میں تمام ہاتھ روم سے باہر نکلیں۔
وہ عام طور پر گرمیوں میں نہانے کے بعد تولیہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اس سبب ان کی قمیص پانی سے کیلی ہو گئی تھی۔ اس نے غور سے اپنی ماں کے چہرے کو نکا، زمانے کے سرد و گرم نے انہیں بہت بدل دیا تھا، مگر آج بھی انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ کھنڈر زدہ عمارت کسی زمانے میں بہت عالی شان رہی ہوگی۔ وہ خاموشی سے انہیں تار پر کپڑے پھیلاتے دیکھ رہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔

”اماں.....“ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر انہیں پکارا۔
”اب کیا ہو گیا؟“ اپنا دوپٹا اچھی طرح نیچر کر انہوں نے سارا پانی نکالا اور پھر اسے تار پر پھیلاتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”اماں آپ کی کوئی بہن نہیں ہے۔“
”نہیں.....“ مختصر سا جواب دے کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔
”اور بھائی.....“ وہ پھر سے بول اٹھی۔
”نہیں.....“ اماں نے بالٹی بھر کر پانی سارے صحت میں بہا دیا یا فرش کی گرمی پہلے سے کہیں کم ہو گئی۔
”ہمارا کوئی رشتہ دار کیوں نہیں ہے؟“

کئی زمانے سے دل میں آئے سارے وال دھیرے دھیرے اس کے لبوں پر آگئے۔ اماں نے حیرت سے پلٹ کر

اسے دیکھا۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنے سالوں بعد اپنی اولاد کو ان تمام سوالوں کا جواب دینا ہوگا۔ اچانک ہوا چلی تار پر پھیلا یا ہوا دوپٹا نیچے گر کر خراب ہو گیا۔ انہوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا دوپٹا اٹھایا۔

”اماں آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

بیٹی نے ایک بار پھر جواب طلبی کی۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا وہ چوکھٹ پر بیٹھی ان ہی کی جانب متوجہ تھی۔ ”کس بات کا جواب.....“ وہ ایک دم ہی انجان بننے ہوئے دوبارہ سے ہاتھ روم میں گھس گئیں۔ تاکہ دوپٹے کو ایک بار پھر سے صاف پانی سے نہ تھار لیا جائے اور خوب دیر لگا کر واپس نکلیں۔ وہ ابھی بھی چوکھٹ پر بیٹھی شاید ان کے جواب کی منتظر تھی۔ ایک ایسا جواب جو دینے والے کے دل کے اندر تر از ہو گیا تھا۔

”تم نے اپنا ہوم ورک ختم کر لیا۔“ وہ اس کی توجہ ہٹانے کے لیے بولیں۔

”تھوڑا سا رہ گیا ہے، ابھی کر لیتی ہوں مگر آپ پہلے میری بات کا جواب دیں، ہمارا کوئی ماموں، خالہ، پھوپھی کیوں نہیں ہیں۔ جیسے دوسروں کے ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر کبھی بھی کوئی رہنے کیوں نہیں آتا اور نہ ہی ہم کہیں جاتے ہیں ہمارے گھر کبھی بھی کوئی مہمان عید، بقرعید پر نہیں آتا۔ ایسا کیوں ہے۔ جواب دیں اماں.....“ وہ اپنا چہرہ ہتھیلی پر دھرے پُر جوش انداز میں بولتی چلی گئی۔

”کیا ہمارا اس دنیا میں کوئی نہیں۔“ ماں کی خاموشی سے اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا، اک حسرت سی اس کے لہجے میں گھل

گئی۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ ہل اٹھیں، ایسا لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا ہو۔ لاکھ چاہا ہر شے سے انکار کر دیں مگر ہائے دل مانا ہی نہیں کہ سب کے ہوتے ہوئے انہیں جھٹلا دیا جائے۔

”سب ہیں مگر ہم سے کوئی نہیں ملتا، سمجھو ہم ان سب کے لیے مر گئے۔“

انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئیں۔

”کیوں ہم نے ایسا کیا، کیا ہے اماں جو جیتے جی سب کے لیے مر گئے۔“ ایک اور سوال.....

اب وہ کیا بتائیں کہ سب ان کے اعمال کا کیا دھرا ہے جو وہ ساری دنیا سے کٹ کر اس طرح بے سرو سامانی کی حالت میں تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ انہیں آج زندگی میں پہلی بار افسوس ہوا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کیوں لے آئیں اور اگر لے ہی آئی تھیں تو جب اس کے باپ نے اپنی بیٹی کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا تو بلا چون و چرا واپس کر دیتیں کم از کم آج وہ تو یہ زندگی نہ گزارتی جو ان کا مقدر بن گئی تھی۔ ”اے کاش گزر اوقت ایک بار واپس آ جائے تو شاید یہ معصوم اس گندی دلدل سے نکل جائے جو میں نے خود اپنے لیے منتخب کی اور ساتھ ہی اس کو بھی تھکھٹ لیا۔“

انہوں نے ایک افسوس بھری نگاہ اپنے قریب موجود اپنی بیٹی پر ڈالی جس کا اس بھری دنیا میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ وہ ایک بار پھر پوری شدت سے پچھتائیں، یہ ایک پچھتاہی تو تھا جو روگ کی طرح ان کی پوری زندگی پر محیط ہو گیا تھا۔ ان کا دل بھر آیا اور وہیں گھٹنوں میں سر دے کر بے اختیار رونے لگیں۔

”میں تو اسے اپنے ساتھ بھلے کے لیے لائی تھی، کیا پتا تھا کہ وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل جائے گا، نہ میرے آگے کچھ رہے گا اور نہ ہی پیچھے کچھ باقی بچے گا، سب ملیا میٹ ہو جائے گا۔ اچھی زندگی کی خواہش سے میرا سب کچھ چین لے گا۔ کاش میں جان جاتی کہ برائی کا انجام ہمیشہ برائی ہی ہوتا ہے۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے مگر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو

وہ سوہنار بچا ہوتا ہے جو اس کے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

”اماں.....“ کندھا ہلانے پر انہوں نے اپنے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

”بتائیں اماں ہم سے کوئی کیوں نہیں ملتا۔“

بھروسہ ہی سوال شاید وہ اپنی تنہائی سے تنگ آ چکی تھی مگر ابھی وہ خود اس قابل نہ تھیں کہ اپنی بیٹی کے اس سوال کا جواب دیتیں جانتی تھیں کہ ایک دفعہ انہیں اپنی بیٹی کے اس مشکل ترین سوال کا جواب ضرور دینا پڑے گا۔

”بتاؤں گی۔ ضرور بتاؤں گی مگر ابھی نہیں اور ہاں کوشش کرنا کہ مجھ سے ایسا سوال دوبارہ کبھی مت کرنا تم نہیں جانتیں ایسے سوال میرے دل کو اندر تک چیر دیتے ہیں۔“

آخری جملہ انہوں نے اپنے لبوں میں اس طرح ادا کیا کہ آواز قریب کھڑی بیٹی تک نہ جاسکے اور پھر گھٹنوں میں سر دبا کے سسکنے لگیں۔

”سچ ہے جیتے جی انسان کبھی بھی اپنے ماضی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جسے سمجھانے کے لیے وقت جیسا استاد درکار ہوتا ہے۔“



آج اس کا یونیورسٹی میں داخلہ انٹرویو تھا اور وہ خاصی نروس سی تھی اس سے پہلے اس نے کبھی اس قسم کا انٹرویو نہیں دیا تھا اس نے اچھی طرح تیار ہو کر قد آدم آئینہ میں اپنا جائزہ لیا لان کے بلیک اور وائٹ سوٹ کے ساتھ لمبے سے بالوں کی چوٹی میں اس کا چہرہ بالکل صاف اور شفاف نظر آ رہا تھا۔ میک آپ کے نام پر صرف پنک لپ گلوں اس کے ہونٹوں پر تھا اپنے قریب رکھی کالی چادر اٹھا کر اس نے کھولی ہی تھی کہ یک دم سیکینہ بول اٹھی۔

”ارے بچے تمہارے سوٹ کا دوپٹا بہت بڑا ہے اسے کھول کر اچھی طرح اوڑھ لو کیا ضرورت ہے اتنی بڑی چادر اوڑھنے کی، ویسے بھی گاڑی میں جانا اور گاڑی میں ہی واپس آنا ہے کون سا تم بس میں سفر کرنے جا رہی ہو۔“

”اچھا.....“ اس نے چادر کھولتے کھولتے ہاتھ روک کر سیکینہ کو دیکھا۔

”ہاں بیٹا اس بار تو ملک صاحب بھی ڈھکے چھپے کہہ گئے کہ ایصال کو فیشن کرنے والی لڑکیاں پسند ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے ساری زندگی یورپ میں گزارنے والا تم جیسی لڑکی کو کیسے پسند کرے گا سوچو ذرا وہ تو انگریزوں میں رہنے کا عادی ہو گیا ہے کچھ نہ کہی تو بچہ اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھالو آخر ملک صاحب اسی لیے تو تم کو اتنی تعلیم دلا رہے ہیں ورنہ میٹرک کروا کے گھر بیٹھا دیتے۔“

سیکینہ خالہ اول تو بات ہی کم کیا کرتیں مگر جب کرتیں تو بنا مکمل وضاحت خاموش ہی نہ ہوتیں ابھی بھی ایسا ہی ہوا جانے ملک صاحب کی کبھی کسی بات کو انہوں نے اپنی مرضی کے معنی پہننا کر ہر بات اسے سمجھا دی، کیا سچ تھا اور کیا جھوٹ وہ کچھ سمجھ نہ پائی مگر اتنا ضرور ہوا کہ ایصال کا نام سنتے ہی بنا کوئی بحث کیے اس نے خاموشی سے چادر اتار کر قریب رکھی کرسی پر ڈال دی، سوٹ کا دوپٹا استری سینڈ سے اٹھا کر اوڑھتے ہوئے ٹیبل سے پنڈ بیگ بھی اٹھا لیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی باہر کی جانب چل دی، سیکینہ اس کے پیچھے پیچھے ہی تھیں تاکہ باہر کا دروازہ بند کر سکیں جب وہ دروازے کے باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔

”اللہ حافظ آئی۔“ آہستہ سے کہہ کر وہ میٹرھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

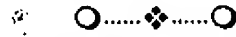
”اللہ تمہیں ہمیشہ کامیاب کرے۔“ اپنے پیچھے آتی سیکینہ کی آواز اسے اپنی ماں کی یاد دلا گئی، وہ بھی ہمیشہ اس کے لیے

اسی طرح دعا کیا کرتی تھیں اسے اچھی طرح یاد تھا وہ پانچ وقت کی نماز کے بعد ہمیشہ اماں کے سر پر جا کھڑی ہوتی۔

”اماں میرے لیے اچھی سی دعا کرتا۔“

”اللہ ہمیشہ میری بچی کو ہر امتحان میں کامیاب کرتا۔“ ماں کا یہ جملہ ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔

”آمین۔“ خالہ سکیندہ کی دعا کا جواب دل ہی دل میں دیتی وہ بیڑھیاں اتر گئی۔



اسے بریانی بے حد پسند تھی، اس لیے آج وہ صبح سے کچن میں گھسی بریانی کی تیاری کر رہی تھی ساتھ ہی اس نے فرنیج سے کھیرے نکال کر ٹوکری میں دھو کر رکھ دیئے تاکہ پانی خشک ہونے کے بعد انہیں کاٹ لے، بریانی کے ساتھ وہ ہمیشہ دہی میں کھیرے ڈال کر رائیہ تیار کرتی جو اسے بے حد پسند تھا، اس نے سالن میں چاولوں کی تہ لگا کر دم دے دیا، بریانی کی خوشبو اس کے تھنوں میں گھس کر اس کی بھوک کو مزید بڑھا گئی، اب اس کا ارادہ جلدی جلدی نہا کر کپڑے تبدیل کرنے کا تھا تاکہ اس کے بعد اطمینان سے اندر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر اچھی طرح بریانی سے لطف اندوز ہو سکے کہ اچانک ہی کسی نے باہر کی تیل بجا دی۔

”یہ اتنی گرمی میں اس وقت کون آگیا“ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

”مریم..... مریم بیٹا دیکھو باہر کون ہے؟“

اس نے دوپٹے کھڑے کھڑے مریم کو آواز لگائی، دوسرے ہی پل مریم دوڑی دوڑی کچن میں داخل ہوئی اور پھولی ہوئی سانسوں میں بتایا۔

”اماں سالار انکل آئے ہیں۔“

”اس وقت.....“ وہ تھوڑا سا حیران ہوئی اور دروازے پر لٹکا اپنا دوپٹا اتار کر تیزی سے باہر دروازے کی جانب آگئی جہاں سالار کے ساتھ نازیہ بھی موجود تھی۔

”ارے آپ لوگ باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیں۔“

ان دونوں کو اچانک اس طرح اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر وہ اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ سمجھ ہی نہ آیا کیا کرے۔
”میں صرف نازیہ کو چھوڑنے آیا ہوں یہ تم سے ملنے کے لیے خاصی بے قرار تھی، اس لیے سوچا ابھی چھوڑ دوں شام میں واپس جاتے ہوئے لے لوں گا تم ڈسٹرب تو نہیں ہوئیں۔“

اس طرح بناتاتے بھری دوپہر ننب کے گھر آنے پر ہلکی سی شرمندگی کا احساس سالار کو بھی ہوا۔
”نہیں میں نے بھلا کیوں ڈسٹرب ہونا ہے بلکہ اچھا ہوا یہ آگئی میرا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔“ وہ اس کی شرمندگی کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

”چلو میں چلتا ہوں پانچ بجے تک تمہیں پک کر لوں گا۔“

اس دفعہ اس نے نازیہ کو مخاطب کیا جو بالکل خاموش کھڑی تھی۔

”اللہ حافظ“ وہ دھیرے سے کہتی اندر داخل ہو گئی، ننب اس کا ہاتھ تھامے اپنے اپنے کمرے میں ہی لے آئی جہاں بستر پر سامنے ہی جگنو سو رہی تھی۔

”تم یہاں بیٹھو میں ابھی کھانا لے کر آتی ہوں۔“

اسے وہاں چھوڑ کر وہ واپس ہی چلی تھی کہ نازیہ نے آواز دے کر روک لیا۔
 ”ایسا کرو تم باہر برآمدے میں رکھی ٹیبل پر کھانا لگاؤ میں بھی وہیں کھاؤں گی۔“
 نازیہ بنا تکلف کہتی اس کے پیچھے ہی باہر آگئی۔

نائب نے کھانے کے ساتھ سکوائش بھی بنا لیا اور پھر دونوں نے نہایت خوشگوار ماحول میں مزے کے ساتھ خوب ڈٹ کر کھایا۔

”تم بریانی بہت لذیذ بناتی ہو۔“

کھانے کے دوران کئی بار نازیہ نے اپنا یہ جملہ دوہرایا، اور ہر بار وہ اس جملے کو سن کر شرمندہ ہوتی گئی کیونکہ جانتی تھی کہ نازیہ بہت بہترین کوکنگ کرتی تھی، جس کی ہمیشہ سالار تعریف کیا کرتا اور پھر شام تک نازیہ اس کے ساتھ رہی تقریباً پانچ بجے جب سالار اسے لینے آیا تو خوب لدا پھندا تھا ڈھیروں ڈھیروں بیکری کے سامان کے ساتھ ساتھ کئی طرح کا فروٹ، مریم اور جگنو کے لئے کچھ کھلونے جسے لا کر اس نے ٹیبل پر ڈھیر کر دیا، نائب بنا کسی جرح کے تمام سامان اٹھا کر اندر کچن میں لے آئی۔ عرصہ ہوا اس نے سالار کے ساتھ روایتی مکانہ بازی کا عمل ترک کر دیا تھا اس کی لائی ہوئی ہر چیز وہ پورے استحقاق سے استعمال کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔



”ایک بات تو بتاؤ۔“ سامان پیک کرتے کرتے جیسے اریثہ کو یاد آ گیا۔

”کون سی بات.....“

ایشال جو پیکنگ میں اس کی مدد کر رہا تھا پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”تم واپس جا کر اس کزن سے شادی کر لو گے جس سے کئی سال قبل نکاح کر کے آئے تھے۔“

دل میں دبا کئی سال پرانا خدشہ بالآخر اس کے لبوں تک آ ہی گیا کیونکہ دو دن بعد ان کی فلائٹ تھی اور وہ دونوں اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس جا رہے تھے اسی لیے شاید آج وہ چاہتی تھی کہ اپنی ہر بات کی وضاحت کرے تاکہ بعد میں کسی قسم کا کوئی مغالطہ اس کی زندگی خراب نہ کرے اور اس سوال کا کیا جواب دے یہ خود ایشال کی سمجھ میں بھی نہ آیا۔
 ”میں نے کوئی اتنا مشکل سوال نہیں کیا جس کا جواب دینے میں ہی تم نے پندرہ منٹ لگا دیئے ہاں یا نہ کہو اور بات ختم کرو۔“

ایشال کی خاموشی نے اریثہ کا موڈ یک دم ہی آف کر دیا۔

”تمہیں کس نے یہ کہا کہ میں اس لڑکی سے شادی کر لوں گا جس کا آج تک مجھے نام بھی معلوم نہیں۔“

جواب دینے کے بجائے الٹا اس نے خود سوال کر ڈالا۔

”ظاہر ہے جب بنا نام پوچھے نکاح کے ہیپر ز پر سائن کر آئے تھے تو شادی بھی کرو گے ہی نا، دیسے بھی اب تو صرف رخصتی باقی ہے باقی سب کچھ تو ہو گیا ہے۔“

وہ بیک کی زپ بند کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے بولی۔

ایشال نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جو شاید غصہ کے باعث ہلکا سا سرخ ہو گیا تھا اور ایسا یقیناً اس کے نکاح کے ذکر کے باعث ہوا تھا، وہ خاموشی سے آگے بڑھا، اریثہ کے سامنے رکھا بیک اپنی جانب کھسکایا اور خاموشی سے زپ

بند کر دی۔

”ضروری نہیں ہے کہ اگر بچپن میں میری مرضی کے خلاف میرا نکاح کر دیا جائے تو میں اب اسے رخصت کروا کے اپنے گھر بھی لے آؤں۔ میں اب بالغ اور سمجھ دار ہوں، شادی کا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے میرے مذہب نے بھی دیا ہے تو پھر میں کیوں وہ زندگی اپنے لیے منتخب کروں جو مجھے پسند نہ ہو۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

”میں فیصلہ کر چکا ہوں واپس جاتے ہی اسے طلاق دے دوں گا۔“ وہ فیصلہ کن لہجہ میں بولا۔

”تم کیا سمجھتے ہو یہ سب کچھ بہت آسان ہے اور انکل تمہیں ایسا کرنے دیں گے۔“

وہ جانتی تھی کہ بہت مشکل ہے ایصال کا اپنے فیصلہ پر عمل درآمد کرنا اور اس سلسلے میں اسے ملک انکل کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ وہ کبھی بھی یہ نہ چاہیں گے کہ ایصال ان کی بھتیجی کو چھوڑ کر ایشہ سے شادی کرے اس کے نزدیک جذبات سے زیادہ عقل ایسے تمام اعمال کے لیے ضروری تھی۔

”وہ بعد کی بات ہے فی الحال جو فیصلہ مجھے کرنا تھا میں نے کر لیا اور میرے اس فیصلے میں ماما بھی میرے ساتھ کھڑی ہیں میں تنہا نہیں ہوں اور مجھے یقین ہے ماما کے سامنے پاپا کی ایک نہیں چلنے والی۔“

پاپا کے خوف پر ماں کی مدد کا جذبہ غالب آ گیا ویسے بھی اسے اپنی ماں پر پورا بھروسہ تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف پاپا کبھی بھی اس کی شادی نہیں کر سکتے۔ ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا تم فکر مت کرو میں تمام معاملہ حل ہونے کے بعد جلد ہی ماما پاپا کو تمہارے گھر بھیج دوں گا بس اس مسئلے کے حل ہونے تک تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا اور اگر کوئی مشکل پیش آئے تو میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

وہ ایشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں بولا۔

یہ پہلا عہد تھا جو آج اتنے سالوں میں اس نے کیا تھا اور یہ سب سننے کے لیے ایشہ کے کان جانے کب سے منتظر تھے وہ شروع سے جانتی تھی کہ ایصال اسے پسند کرتا ہے، ایصال بھی اس کی دل کی کیفیت سے آگاہ تھا مگر ایصال کے نکاح نے ان دونوں کے درمیان ایک آن دیکھی دیواری کھڑی کر رکھی تھی۔ جسے آج ایصال نے گرا دیا۔ ”بولو ایشہ میرا ساتھ دو گی۔“

اسے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ پھر سے پوچھ بیٹھا۔

”میں تو ہمیشہ سے ہی تمہارے ساتھ ہوں بے شک جیسے بھی حالات ہوں۔“ اس اقرار نے اسے پُر سکون کر دیا۔

”ٹھیک ہے اب جو کچھ ہو گا اسے واپس جا کر اکٹھے، ایک ساتھ سمجھتیں گے۔“

اس جواب نے ایصال کو ایک دم ہلکا پھلکا کر دیا اور وہ جیسے شانت ہوتا ہوا بولا۔

”ویسے ایک بات کہوں ایصال، یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھ رہے ہو تمہیں اس سلسلے میں انکل کی ایک زبردست مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہو گا۔“

ایشہ کا خدشہ سو فیصد درست تھا اور یہ بات ایصال خود بھی اچھی طرح جانتا تھا۔

”جانتا ہوں اور اس کے لیے میں اپنی طور پر تیار بھی ہوں اسی لیے یہاں ایک کہنی میں اپنی جاب کے لیے پہرہ زدے کر جا رہا ہوں تاکہ اگر مجھے اپنا گھر بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دوں مگر میں کسی بھی صورت ایسی لڑکی کو بیوی بنا کر اپنے گھر نہیں لا سکتا جس کی ماں کی بد چلنی کے قصے پورے خاندان میں مشہور ہوں۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکا اور اریشہ کے منتظر چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ ”اور اگر میں یہ سب کچھ بھول کر اسے اپنانے کا سوچ بھی لوں تو تمہاری محبت مجھے کبھی اس کا ہونے نہ دے گی اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“

اریشہ کے چہرے پر اک اطمینان پھیل گیا، یہ ہی تو وہ جملہ تھا جسے سننے کی وہ ہمیشہ سے منتظر تھی۔



وہ جب سکول سے واپس گھر آئی تھی اماں کو اندر کمرے میں چار پائی پر بے سدھ ہی پڑے دیکھا بخار تو انہیں رات سے ہی تھا مگر شاید اس وقت اس کی شدت زیادہ ہو گئی تھی اب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان حالات میں کیا کرے جس سے اس کی بستر پر پڑی ماں فوراً سے بیشتر چاق و چوبند ہو جائے۔ اسے ہمیشہ سے ہی گھر میں چھایا سناٹا کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا گھر میں پھیلی خاموشی سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی اب تو اس سے باتیں کرنے والی واحد ہستی بھی چپ چاپ آنکھیں موندے بستر پر بند حال پڑی تھی آخر گھر میں چھائی ویرانی سے وہ گھبرا گئی اور ماں کی چار پائی کے قریب جا بیٹھی۔

”اماں..... اماں۔“

ماں کا ہاتھ تمام کر اسے پکارتے ہوئے وہ بالکل روہاںسی ہو گئی اور پٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے جب وہ ماں کے سر ہانے بیٹھی بے اختیار، بے آواز روئے چلی جا رہی تھی کہ اچانک، اس پل کمرے کا پردہ ہٹا کر برابر والی فاطمہ خالہ فرشتے کی صورت اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ایک بڑا سا سلور کا کٹورا اٹھا رکھا تھا۔

”آنکھیں تم سکول سے۔“ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بڑی محبت سے بولیں۔

”جی خالہ.....“

انہیں دیکھ کر وہ جلدی اپنی آنکھیں صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”امی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے جب سے آئی ہوں ایسے ہی پڑی ہیں نہ آنکھیں کھولتی ہیں اور نہ ہی میری کسی بات کا جواب دے رہی ہیں۔“

انہیں بتاتے بتاتے وہ ایک بار پھر سے رونے لگی۔

”ارے بیٹا رو کیوں رہی ہو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگوں وہ اپنا کرم ضرور کرے گا۔“

اسے خود سے لگاتے ہوئے خالہ نے بڑے پیار سے تسلی دی، تھوڑی ہی دیر میں اس کے آنسو ختم سے گئے۔

”بیٹا یہ کٹورے میں برف ہے اسے کولر میں ڈال لو پھر کسی برتن میں ٹھنڈا پانی لاؤ تاکہ تمہاری ماں کی پٹیاں کریں اس سے ان شاء اللہ بخار کی شدت میں ضرور کمی ہوگی۔“

اس نے خالہ کے ہاتھ سے کٹورا اٹھا اور جلدی سے کچن میں جا کر ان کی تمام ہدایات پر عمل کرتی ہوئی ٹھنڈا پانی اور ساتھ ہی کپڑے کا ایک ٹکڑا لیے واپس آگئی اور پھر جلدی جلدی پانی میں کپڑا بھگو کر ماں کے ماتھے پر رکھا۔

”تم نے کھانا کھایا؟“ ٹھنڈے پانی سے اس کی ماں کے پاؤں گیلے کرتیں خالہ کو جیسے اچانک ہی یاد آیا اور وہ اس کے ستے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوال کر بیٹھیں۔

”نہیں.....“ جواب کے ساتھ ہی اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”معاف کرنا بیٹا تین بج گئے اور مجھے یاد ہی نہ رہا کہ تم بھوکی ہو۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”تم لگاتار پٹیاں کرو اپنی ماں کو یہ ابھی ہوش میں آجائے گی اتنی دیر میں، میں تم لوگوں کے لیے کچھ کھانے کو لاتی

ہوں۔“

”جی اچھا.....“ اثبات میں جواب دے کر وہ پھر سے اپنی ماں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے اپنی ماں کے بعد اگر کسی کا تھوڑا بہت بھی سہارا تھا تو وہ واحد فاطمہ خالہ تھیں جو ان دونوں ماں بیٹی کا خیال بالکل اپنوں کی طرح رکھتی تھیں۔ صرف پانچ منٹ بعد جب وہ واپس آئیں تو ایک بڑی سی پلاسٹک کی پلیٹ تھامے ہوئے تھیں۔

”یہ بریانی ہے رات میری بہن کے گھر دعوت تھی واپسی میں اس نے ڈھیروں ڈھیر ساتھ ہی دے دی اب جتنی تمہیں کھانی ہے سو کھا لینا باقی سنبھالینا رات میں کام آئے گی پھر بھی اگر تمہیں کچھ ضرورت پڑے تو میری دیوار بجا دینا میں آ جاؤں گی۔“

انہوں نے اسے پلیٹ تھماتے ہوئے سمجھایا، بریانی کی خوشبو ناک میں جاتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی ڈرا سی دیر میں وہ اپنی ماں کی پیاری بھی بھول گئی اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ آخری بار اس نے بریانی کب کھائی تھی۔ شاید کئی زمانے بیت گئے وہ تو اپنی ماں کے ساتھ روکھی سوکھی کھانے کی ہی عادی ہو چکی تھی۔ جلدی سے پلیٹ تھام کر اس نے کچن کی جانب جانے کے لیے اپنا قدم اٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے آئی ہلکی سی ماں کے کراہنے کی آواز نے اسے پھر اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

”ہائے.....“ اس نے پلیٹ کر دیکھا وہ تکلیف کی شدت سے آہستہ آہستہ تکیہ پر سر مار رہی تھیں وہ وہیں رک گئی ایک ہی بل میں اس کی بھوک پیاس سب ختم ہو گئی۔

”تم جاؤ کھانا کھاؤ میں اسے دیکھتی ہوں۔“

خالہ نے اسے اپنی جگہ کھڑا دیکھ کر کہا اور خود جلدی سے ٹھنڈے پانی کا کٹورا اٹھاتے ہوئے ماں کے سر ہانے جا کھڑی ہوئیں۔

”میرا خیال ہے تمہاری ماں بھی بھوکی ہے۔“

شاید اس کی ماں کے چہرے پر چھائی زردی نے انہیں یہ احساس دلایا وہ کچن میں جاتے جاتے رک گئی اسے یاد آیا ماں نے رات سے کچھ نہ کھایا تھا۔ سوائے ایک کپ چائے کے جو بڑی مشکل سے ان کے حلق سے اتری تھی رات انہوں نے روٹی پکائی ضرورت تھی مگر کھانے کو دل نہ چاہا بخار کی وجہ سے ان کا حلق کڑوا ہو گیا تھا اس لیے وہ کچھ بھی نہ کھا پارہی تھیں۔

”ایسا کرو تم گلاس میں پانی لا کر اسے پلاؤ، میں اس کے لیے بھی کچھ لاتی ہوں۔“

وہ ایک بار پھر چپل میں پاؤں پھنسا کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اگلے ہی بل جب وہ واپس آئیں تو چائے کے ایک کپ کے ساتھ کچھ بسکٹ بھی تھے جنہیں چائے میں ڈبو ڈبو کر انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے ماں کے حلق میں اتارا۔ دو ہی بسکٹ کھانے کے بعد ماں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا وہ کچن میں کھانا کھاتے ہوئے مسلسل دروازے سے باہر جھانک رہی تھی ماں کے کراہنے کی آواز کچھ ہی دیر میں قدرے کم ہو گئی، شاید وہ سو گئی تھیں جب خالہ اندر سے باہر نکلیں۔

”میں گھر کا ایک چکر لگا آؤں بھوکو پکانے کے لیے کچھ لادوں ورنہ وہ سارا وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے گی۔ سوچ رہی ہوں آج رات یہاں ہی سو جاؤں تمہارے پاس، بھلا تم اکیلی بچی بیمار ماں کو کیسے سنبھالو گی۔“

وہ بات جو وہ کہنا چاہتی تھی خالہ نے خود ہی کہہ دی۔

”ہاں خالہ آپ رات یہاں ہی آ جائیں مجھے تو ویسے بھی اکیلے گھر میں بہت ڈر لگتا ہے۔“ وہ ایک بار پھر سے رو ہانسی ہو گئی۔

اک ساگر ہے زندگی

”رومت بیٹا میں آتی ہوں۔“ اسے تسلی دیتی وہ باہر نکل گئیں اور پھر اپنے وعدے کے مطابق عشاء پڑھ کر جب واپس آئیں تو ماں کے لیے دلیہ بھی بنوالائی تھیں۔ اس وقت تک ماں کا بخار بھی پہلے سے کم ہو گیا تھا انہوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنے ہاتھوں سے دلیہ بھی کھالیا۔

”سچ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔“ فاطمہ خالہ کو دیکھ کر ساری رات یہی ایک خیال اس کے دل میں آتا رہا۔



اس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا اور ملک صاحب کی منتخب کردہ ایک بہترین یونیورسٹی میں داخلہ بھی ہو گیا ویسے بھی اس کا کالج کو ایجوکیشن تھا دو سال وہاں لڑکوں کے ساتھ پڑھ کر اس میں خاصی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی جسے وقت نے خاصا بڑھا دیا تھا اسے یاد تھا۔

شروع میں جب وہ اپنے محلے کا سرکاری سکول چھوڑ کر شہر کے ایک بہترین سکول گئی تھی تو خاصی ڈری سہی رہا کرتی تھی مگر جب وہ سکول کے دو سال مکمل کر کے باہر نکلی تو خاصی تبدیل ہو چکی تھی شاید اچھا لباس، اچھی تعلیم اور بہترین گاڑی کی سہولت نے اس کے اندر موجود ڈر اور خوف نکال دیا تھا۔ دو سال سکول کی تعلیم کے دوران وہ سکول ہی کے ہاسٹل میں رہی اور پھر ملک صاحب نے اسے شہر کے ایک پوش علاقے میں فلیٹ لے دیا جہاں فضل دین اور اس کی بیوی سیکینہ اس کے ساتھ تھے اب وہ مغل پورہ کی پرانی گلیوں سے نکل کر سمن آباد کی باسی بن چکی تھی۔ ماں جیسا عظیم رشتہ کھونے کے بعد وہ ایک معزز شہری کا اعزاز حاصل کرنے کے قابل ہو گئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کالج میں پڑھنے کے دوران کس طرح کلاس کے لڑکے اس سے خائف رہا کرتے تھے کیونکہ وہ کبھی کسی سے زیادہ فری ہو کر بات ہی نہ کیا کرتی تھی۔

عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی ڈریرے یا جاگیردار کی بیٹی ہے جو تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر میں رہ رہی ہے۔ اس نے کبھی بھی کسی کے اس خیال کی تردید یا تصدیق نہ کی یہاں تک کہ اس کی اکلوتی اور بہترین دوست حصہ بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتی تھی۔ مگر اب یونیورسٹی آتے ہی اس نے اپنا رویہ تھوڑا سا تبدیل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ لوگوں میں تھوڑا بہت مکمل مل جائے جس میں اسے خاصی کامیابی بھی حاصل ہوئی۔



اریشہ کا رشتہ آیا ہوا تھا شاہ زیب خان اس کے پاپا کے بزنس پارٹنر کا بیٹا تھا جو حال ہی میں لندن سے بینکنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن واپس لوٹا تھا اور یہ خبر اریشہ نے جب سے فون پر ایصال کو دی تھی وہ بے چین سا گھر میں پھر رہا تھا۔ ماما بازار گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ ابھی انہیں ساتھ لے کر ماموں کی طرف چلا جاتا۔ اس ساری ٹینشن میں وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ خود کسی کی ذات سے منسوب ہے اور جب تک اس کا نام اس انجان لڑکی کے ساتھ رہے گا ماموں کبھی بھی اریشہ کا رشتہ نہ دیں گے۔

اریشہ خود بھی پاکستان آتے ہی فوراً سر پر پڑنے والی اس شاہ زیب نامی افتاد سے خاصی پریشان تھی جس کا اندازہ اس کی کچھ قبل آنے والی فون کال سے ایصال کو ہو چکا تھا۔ اب یہ لازمی ہو گیا تھا کہ ایصال اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے مسئلے کو فوری طور پر حل کرے اسے محسوس ہوا جسے وہ ایک دورا ہے پر کھڑا ہے جہاں سے ایک راستہ اسے اریشہ کی طرف لے جاتا ہے جس کے ساتھ اس کی دنیا بھر کی خوشیاں جڑی تھیں اور دوسرا راستہ پاپا کے ساتھ چلتے ہوئے اس سبز دوپٹے والی لڑکی

تک جاتا تھا جہاں پہنچ کر شاید زندگی کی ہر خوشی اس پر ختم ہو جاتی اور یہ دوسرا راستہ اپنانا اس کے نزدیک موت کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔

اب وہ وقت آچکا تھا کہ وہ اپنے لیے ان دونوں میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرے اور وہ راستہ کون سا تھا اس کا فیصلہ تو وہ بہت پہلے ہی کر چکا تھا اور اب یہ فیصلہ صرف اپنے پاپا تک پہنچانا تھا تا کہ وہ جلد از جلد اس قید سے رہائی پاسکے جس میں جانے کتنے سالوں سے اسے پاپا کی محبت نے جکڑ رکھا تھا اور پھر بہت سوچنے کے بعد اس نے اریٹھ کا نمبر ملایا دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا وہ شاید اسی کے فون کی منتظر تھی۔

”ہلولو.....“ اریٹھ کی بھینگی ہوئی آواز یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

”پلیز اریٹھ پریشان مت ہو میں آج ہی ماما کے ساتھ تمہارے گھر آکر ماموں سے بات کرتا ہوں۔“

یقیناً وہ جو فیصلہ کر چکا تھا اب اس پر عمل درآمد کا وقت آ گیا تھا۔

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی۔“ اور اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

اب اسے صرف ماما کی واپسی کا انتظار تھا تا کہ انہیں ساری صورت حال سمجھا کر اپنے ساتھ ماموں کے گھر لے جانے پر آمادہ کر سکے اور اسے یقین تھا اس کی ماں کبھی بھی اسے انکار نہیں کرے گی۔



وہ صحن میں کرسی ڈالنے بیٹھی ہوئی جانے کن خیالوں میں گم تھی، مریم اس کے قریب ہی رکھے تخت پر بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی تھی آج اس نے ٹیوشن کے بچوں کو چھٹی دے دی تھی کیونکہ جتنی کورسز سے ہی بخار تھا اور وہ ابھی ابھی فیزر لے کر سوئی تھی کہ اچانک ہی باہر کا دروازہ کھول کر فضلہ بھابی اندر داخل ہوئیں جس کے ساتھ ہی ان کے قیمتی پرفیوم کی مہک اس کے منتھوں سے ٹکرائی وہ انہیں دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم بھابی آج آپ کیسے راستہ بھول گئیں۔“

اسنے دونوں بعد انہیں اپنے گھر دیکھ کر ذہن کو حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی وہ ویسے بھی شاید دوسروں کے رویے جلد بھلا دینے کی عادی تھی۔

”چلو میں تو خیر پھر بھی بھول گئی تم تو وہ بھی نہیں بھولتیں۔“

اسے گلے سے لگاتے ہوئے وہ جتنا نہیں بھولیں۔

”بس بھابی ٹائم ہی نہیں ملتا، مریم کے امتحان ہونے والے ہیں جبکہ جتنی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور آپ تو جانتی ہیں کہ وہ کس قدر کمزوری ہے اس عمر کے بچے تو بھاگنے دوڑنے لگتے ہیں مگر وہ ہے کہ گود سے ہی نہیں نکل رہی۔“

”ہاں یہ تو ہے اور پھر تم پر تو آج کل دوسرے گھر کی ذمہ داری بھی آن پڑی ہے۔“

اندر برآمدے کی طرف جاتے جاتے انہوں نے پلٹ کر کہا۔

”دوسرا گھر.....“

ذہن کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور اسے سوالیہ انداز میں پوچھتے ہوئے ان کی کرسی عین نیچے کے نیچے رکھ دی ویسے تو اب موسم خاصا تہذیل ہو چکا تھا مگر پھر بھی فضلہ بھابی کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید انہیں ابھی ابھی گرمی محسوس ہو رہی ہے۔

”ہاں ابھی سنا ہے سالار کا گھر بھی تم نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔“

اک ساگر ہے زندگی

دو معنی جملہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ چکی تھیں جب زینب ان کے لیے پانی کا گلاس لے کر آئی جسے خلاف توقع انہوں نے قہام بھی لیا۔

”گھر تو خیر میں نے کیا سنبھالنا ہے ان کے ہاں نوکروں کی کمی نہیں ہے البتہ نازیہ پچھلے دنوں خاصی بیمار رہی ہے بس اس کو تھوڑا بہت سنبھالا وہ بھی اس لیے کہ اس بے چاری کا کوئی قریبی عزیز یہاں نہیں ہے۔“

بنافضہ بھابی کی بات کی گہرائی جانچے اس نے نہایت سادگی سے ہر بات کی وضاحت کر دی۔

فضہ بھابی نے اس کی بات کا جواب دینا شاید ضروری نہ سمجھا اور خاموشی سے گھونٹ گھونٹ کر کے پانی حلق سے اتارنے لگیں۔

”میں اور اسفند، صمد سے ملنے دینی جا رہے ہیں بچوں کی بھی چھٹیاں ہونے والی ہیں سوچا اسی بہانے وہ بھی تھوڑا گھوم پھر لیں گے۔“

انہوں نے خالی گلاس زینب کو تھماتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی۔

”اس لیے سوچا جانے سے پہلے تم سے بھی ملتی جاؤں۔“ ٹانگ پر ٹانگ دھرتے وہ ایک ادا سے بولیں۔

”جی نہیں یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔“ صرف اتنا کہہ کر وہ کچن میں آگئی الماری کھول کر دیکھا دو دن قبل لائے گئے سالار کے سامان میں سے کافی کچھ بچا پڑا تھا اس نے سٹول رکھ کر اوپر والے خانے سے شیشے کی سفید پلیٹیں نکالیں جو مہمانوں کے لیے سنبھال کر رکھی تھیں، ایک پلیٹ میں بسکٹ نکالے اور پھر فرنچ کھول کر بچا ہوا ایک نکالا، کچھ فروٹ پلیٹ میں رکھ کر وہ ٹرے لیے اندر آگئی۔

”مریم یہ ٹیبل تائی اماں کے سامنے رکھو۔“

مریم نے اس کے پکارتے ہی قریب رکھی پلاسٹک کی ٹیبل فضہ بھابی کے قریب کر دی جس پر زینب نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ٹرے رکھ دیا آج شاید زندگی میں پہلی بار اس نے فضہ بھابی کی اتنی خاطر دار کی تھی وہ بھی ان کے معیار کے مطابق۔

وہ ٹرے رکھ کر واپس ہی چلی گئی کہ فضہ بھابی کی پیچھے سے آتی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیئے۔

”ارے یہ کیک کون لایا ہے؟“ عقب سے آتی فضہ بھابی کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس کا عنصر بھی نمایاں تھا اب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں کیا جواب دے۔

”جانتی ہو یہ میرا فیورٹ کیک ہے اور خاصا مہنگا آتا ہے۔“

کیک کا ایک پیس کاٹ کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے ہی انہوں نے جتلیا۔ وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے کچن میں آگئی جلدی جلدی دو کپ چائے کے بنائے اور ٹرے میں لیے واپس اندر برآمد میں آگئی۔

”میرا خیال ہے میرے آنے سے پہلے تم سے ملنے سالار یا نازیہ دونوں میں سے ایک کوئی ایک آیا تھا۔“

وہ اپنے لہجے میں معنی خیزی بھرتے ہوئے بولیں۔

زینب ان کے اندازے کی سو فیصد درستی پر حیران ہی رہ گئی۔

”آج تو نہیں البتہ دو دن قبل نازیہ آئی تھی۔“

”ہاں میں یہ سب سامان دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔“

انہوں نے کیک کا ایک اور پیس پلیٹ میں نکالا۔

نہب نے خاموشی سے اپنے سامنے رکھا چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا اسے بالکل سمجھ نہیں آیا کہ فضلہ بھابی سالار اور نازیہ کے معاملے میں اتنی ٹوہ کیوں لے رہی ہیں۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں تمہیں کچھ دینی سے منگوانا ہوتا دو۔“

کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے رسی سے انداز میں پوچھا۔

”نہب بھابی اللہ کا شکر ہے یہاں سب کچھ مل جاتا ہے۔“

وہ جانتی تھی کہ فضلہ بھابی کا یہ جملہ محض روایتی ہے ورنہ وہ کبھی بھی کسی کے لیے کچھ لانے والوں میں سے ہرگز نہیں تھیں۔ ”اچھا ابھی جیسے تمہاری مرضی اللہ حافظ!“

اس سے گھلے ل کر انہوں نے مریم کو پیار کیا اور پھر داخلی دروازے سے باہر نکلی تھیں اور وہ وہیں کھڑی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ ”جانے کیوں خدا کبھی کبھی ایسے بندوں کو اتنا نواز دیتا ہے جو اپنے پیسے کے زور پر دوسروں کو نیچا دکھانے سے کبھی نہیں چوکتے۔“ یہ سوچتی ہوئی وہ کچن کی جانب آگئی تاکہ رات کے کھانے کی تیاری کر سکے کیونکہ فرہاد آٹھ بجے آتے ہی کھانا کھانے کا عادی تھا اور اس سلسلے میں ذرا سی دیر اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جس پر اکثر ہی وہ نہب سے الجھ جاتا۔ بے شک نہب کی اپنی طبیعت خراب ہو یا مریم، جگنو میں سے کسی کی وہ اس معاملے میں کبھی بھی کپڑا مارتا نہیں کرتا تھا اور اس کی یہی عادت نہب کو سخت ناپسند تھی۔



”لگتا ہے آج کل تمہاری دوست تم سے ناراض ہے۔“

فتح محمد نے اپنی مونچھوں پر خضاب لگانے کے بعد، ایک ہار اچھی طرح سامنے رکھے چھوٹے آئینے میں اپنا جائزہ لیا، اور پھر چار پائی پرنٹنگی کپڑے تہہ کرتی سادیہ کو مخاطب کیا۔

”کون سی دوست؟“ فوری طور پر وہ، فتح محمد کی بات سمجھ نہ سکی۔

”ایک ہی تو دوست ہے تمہاری۔“

اب وہ وہیں صحن میں لگے نلکے کے قریب کھڑا خوب رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھ دھو رہا تھا کہیں کوئی کالا دھبہ اس کے ہاتھوں پر نہ لگا رہ جائے۔

”میرا خیال ہے آپ نہب کی بات کر رہے ہیں۔“ بالآخر سادیہ اس کی بات کی تہہ تک پہنچ ہی گئی۔

”ہاں وہ ہی، کئی دن ہو گئے تم سے ملنے نہیں آئی اور نہ ہی تم خود اس کی طرف گئی ہو۔“

بظاہر فتح محمد کا انداز بالکل سرسری سا تھا۔

”ہاں آج کل وہ کچھ مصروف ہے شاید اس کی کوئی کزن بہت زیادہ بیمار ہے جس کا یہاں کوئی قریبی عزیز نہیں رہتا اسی سبب نہب اس کی تیمارداری کے لیے اکثر اس کے گھر چلی جاتی ہے۔“ سادیہ نے مکمل تفصیل بتائی۔

”ویسے آج وہ آج کو کیسے یاد آگئی؟“

تہہ کیے ہوئے کپڑے اٹھا کر اندر کی طرف جاتی سادیہ کو جیسے کچھ یاد آگیا اور اس نے وہیں اپنے کمرے کے داخلی دروازے کے قریب رکھ کر فتح محمد سے سوال کیا۔

”میں بھلا اسے کیوں یاد کروں گا وہ تو ایک دو دفعہ میں نے اسے کسی بڑی سی گاڑی میں جاتے دیکھا تو سوچا تم سے

پوچھوں کیا قصہ ہے۔“ وہ اپنے دل کا چور چھپاتے ہوئے بولا۔

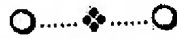
”ہاں وہ شاید نینب کا وہ بی کزن ہوگا جس کی بیوی بیمار ہے۔“

وہ اب سمجھی کہ فتح محمد کے اس قدر کریدنے کے پیچھے کیا راز ہے دراصل نینب کا روز روز اس طرح گاڑی میں بیٹھ کر جانا اسے مشکوک کر رہا تھا سادیہ نے بہتر سمجھا کہ اسے ہر بات واضح کر کے بتادے دوسری صورت وہ پورے محلے میں نینب کی فرضی کہانیاں سناتا پھرتا وہ کچھ ایسا ہی تھا۔

”فرہاد بھائی کے علاوہ نینب کا سارا خاندان خوب پیسے والا ہے سب ہی کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں ہیں اور وہ دونوں میاں بیوی اکثر ان میں ہی بیٹھ کر جاتے ہیں اور یہ بات سارا محلہ جانتا ہے۔ ان کے تو سارے رشتہ دار بھی ایسی بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں، پھر بھلا آپ کو کیا تجسس ہوا جو نینب کو کسی گاڑی میں جاتے دیکھا؟ آخر اپنے گھر کے دروازے سے بیٹھ کر گئی تھی تو ضرور فرہاد بھائی کو علم ہوگا کہ کس کے ساتھ گئی ہے پھر بلاوجہ ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گیا کیونکہ سادیہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سو فیصد درست تھا اس لیے اب فتح محمد کے پاس اس کی کوئی بھی بات جھٹلانے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ جانتا تھا کہ نینب کے امیر خاندان کا رعب پورے محلے پر ہی تھا سب کو بتا تھا کہ فرہاد کے بہن بھائی خوب پیسے والے لوگ ہیں یہ ہی سبب تھا جو اس کے گھر آنے والی کوئی گاڑی یا کسی بھی آتے جاتے شخص کو دیکھ کر کوئی بھی محلے دار کسی بھی قسم کی غلط بات کرنے کا سوچتا بھی نہیں تھا۔ پورا محلہ فرہاد سے متاثر رہا کرتا اس کا شمار محلے کی باعزت شخصیت میں ہوتا تھا۔



”آپا آپ کو ہم سے یہ بات کرنے سے پہلے ایک دفعہ سوچنا تو چاہیے تھا۔“

فرزانہ مامی نے برا سامنہ بنا کر ماما کی جانب دیکھا۔

”چلو اور کوئی نہ سہی پر ہم تو جانتے ہیں کہ ایصال ایک نکاح شدہ مرد ہے اور آج نہیں تو کل خیر سے ماشاء اللہ شادی شدہ بھی ہو جائے گا پھر ایسے میں آپ کس طرح اس گھر میں ایصال کا رشتہ لیے چلی آئی ہیں؟ مجھے تو یہ ہی اب تک سمجھ نہیں آیا کہ آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی اپنی اکلوتی بیٹی کا ہاتھ آپ کے بیٹے کے ہاتھ میں دے دیں گے اور محاف کیجئے گا آپا اگر وہ اکلوتی نہ بھی ہوتی تو بھی کون اس طرح اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کو دے گا۔ ہماری جگہ اگر آپ ہوتیں تو کیا اس طرح اپنی بیٹی کی شادی کے لیے ہاں کر دیتیں۔“

وہ انہیں ایک کے بعد ایک آنیہ دکھاتے ہوئے بولتی چلی گئیں جبکہ ان کے عین سامنے والے صوفے پر ماموں بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ اس طرح جیسے ماما بولتیں اور اس کے پاپا خاموش ہوتے۔ شاید ہر مرد بیوی کے سامنے یوں ہی خاموش ہو جاتا ہے بہر حال جو بھی تھا مامی کے الفاظ ماموں کی مرضی کے مطابق ادا ہو رہے تھے جس کا اندازہ اس کا چہرہ دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

ایصال نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر ایک نظر ماما پر ڈالی جو اسے ہی دیکھ رہی تھیں وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس کی ماں نے پہلے بھی اسے سمجھایا تھا کہ جب تک اپنے پاپا سے بات کر کے مسئلہ حل نہیں کر لیتے اس طرح ایشہ کے گھر نہیں جانا چاہیے مگر وہ نہیں مانتا۔

اک ساگر ہے زندگی

اسے ڈر تھا کہیں پاپا سے بات کرنے کے چکر میں زیادہ دیر نہ ہو جائے اور ایسا نہ ہو کہ ماموں شاہ زیب کے لیے ہاں کر دیں۔ اسی خوف کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ رات سونے سے قبل ہی انہیں یہاں اپنے ساتھ لے آیا تھا اور اب ایسے تھا جیسے اس کی ماں کے پاس کسی بات کا کوئی جواب ہی نہ ہو اسے محسوس ہوا جیسے وہ جنگ جو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی اسے شکست سے ہم کنار کر کے جلد ہی ختم ہونے والی ہے اور خاص طور پر اس وقت اگر آج وہ اپنے دفاع کی کوشش میں کچھ نہیں بولا مانو کچھ باقی نہیں بچے گا۔ یہ ہی سوچ کر اس نے ہمت کی اور ماما کی جگہ خود ماما کی ساری باتوں کا جواب دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔

”پلیز ماما جان آپ تو اس طرح بات نہ کریں آپ تو ہر ایک بات سے خوب اچھی طرح واقف ہیں، جانتی ہیں وہ نکاح میرے ماضی کی ایک تلخ یاد کے سوا کچھ نہیں، میرے نزدیک وہ بالکل بے حیثیت ہے میں اسے نہیں مانتا وہ اس وقت کی بات ہے جب میں نکاح کی اصل حقیقت سے بھی ناواقف تھا اور نہ شاید آج صورت حال خاصی تبدیل ہوئی۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو چکا آج یہاں ماما میری مرضی سے میرا رشتہ لے کر آئی ہیں اور یہ حق مجھے میرے مذہب نے دیا ہے کہ میں جسے چاہوں اسے اپنی زندگی کے لیے منتخب کروں چونکہ میں خود ایشہ کو پسند کرتا ہوں اس لیے اس کو اپنی شریک حیات کے طور پر اپنانا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس میں آپ میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے ماما کو جواب دینے کے ساتھ ساتھ ماموں پر بھی ایک نظر ڈالی جو اس ماحول سے بیکسر بے نیاز بنے بیٹھے تھے۔

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا مجھے تمہاری کسی بات سے کوئی اختلاف نہیں ہے مگر صرف اتنا سوچو کہ جب تک تم ایک رشتے کی ڈور سے بندھے ہو دوسرا کس طرح استوار کر دو گے یہ کوئی معمولی سی بات نہیں ہے جو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہی ہوں۔“

اس دفعہ ماما کی کہی ہوئی بات خاصی معقول تھی۔

”میں بہت پہلے ہی اس ڈور کو کاٹنے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور یہ بات ماما بہت اچھی طرح جانتی تھیں۔“

وہ مضبوط لہجے میں اپنی ماں کی جانب دیکھتا ہوا بولا۔

”اور یہ بات تو میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ایشال اس لڑکی کو جلد ہی طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہے پھر بھی تم نے بنا سوچے سمجھے اتنا سب کچھ کہہ ڈالا۔“

ایشال کی باتوں نے ماما کا حوصلہ بھی بڑھایا اور وہ ساتھ دینے کے لیے اس کے مد مقابل آن کھڑی ہوئیں۔

”تمہاری سب باتیں ٹھیک ہے مگر سچ یہ ہے کہ بھائی صاحب کئی بار باتوں ہی باتوں میں مجھے یہ بتلا چکے ہیں کہ وہ جلد ہی اپنی بیٹی کو بہو بنا کر اس گھر میں لانے والے ہیں۔ ابھی انہوں نے چند روز قبل ہی مجھے یہ بھی بتایا کہ ایشال کے واپس آتے ہی اس کی رخصتی کی تقریب منعقد کرنی ہے پھر بھلا بتاؤ ان تمام حالات میں جو کچھ تمہاری بھابی نے کہا کیا وہ غلط تھا؟“

ماموں نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا جن کی باتیں سن کر ایشال کو اندازہ ہوا کہ جس رشتہ کہ وہ دھاگے کی ایک معمولی ڈور سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، اس کے پاپا اسے دن بدن مضبوطی کی گرہیں لگا رہے ہیں۔ غصے سے اس کا دماغ سن سا ہو گیا۔

”ماموں میں نے ابھی ابھی یہ بات واضح کی کہ شادی مجھے کرنی ہے، پاپا کو نہیں اور میں ماشاء اللہ بالغ اور ہاشور ہوں اور اپنے فیصلے خود کر سکتا ہوں، اس لیے آپ سب بے کار باتیں چھوڑیں اور مجھے صرف یہ بتائیں کہ اگر میں پاپا کے ساتھ اس گھر میں آپ سے ایشہ کا ہاتھ مانگنے آؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔“

اک ساگر ہے زندگی

”ٹھیک ہے، اگر تم ایسا کر سکو تو یقیناً جانو مجھے تم سے بڑھ کر کوئی اور نہیں۔“

جاوید ماسوں نے غلوں دل سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے آپ شاہ زیب کو ایشہ کے رشتے سے انکار کر دیں۔“

”نی الحال ہم اسے انکار نہیں کریں گے، بلکہ کچھ ٹائم دے دیں گے، تاکہ اس وقت تک تم اپنے پاپا سے بات کر کے سب کچھ فائل کر لو۔“ مامی نے حتمی انداز میں کہتے ہوئے بات ختم کر دی، اب کوئی گنجائش باقی نہ بچی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے ساتھ ہی ماما بھی اٹھ گئیں۔

”ارے بیٹا بیٹھو تو سہی، اتنی بھی کیا جلدی ہے، آرام سے کھانا کھا کر جانا، ایشہ تیار کر داری ہی ہے۔“ انہیں کھڑا ہوتے دیکھ کر مامی جلدی سے بولیں۔

”نہیں آج تو نہیں، البتہ اب جب دوبارہ آیا پاپا کے ساتھ تو پھر ضرور کھا کر ہی جاؤں گا، آئیں ماما چلیں۔“ مامی کو جواب دینے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی ماما کو بھی پکارا، جو ماموں کے قریب کھڑی جانے آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہی تھیں۔ ایصال کے پکارتے ہی اپنی بات ختم کر کے وہ اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔



زندگی ہے یا کوئی طوفان

ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

”ہم کہہ نہیں سکتے کہ زندگی کے بارے میں میر درد کا یہ فلسفہ کس حد تک درست ہے، کیونکہ زندگی سب کی نظروں میں الگ الگ اہمیت رکھتی ہے۔ کہیں خوشی، کہیں غم، کہیں دھوپ، کہیں چھاؤں، موسم کے ہر بدلتے رنگ کا نام ہے زندگی، صحیح یا غلط ہے۔“

سرا عظم ہمدانی اتنا کہہ کر رک گئے۔ اپنے چشمہ کی اوٹ سے انہوں نے پوری کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

”یہ تو زندگی کے بارے میں میرا ایک چھوٹا سا نظریہ تھا۔ آپ سب کے نزدیک زندگی کیا ہے۔“

انہوں نے پوری کلاس پر ایک بار پھر نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

اسے سرا عظم ہمدانی کا اردو پڑھانے کا انداز خاصا پسند تھا۔ وہ اپنے لیکچر میں ساری کلاس کو ساتھ لے کر چلتے۔ اس وقت بھی پوری کلاس کو نہایت دلچسپی سے سر کی باتیں سنتے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل نہ تھا کہ تمام طلبہ ان کی کلاس میں مکمل دلچسپی کے ساتھ شریک ہیں۔

اگر آپ خوش ہیں تو زندگی بہار

اور اگر دکھی ہیں تو پھر ایک عذاب

جانے یہ کس کی آواز تھی، ابھی وہ پوری کلاس سے صحیح واقف نہیں ہوئی تھی، مگر جو کوئی بھی تھا اس کا پیش کردہ تجربہ سرا عظم ہمدانی کی طرح بالکل مکمل تھا۔

”میرا خیال ہے کہ سر زندگی ایک ایسا خواب ہے جس کے کبھی ختم نہ ہونے کی امید میں ہم پوری زندگی اپنی آنکھیں بند کر کے گزار دیتے ہیں۔“ اس کے برابر بیٹھی حصہ نے کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”اور میرا خیال ہے کہ سر کس حصہ کے برابر بھی ایک مکمل زندگی بیٹھی ہے۔“

ایک زوردار آواز اسے پیچھے سے سنائی دی، جس کے ساتھ ہی پوری کلاس ہنس دی۔
”بدتمیزی کوئی نہیں کرے گا۔“ سر نے مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے پوری کلاس کو تنبیہ کی۔
”جی سر ایک ایسی زندگی جس کے بعد موت لازمی امر ہے۔“

وہ اسے دیکھے بنا تیز آواز میں بولی اور اس سے پیشتر کہ وہ مزید کچھ کہتی حفظہ نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”کیوں ہر بات پر اتنی جلدی خفا ہو جاتی ہو، وہ غریب تو صرف مذاق کر رہا تھا۔“ کلاس ختم ہوتے ہی حصہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مجھے اس طرح کے فضول مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔“

اپنا بیگ کندھے پر ڈالے، نہایت سنجیدگی سے حصہ کو جواب دیتی وہ کلاس سے باہر نکل آئی۔ ”مگر یہ بات صرف میں جانتی ہوں کہ تمہیں مذاق پسند نہیں، تو پھر کیا ضرورت ہے، دو گھنٹے کی کلاس موڈ آف کر کے گزاری جائے اور تم خواجواہ ہی برا مان گئیں، ہو سکتا ہے اس نے یہ جملہ تمہارے لیے کہا ہی نہ ہو۔“ حصہ نے ہنستے ہوئے اس کا موڈ درست کرنے کی کوشش کی۔
”اچھا تو پھر کس کے لیے کہا ہو گا۔“

”شاید مرے دائیں ہاتھ پر بیٹھے تو قیر احمد کے لیے۔“ جواب کے ساتھ ہی وہ زور سے ہنس دی۔
”اچھا چلو اب بات ختم کر کے اپنا موڈ درست کرو اور جلدی سے کینٹین آ جاؤ میڈیم رخشندہ کا پیریڈ شروع ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو وہ بخٹی عورت لیٹ ہونے کی صورت میں غیر حاضری لگا دیتی ہیں۔“
اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اسے بازو سے پکڑ کر اسے ساتھ تھیلٹی وہ کینٹین کی جانب آگئی، جبکہ وہ بھی بنا کوئی جرح کیے چپ چاپ اس کے ساتھ ہوئی۔



”کیوں مارا ہے تم نے اسے۔“ وہ مریم کے بازو کو سختی سے اپنی گرفت میں لیتے ہوئے نہایت غصے سے بولی۔
”میں نے تو صرف اس کے گال پر پیار کیا تھا اور یہ رونے لگی۔“

ماں کو اس قدر غصے میں دیکھ کر وہ تھوڑا سا گھبرا گئی۔ مارے خوف کے اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ ذہنب نے اسے گھورتے ہوئے اس کا بازو چھوڑ دیا اور نیچے فرش پر بیٹھی روتی ہوئی جگنو کو جھک کر اپنی گود میں اٹھا لیا۔ جانے کیوں آج صبح سے ہی اس کے سر میں درد تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ بجائے کم ہونے کے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے اپنے اس درد کا ذکر صبح ناشتے کے وقت فرہاد کے سامنے بھی کیا تھا، جو بنا کوئی توجہ دیئے جلدی جلدی اپنا ناشتا ختم کر کے دکان پر چلا گیا۔ اسی باعث اب وہ بہت زیادہ چڑچڑی سی ہو رہی تھی۔ اوپر سے ٹیوشن کے لیے آئے بچوں نے بھی اسے خوب تھکا ڈالا تھا۔ دل تو چاہا سب کو چھٹی دے دے، مگر کیا کرتی تقریباً سب کے امتحان شروع ہونے والے تھے۔ اسی لیے انہیں یاد کرنے کا کام دے کر وہ کچن کی جانب آگئی۔ تاکہ ایک کپ چائے بنا کر پی سکے۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی درد کچھ کم ہو جائے۔ ابھی اس نے پتلی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھا ہی تھا کہ مریم دوڑی دوڑی کچن میں آگئی۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

”اماں باہر سالارا نکل آئے ہیں۔“

”سالارا نکل اس وقت.....“

اس نے حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان ہوتے ہوئے اپنے حلیے پر ایک نظر ڈالی۔ شلوار الگ رنگ کی اور قمیص کسی اور رنگ کی، وہ یک دم ہی شرمندہ سی ہو گئی۔

”اماں کیا کروں انہیں اندر بلاؤں یا نہیں۔“

اس کی طویل خاموشی سے تنگ آ کر منتظر کھڑی مریم نے خود سے ہی پوچھ لیا۔

”آں..... ہاں..... تم انہیں اندر برآمدے میں بٹھاؤ، میں اتنی دیر میں کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں۔“

وہ جلدی جلدی مریم کو ہدایت دیتے ہوئے، بسورتی جگنو کو کندھے سے لگائے اندر کمرے میں آگئی۔ الماری کھول کر سامنے ہی رکھا سوٹ نکلا اور ہاتھ روم میں گھس گئی۔ جتنی دیر میں اس نے کپڑے تبدیل کیے جگنو ہار پیٹھی رو، رو کر ہلکان ہوتی رہی، جانے کیوں وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی چاہتی تھی، ہر دم نینب اس کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ ذرا سا جو نینب یہاں وہاں ہوتی وہ رو، رو کر پورا گھر سر پر اٹھالیا کرتی۔ نینب کے لیے اس صورت حال میں گھر کا کام کرنا بھی خاصا مشکل ہو چکا تھا۔ باہر نکل کر اس نے جگنو کو گود میں لیا اور باہر برآمدے میں آئی جہاں سامنے ہی سالار بیٹھا تھا۔

”السلام علیکم!“ اسے دیکھتے ہی سالار نے خوشدلی سے سلام کیا۔

”وعلیک السلام!“ نینب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے سامنے رکھی پلاسٹک کی ٹیبل پر ایک نظر ڈالی۔ جہاں بہت سارا سامان رکھا تھا جو یقیناً سالار ہی لایا تھا۔

”آج آپ کیسے رستہ بھول گئے۔“ اب کے اس نے ہنستے ہوئے گلہ کیا۔

”میں تو یہ رستہ روز بھولنے کو تیار ہوں۔ بس ذرا دنیا والوں سے ڈر جاتا ہوں، خاص طور پر وہ دنیا جس میں آپ کی فضا بھابی بھی شامل ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے اس کے انداز میں اپنے دل کی ہر بات کہہ گیا۔

”اور سناؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

نینب کے سوتے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”پتا نہیں صبح سے سر میں نہایت ہی شدید قسم کا درد ہو رہا ہے۔ اوپر سے جگنو کو جانے کیا ہوا ہے، بلاوجہ تنگ کیے جا رہی ہے۔“ بات کرتے کرتے وہ تھوڑی سی رو ہانسی ہو گئی۔

”اپنی طبیعت کی خرابی میں بھی تم ان بچوں کو پڑھا رہی ہو۔“

وہ برآمدے میں بیٹھے چھوٹے بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے بولا۔

”کیا کروں ان سب کے ایگزامز قریب ہیں، ایسے میں چھٹی بھی نہیں دے سکتی۔“ جھکن کا عنصر اس کی آواز میں نمایاں

تھا۔

”لعنت مجھو یار..... کیوں یہ سب جھنجٹ اپنے گلے میں ڈالا ہے۔ فارغ کرو سب کو، اپنی حالت دیکھو کس قدر خراب

ہو رہی ہے۔ بلاوجہ چند سو روپوں کے لیے اپنی جان عذاب میں ڈالی ہوئی ہے۔“

سالار ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ چند سو روپے جو ٹیوشن کے نام پر اس کے پاس آتے تھے۔ ابھی تک وہ انہیں کسی خاص مصرف میں بھی نہ لاسکی تھی۔ وہ جیسے گھر میں ہی کہیں خرچ ہو جاتے۔ اسے پتا بھی نہ چلتا، سوائے اس کے کہ اگر کبھی بازار سے اپنے لیے کوئی اچھی چیز منگوا کر کھالی ہو۔ اتنے مہینوں میں وہ ان پیسوں سے صرف ایک سوٹ ہی بنا سکی تھی۔ الٹا جب سے وہ ٹیوشن پڑھا رہی تھی فرہاد جو جوڑے لاتا تھا، ابھی تک وہ بھی نہ لایا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی اس نے جب سردیوں کے لیے ایک شال

کی فرمائش کی تو فوراً ہی فرہاد نے حیرت سے پلٹ کر سوال کیا تھا۔
 ”تمہارے ٹیوشن کے پیسے کہاں جاتے ہیں، میں تو تم سے ایک روپیہ نہیں لیتا۔“
 ”مطلب.....؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”مطلب یہ کہ جب عورت خود کفیل ہو تو اسے کم از کم اپنے کپڑے تو خود بنا لینے چاہئیں۔“
 فرہاد کے جواب نے اسے سلگا دیا۔ آگ اس کے سر سے لے کر تلوؤں تک جا پہنچی اور اب سالار کی بات سنتے ہی اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا۔
 ”بس ان کے ایگزامز ختم ہو جائیں، پھر نہیں پڑھاؤں گی۔“ فوری طور پر اپنا فیصلہ اس نے سالار کو بھی سنا دیا۔
 ”گڈ..... تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے اور اگر اب درود زیادہ ہے تو آ جاؤ ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ وہ فکر مندی سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں ابھی فرہاد آ جائے تو اس کے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ اپنی شرمندگی اور خفت جھوٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔
 ”چلو جیسے تمہاری مرضی۔“ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”ارے آپ بیٹھے تو سہی، میں چائے بناتی ہوں۔“ اپنی باتوں میں اسے یاد ہی نہ رہا کہ سالار سے چائے یا پانی پوچھتی اسے احمق دیکھ کر وہ جی بھر کر شرمندہ ہوئی۔
 ”اس وقت تمہاری طبیعت خراب ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم آرام کرو، میں چائے پینے پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“
 ”اور ہاں.....“ وہ باہر نکلتے نکلتے رک گیا۔
 ”یہ نازیہ نے تمہارے لیے کچھ سامان بھیجا ہے۔“
 ”اچھا..... مگر یہ ہے کیا؟“ ڈیروں ڈھیر سامان دیکھ کر وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔
 ”پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا اور نہ ہی پوچھا، مجھے تو جیسے اس نے دیا، میں نے تمہیں پہنچا دیا اور اب تم خود دیکھ لو کہ اس میں کیا ہے۔“
 ”وہ تو ٹھیک ہے، مگر اس سب کی ضرورت کیا تھی۔“
 ”یہ بھی تم اس سے پوچھنا فی الحال میں چلتا ہوں، اللہ حافظ۔“
 ”اللہ حافظ۔“ وہ دھیرے سے کہتی اس کے پیچھے ہی باہر آ گئی۔ جب وہ داخلی گیٹ سے باہر جاتے جاتے رک گیا اور نمنب کے چہرے پر ایک بھرپور نظر ڈالتے ہوئے بولا۔
 ”اپنا خیال رکھا کرو، آج تمہارے چہرے پر چھائی تھکن مجھے بالکل اچھی نہیں لگی۔“
 اتنا کہہ کر وہ پھر نہیں رکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ سب کچھ جو وہ ہمیشہ فرہاد سے سنا چاہتی تھی۔ آج سالار کہہ گیا نمنب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے پلٹ کر برآمدے میں لگے چھوٹے سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا تو محسوس ہوا سالار نے جو کہا تھا وہ سو فیصد درست ہے۔ اسے یک دم ہی اپنا چہرہ تھکن زدہ محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگا جیسے چہرے کی ساری شادابی دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہو۔ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔
 ”کیا ضرورت تھی مجھے بلا وجہ یہ ٹیوشن کا کھٹ راگ پالنے کی، فضول کی درد سہی بس اب اگلے ماہ سے یہ سب ختم۔“
 حتیٰ طور پر فیصلہ کرتی وہ کچن میں آ گئی، تاکہ اپنے لیے چائے بنا سکے جب اچانک اسے باہر سے فرہاد کی آواز سنائی

دی۔

”ماں کہاں ہے تمہاری۔“ یقیناً اس کا یہ سوال مریم سے تھا۔ اگلے ہی پل وہ کچن کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔
”مجھے بھی ایک کپ چائے بنا دو۔“

”اچھا.....“ آہستہ سے کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”آج تم نے گھر کی صفائی نہیں کی، دیکھو سارا صحن گندا پڑا ہے۔“

وہ صفائی کے معاملے میں بھی خاصی مین میخ نکالنے کا عادی تھا۔

”میں نے صبح بتایا تھا تا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں تو ایک سر میں درد ہی تھا۔ ڈسپرین کھا لیتیں۔ ٹھیک ہو جاتا ہے، اب اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ سارا گھر ہی گندا

پڑا رہے۔ اوپر سے بچوں کو دیکھو کتنے گندے چلپے میں ہیں۔ خود کو دیکھو لگ رہا ہے کئی دنوں سے منہ ہی نہیں دھویا۔“

وہ جب بولتا اسی طرح بے لگان ہی بولتا۔

نہیب کا بالکل دل نہ چاہا کہ وہ اس کی کسی بھی بات کا جواب دے۔ اس نے خاموشی سے چائے میں دودھ ڈالا۔ فرہاد کی چائے کپ میں نکالی اور رے میں رکھ کر برآمدے میں آگئی، جبکہ وہ کپڑا ہاتھ میں لے کر برآمدے کے دروازے کی جالی جھاڑنے لگا۔

”لاؤ مجھے دو، میں صاف کر دیتی ہوں۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی نہیب نے اس کے ہاتھ سے کپڑا پکڑنے کی کوشش کی۔

”رہنے دو، اگر تمہیں صاف کرنا ہوتا تو یہ اتنی گندی ہی کیوں ہوتی، سمجھ نہیں آتا سارا دن کیا کرتی ہو، ایک یا سیمین آپا کا گھر ہے کبھی دیکھو جا کر کس قدر صاف ستھرا ہوتا ہے، کہیں فرش پر ایک ذرہ نظر نہیں آتا اور ایک ہمارا گھر ہے، گھر کے اندر داخل ہوتے ہی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے، ہر طرف مٹی ہی مٹی دکھائی دیتی ہے۔“

صرف ایک دن طبیعت کی خرابی کے باعث اسے اس قدر باتیں سننی پڑیں، اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ سر درد پھر سے بڑھ گیا۔ اپنی چائے وہیں کچن میں چھوڑ کر وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ کیونکہ وہ فرہاد کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی کچھ دیر بعد جب باہر نکلے گی وہ بالکل ایسے نارمل ہوگا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو، کتنا فرق تھا فرہاد اور سالار کے رویے میں، ہاتھ روم میں خود پر پانی ڈالتے وہ مسلسل یہ ہی ایک بات سوچتی رہی، بنا کسی کوشش کے اس نے کئی بار فرہاد کا موازنہ سالار سے کیا اور آج پھر اسے مقابلے میں سالار ہی بلند یوں پر دکھائی دیا۔



”بتا ہے کیا مجھے کبھی کبھی ایسی لگتا ہے۔ جیسے.....“ کرن نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنے سامنے بیٹھی حبیبہ پر ایک نظر

ڈالی۔

”جیسے کیا.....“ حبیبہ نے ملک شیک میں اسٹرا چلاتے ہوئے پوچھا۔

”جیسے یہ کہ.....“ وہ اپنی بات کہتے کہتے ایک بار پھر سے رک گئی۔

”کیا مصیبت ہے کرن، تمہیں جو کہنا ہے کہہ دو، کیوں اتنا سنس پھیلا رہی ہو۔“

اس نے شیک کا ایک سپ لیتے ہوئے کرن کو پیار سے لتاڑا۔

اک ساگر ہے زندگی

99

”تمہیں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ سرشاہ زین تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔“ آہستہ آہستہ وہ اپنی بات مکمل کرتی گئی۔ جسے سنتے ہی حبیبہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے اپنے ہونٹوں میں دبا اسٹرا باہر نکال کر کرن کو گھورتا شروع کر دیا۔

”کیا ہو گیا، اتنے غصے میں کیوں دیکھ رہی ہو۔“ کرن اسے دیکھتے ہوئے ہنسی۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا، جو منہ میں آتا ہے بولے چلی جاتی ہو، بنا سوچے سمجھے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں تمہیں کچھ پتا نہیں چلتا۔“

کرن کی بات سن کر اسے حقیقی معنوں میں شاک سا لگا۔

”سوری حبیبہ تمہیں اگر میری کوئی بات بری لگی ہو، مجھے تو جو محسوس ہوا میں نے تمہیں بتا دیا۔ اگر تم خود بھی شاہ زین کے رویے پر غور کرو گی تو تمہیں خود محسوس ہو گا جو میں نے کہا وہ کچھ ایسا بھی غلط نہیں ہے۔“

”بہر حال تمہارا تجزیہ نہایت ہی فضول ہے اور میرا خیال ہے تمہیں اس سلسلے میں کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ دوبارہ سے اپنے فیک کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“

کرن بات ختم کر کے اپنے سامنے رکھے زنگر میں مصروف ہو گئی، جب اچانک ٹیبل پر رکھا حبیبہ کا فون بج اٹھا اس نے اپنا سیل اٹھا کر دیکھا۔

”سوری میرے چچا کا فون ہے، میں ذرا بات کر کے آتی ہوں۔“

وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سیل کان سے لگائے ذرا سا آگے بڑھ گئی۔ کرن نے اسے پشت کی جانب سے دیکھا اور ایک بار پھر سے اپنے لپچ میں مصروف ہو گئی۔



”تم نے ابھی تک انکل سے بات نہیں کی؟“ وہ سوال جس سے وہ کئی دنوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک بار پھر سے اس جگہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

”نہیں یار..... آج کل وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ٹائم ہی نہیں مل رہا، میں سوچ رہا تھا کہ وہ خود مجھ سے شادی کے حوالے سے کوئی بات کریں۔ مگر.....“

”تم کبھی بھی ان سے بات نہیں کر سکتے۔“

اریشہ نے اس کی بات درمیان سے ہی کاٹ دی۔

”میرا خیال ہے کہ میں ہی کوئی بہت بڑی بے وقوف ہوں جو تمہارے پیچھے بلا وجہ ہی اپنا وقت ضائع کر رہی ہوں۔“

وہ کھانا درمیان میں ہی چھوڑ کر غصے سے اپنی کرسی پیچھے کھسکاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بہتر یہ ہے کہ میں بھی اب بنا سوچے سمجھے شاہ زیب کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں اور تم بھی اسی سے شادی کر لو، جسے آج سے کئی سال قبل تم نے اپنی منکوحہ ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔“

ٹیبل پر رکھا اپنا پیئڈ بیگ اٹھا کر وہ تیزی سے باہر کی جانب چل دی..... اس نے غصے سے خائف ایٹال کو جیسے اچانک ہی ہوش آ گیا اور وہ اس کے پیچھے لپکا۔

”ایک منٹ یار میری بات تو سنو، کیوں اتنا ناراض ہو رہی ہو۔“

اس کے قریب جا کر اس نے اریشہ کا بازو تھام کر اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”بازو چھوڑو میرا، مجھے گھر جانا ہے، پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔“
 وہ بدستور اپنے نروٹھے انداز میں منہ بناتے ہوئے بولی۔

”میں سوچ رہا تھا کہ پاپا مجھ سے خود شادی کی بات کریں تو میں انہیں صاف انکار کر دوں..... مگر جانے کیوں جب سے میں واپس آیا ہوں انہوں نے کبھی اس موضوع پر بات ہی نہیں کی، جبکہ میرے واپس آنے سے قبل تو انہیں اپنی بھتیجی کی رخصتی کی بہت فکر تھی۔ اب سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیوں خاموش ہیں اور میں کس طرح بات شروع کروں۔ بس اسی ادھیڑ بن میں ہوں اور تم ہو کہ بلاوجہ ہی ناراض ہو رہی ہو۔“

اریشہ کے ساتھ چلتا وہ ڈائمنگ ہال سے باہر نکل آیا۔
 ”جو بھی ہے ایصال اب میرے پاس تمہارے ان تمام ایکسکیوز کو سننے کا وقت نہیں رہا۔ اب مجھے صرف فیصلہ کرنا ہے کہ تم یا شاہ زیب تو بہتر ہوگا کہ تمہیں جو بھی کچھ کرنا ہے دو دن میں کر لو۔“
 ”دو دن میں.....“ وہ اس کی بات سمجھ نہ پایا۔

”ہاں آج جمعہ ہے، تم پیر تک انکل سے بات کر کے اگر انہیں میرے گھر لانے میں کامیاب ہو گئے تو ٹھیک، ورنہ اس کے بعد یہ سمجھنا کہ ہمارے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں، کیونکہ پیر کی رات تمہارے نہ آنے کی صورت میں، میں مانا کو شاہ زیب کے رشتے کے لیے ہاں کر دوں گی۔“ وہ اٹل لہجے میں اپنا فیصلہ سناتے ہوئے بولی۔
 ”صرف دو دن..... مگر اریشہ.....“

”اگر..... مگر کچھ نہیں، میں تمہارے پیچھے اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی۔“ وہ اپنے فیصلے پر برقرار تھی۔
 ”ٹھیک ہے۔“ ایصال نے ہار مان لی اور خاموشی سے اریشہ کے ساتھ چلتا باہر گیٹ کی جانب آ گیا، جہاں ڈرائیور اس کی گاڑی لیے کھڑا ان دونوں کا منتظر تھا۔



”شاہ زین!“

”جی ماما!“

اس نے لفٹ کا بٹن پریس کرتے ہوئے پلٹ کر اپنی ماں کی جانب دیکھا جو اسے پکارنے کے بعد جانے کس سوچ میں غرق ہو چکی تھیں۔

”ماما!“

ان کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر سے بول اٹھا۔

”آں..... ہاں.....“

وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونکیں۔

”آپ شاید مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔“

بات کرتے کرتے وہ دونوں لفٹ میں داخل ہو چکے تھے، ماما اپنے کسی کام سے آفس آئی تھیں جب واپسی میں شاہ زین بھی ان کے ساتھ ہوا۔

”وہ لڑکی جو ہمارے آفس میں کام کرتی ہے کیا نام ہے اس کا۔“
وہ کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے بولیں۔

”حبیبہ.....“

وہ سمجھ چکا تھا ماس کی بات کر رہی ہیں کیونکہ ابھی آفس سے باہر آتے ہوئے اس نے ماما کو حبیبہ کے کیمین کے دروازے کے پاس رک کر ایک ہلکی سی ترچھی نظر اندر ڈالتے دیکھ لیا تھا ہمیشہ کی طرح اسے ابھی بھی ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ماما اس سے کچھ خائف سی رہتی ہیں اس کی کیا وجہ تھی بہت سوچنے پر بھی وہ کبھی نہ جان پایا۔

”پورا نام.....“

وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں، شاہ زین کا اندازہ سو فیصد درست تھا وہ حبیبہ کی بات کر رہی تھیں۔

”مطلب؟“

وہ ان کی بات قطعی طور پر سمجھ نہیں پایا۔

”مطلب اس کا سر نیم وغیرہ کیا ہے؟“

”اوہ آئی تھنک حبیبہ خان۔“

وہ ان کے اس قدر تفتیشی انداز سے کچھ حیران سا ہوتے ہوئے بولا۔

”حبیبہ خان۔“

انہوں نے یہ نام زیر لب دہرایا اور ایک گہری سانس خارج کی، لفٹ رک چکی تھی وہ دونوں باہر نکل کر پارکنگ کی جانب آگئے جہاں ان کا بورڈی ڈرائیور گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا ان کا منتظر تھا۔

”دین محمد تم گاڑی لے جاؤ میں شاہ زین کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔“

ڈرائیور کو آہستہ آواز میں حکم دیتے ہوئے وہ شاہ زین کے ساتھ آگے بڑھ گئیں۔ شاہ زین نے فرنٹ ڈور کھول دیا وہ خاموشی سے اندر جا بیٹھیں۔

”تم اس کے والد کا نام جانتے ہو کیا ہے؟“

شاہ زین کے ڈرائیورنگ سیٹ سنبھالتے ہی وہ ایک بار پھر سے اپنے پسندیدہ موضوع پر آگئیں۔

”نہیں ماما میں نے کبھی پوچھا نہیں، مگر آپ یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟“

دل میں بار بار آنے والا یہ سوال بالآخر اس کی زباں پر بھی آ ہی گیا۔

”جانے کیوں اس کی شکل دیکھ کر میں ہمیشہ کئی سال پیچھے اپنے ماضی میں چلی جاتی ہوں۔“

وہ اتنا آہستہ آہستہ بولیں کہ شاہ زین بڑی مشکل سے سن پایا۔

”کبھی کبھی مجھے ایسا بھی لگتا ہے کہ میں اسے پہلے سے ہی جانتی ہوں حالانکہ یہ ناممکن ہے اور یقیناً مجھے کوئی بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے کیونکہ اگر میرا لگایا ہوا اندازہ ایک فیصد بھی درست ہوتا تو اس کے نام کے آخر میں خان نہیں ہونا چاہیے تھا میرا خیال ہے کہ یہ وہ نہیں ہے۔“

وہ بات کرتے کرتے رک گئیں۔

”آپ کس کی بات کر رہی ہیں ماما۔“

اک ساگر ہے زندگی

ان کے خاموش ہوتے ہی زین جلدی سے بول اٹھا وہ اپنی ماں کے تسلسل کو مسلسل برقرار رکھنا چاہتا تھا اسے لگتا تھا، جیسے ان کے دل میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو وہ چاہتے ہوئے بھی شاہ زین سے شہر نہیں کر پار ہیں۔
”مما آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

انہیں اپنے ہی خیالوں میں گم دیکھ کر وہ پھر سے ٹوک بیٹھا۔

”کچھ نہیں تم گاڑی دھیان سے چلاؤ، سامنے دیکھو کتنا بڑا ڈمپر آرہا ہے۔“

شاہ زین سمجھ گیا اب ان سے کچھ بھی کریدنا بے کار ہے کیونکہ وہ مزید اس موضوع پر کوئی بات اب نہیں کریں گی۔

”یقیناً مجھے کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، بہر حال تم جانے دو۔“

شاہ زین کے خاموش ہوتے ہی وہ آہستہ سے بولیں، شاہ زین ہنا کچھ جواب دیئے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔



”آئی۔“

”جی بچہ!“

”میری گریجویشن کی تقریب میں ملک انکل آرہے ہیں نا۔“

وہ ہنسنا شروع کیا ہیں سیکنڈ کے چہرے پر جماتے ہوئی بولی۔

”ظاہر ہے بیٹا ضرور آئیں گے اور یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتی ہو پھر کیوں پوچھ رہی ہو۔“ اس کے سوال نے سیکنڈ کو حیران سا کر دیا۔

”ہتا ہے آئی میرا دل چاہتا ہے کہ.....“

وہ اپنی بات کرتے کرتے جھجک کر رک گئی۔

”بولو بچہ کیا کہنا چاہتی ہو؟“

اسے خاموش دیکھ کر سیکنڈ نے فوراً ہی ٹوک دیا۔

”میں چاہتی ہوں کہ اس دفعہ جب انکل آئیں تو ایصال بھی ان کے ساتھ ہو، میں اس سے ملنا چاہتی ہوں آئی اسے دیکھنا چاہتی ہوں میں جانتا چاہتی ہوں کہ اتنے پرانے رشتے پر اس کے کیا تاثرات ہیں؟ آیا وہ مجھے قبول کرتا بھی ہے یا نہیں۔“

وہ بڑی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی خواہش کا اظہار کر بیٹھی جسے سنتے ہی سیکنڈ ایک پل کے لیے تو چپ سی ہو گئیں۔

”کیوں آئی میں نے کسی غلط خواہش کا اظہار کر دیا ہے؟“

سیکنڈ کی اس خاموشی سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر پائی۔

”نہیں بیٹا تمہاری خواہش بالکل جائز ہے اتنے سالوں میں کم از کم ایک دفعہ تو ملک صاحب کو تمہیں ایصال سے ملوانا چاہیے تھا، کسی ایک چھٹیوں میں تمہیں اپنے ساتھ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی اپنے گھر لے کر جاتے۔ مجھے تو حیرت ہے ایصال نہ سہی آج تک اس کی والدہ بھی کبھی تم سے نہ ملیں اور میں تو یہ خود کئی بار فضل دین سے کہہ چکی ہوں مگر جانے اس نے ملک صاحب سے کہا یا نہیں۔“

سکینہ کے دل میں دہی یہ تمام باتیں آہستہ آہستہ لبوں تک آہی گئیں۔
 ”بہر حال میں تمہارے چاچا تک تمہاری یہ خواہش ضرور پہنچا دوں گی اور کہوں گی کہ وہ ملک صاحب کو فون کر کے کہہ دے کہ تمہاری گریجویشن کی تقریب میں اپنے ساتھ ایصال کو ضرور لے کر آئیں ٹھیک ہے نا۔“
 سکینہ نے تصدیق طلب نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا، وہ اثبات میں ہلکا سا سر ہلا کر خاموش ہو گئی۔



”میرے ساتھ مارکیٹ چل رہی ہو؟“
 نازیہ کے اس سوال پر زینب نے ریسیور کان سے ہٹا کر ایک نظر سامنے موجود گھڑی پر ڈالی، جہاں تقریباً بارہ بجنے والے تھے۔

”کب تک جاتا ہے؟“
 اس نے دل ہی دل میں مریم کے سکول کی چھٹی کے ٹائم کا حساب لگاتے ہوئے پوچھا۔
 ”جب تم فارغ ہو بتا دو، میں تمہیں پک کر لوں گی۔“
 ”مریم کو سکول سے لے آؤں، پھر چلتے ہیں، بلکہ ایسا کرو تم مجھے تین بجے تک پک کر لینا میں تمہیں تیار ہی ملوں گی۔“
 ”شکریہ زینب.....“ وہ تشکر بھرے انداز میں بولی۔
 ”دراصل آج کل سالار کے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے اور میں کبھی اکیلی اس طرح شاپنگ کے لیے نہیں گئی اور آج کچھ ضروری سامان خریدنے کے لیے بازار جانا از حد ضروری ہے، اس لیے سوچا کیوں نہ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں اور مجھے امید ہے تمہارے ساتھ بڑے اطمینان سے اپنی شاپنگ مکمل کر لوں گی۔“
 نازیہ کی دی جانے والی وضاحت نے اسے کچھ شرمندہ سا کر دیا۔
 ”ارے اس میں اتنا شکریہ ادا کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ تم تین بجے تک آ جاؤ، میں ان شاء اللہ تمہیں تیار ہی ملوں گی۔“

دو بجے تک زینب اپنا تمام کام مکمل کر کے فارغ ہو چکی تھی۔ فرہاد کو دکان پر فون کر کے اس نے نازیہ کے ساتھ جانے کا بتا دیا۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا ورنہ وہ فوراً سے پیشتر منع کر دیتا۔ ٹیوشن کے بچوں کو بھی اس نے آج آنے کو منع کر دیا۔ اب وہ تیار ہو کر باہر آمدے میں بیٹھی نازیہ کی آمد کی منتظر تھی۔ پورے تین بجے نازیہ کی گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر اس نے جلدی سے جگنو کو گود میں اٹھایا اور مریم کی انگلی تھامے گھر کو لاک لگاتی ہوئی نازیہ کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی۔ اس کے بیٹھے ہی ڈرائیور نے بڑی سبک روئی سے گاڑی آگے کی جانب بڑھا دی۔



کرن اپنے نکاح کی خوشی میں سارے آفس کو ایک ٹریٹ دینا چاہتی تھی اور اسی سلسلے میں آج آفس آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ ایک قریبی ریستورنٹ کا بروشر بھی لے آئی۔ جس میں تفصیل کے ساتھ مینیو موجود تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے بروشر نکال کر جیبہ کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔
 ”یہ کیا ہے؟“

اپنے موبائل کو چار جنگ پر لگاتے ہوئے جیبہ نے پلٹ کر کرن سے سوال کیا۔ ”یہ ایک فوڈ بروشر ہے۔ تم ذرا چیک

کر کے میری مدد کرو اور مجھے بتاؤ کہ اپنے نکاح کی ٹریٹ کے سلسلے میں مجھے کیا آرڈر کرنا چاہیے۔“
 ”ارے اس قدر جھنجٹ پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ چپ چاپ آفس کی کینٹین سے ہی کچھ منگوا لو۔“
 بروڈر کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے حبیب نے اسے مخلصانہ مشورہ دیا۔
 ”تم اپنے نکاح کی ٹریٹ کینٹین سے آرڈر کر کے دے دینا۔ مجھے تو فی الحال اسی ریسٹورنٹ میں آرڈر کرنا ہے۔ کیونکہ میرا ارادہ سرشاہ زین کو بھی انوائٹ کرنے کا ہے۔“
 ”اچھا.....“

بنا کچھ کہے حبیب نے بروڈر ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے کے تاثرات بھی کچھ عجیب سے ہو گئے۔ کچھ دیر قبل والی جو ایک شرارتی مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی۔ وہ یکسر غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک عجیب سی کرخنگی نے لے لی۔

”تمہیں کیا میرا سرشاہ زین کو انوائٹ کرنا برا لگا ہے۔“
 اس کے چہرے کے تاثرات سے کرن نے فوری طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا۔
 ”نہیں بھلا مجھے کیوں برا لگے گا؟“
 اپنی دراز کھولے اس میں سے کچھ تلاش کرتے ہوئے الٹا اس نے کرن سے ہی سوال کر لیا۔
 ”پتا نہیں شاید مجھے ایسا لگا۔“

حبیب کا سوال سنتے ہی کرن کچھ بوکھلا سی گئی۔
 ”تمہیں غلط لگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“
 اس کے چہرے پر چھائی کچھ دیر قبل والی کرخنگی خاصی کم ہو چکی تھی۔
 ”اچھا تو پھر کیا میں انہیں انوائٹ کر لوں۔“
 ”یہ تمہارا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ تمہیں انوائٹ کرنا چاہیے تو ضرور کرو۔“
 ”اوکے..... تو پھر ٹھیک ہے، میں انہیں آج ہی انوائٹ کر لیتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ ضرور آئیں گے۔ کیونکہ وہ عادتوں میں بالکل اپنے والد جیسے ہی پُر غلوں اور محبت کرنے والے..... اور خدا نا خواستہ اپنی والدہ جیسے ہوتے تو جانے ہمارا کیا بنتا۔“

کرن ہنستے ہوئے مذاقاً بولی۔

”کیوں..... ان کی والدہ کیسی ہیں؟“

بظاہر حبیب کا انداز خاصا سرسری سا تھا۔

”بڑی خیرے والی خاتون ہیں تم شاید ابھی تک ان سے ملی بھی نہیں ہو؟“

”ملی تو نہیں..... البتہ انہیں ایک، دو بار آفس میں دیکھا ہے اور ویسے ایک بات کہوں.....“

بات کرتے کرتے یک دم اس نے رک کر کرن کی جانب دیکھا۔

”بعض دفعہ لوگ وہ ہوتے نہیں جو ہمیں دکھائی دیتے ہیں اس لیے کوشش کیا کرو کسی سے ہونے والی سرسری ملاقات میں اس کی شخصیت کے بارے میں غلط اندازے قائم مت کرو، کیونکہ بعد میں اپنے اندازے کی غلطی کا احساس ہمیں کافی حد

اک ساگر ہے زندگی

105

تک شرمندہ کر دیتا ہے اس وقت جب ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس شخص کے بارے میں سوچا جانے والا ہمارا خیال کس قدر غلط تھا۔

پتا نہیں وہ یہ بات کس کے لیے کہہ رہی تھی۔ شاہ زین اس کے والد یا والدہ کے لیے کرن سمجھ نہ پائی، مگر اس سے کچھ پوچھ کر وہ بحث کو طول نہ دینا چاہتی تھی۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“

اسے ہاتھ میں فائل تھا۔ باہر نکلتا دیکھ کر کرن نے سوال کیا۔

”ہمدانی صاحب کو یہ فائل دینی ہے۔“

آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ باہر نکل آئی۔ کرن نے اس کی پشت کی جانب دیکھا اور کندھے اچکا کر اپنا بردشریل سے اٹھاتے ہوئے خود بھی باہر نکل گئی۔

○.....◇.....○

اماں کو جانے کیا ہوا تھا بخار ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنے دنوں تک وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی تھیں اور یہ ہی بات اس کے لیے باعث تشویش تھی۔ کئی بار فاطمہ خالہ نے انہیں کھڑوالے ڈاکٹر سے دوائی بھی لا کر دی، مگر بخار تھا کہ بالکل ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ البتہ اس کی شدت میں کبھی کبھار کمی ضرور ہو جاتی تھی۔ اسی طرح پچھلے دو دنوں سے وہ کچھ بہتر تھیں۔ انہوں نے مشین رکھ کر اپنا کچھ سلائی کا کام بھی مکمل کیا۔ انہیں اس طرح کام کرتے دیکھ کر وہ خاصی مطمئن سی ہو گئی تھی۔ مگر آج پھر اچانک ہی انہیں رات سے دوبارہ بخار ہو گیا۔ جس کی شدت صبح تک کافی بڑھ گئی تھی۔ ان کی تمام دوائیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ رات میں تو بخار اتنا زیادہ نہیں تھا۔ مگر جو صبح اٹھ کر اس نے انہیں بے سدھ پڑے دیکھا تو یک دم گھبرا اٹھی۔ کچن میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ جبکہ اس کے پیٹ میں بھوک سے مل پڑ رہے تھے۔ ایسے میں اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس حال میں بیمار ماں کی فکر کرے یا اپنی۔

اپنی بھوک کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے صحن میں رکھے منکے سے پانی کا کٹورا بھرا اور ایک کپڑے کا ٹکڑا لیے ماں کی چار پائی کی جانب آئی۔ پہلے کٹورے کے پانی سے ان کے پاؤں دھوئے اور پھر ان کے سر ہانے جا کر بیٹھی، کپڑا اچھی طرح پانی میں بھگو کر نچوڑا اور ان کے ماتھے پر رکھ دیا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہ کر سکتی تھی۔ فاطمہ خالہ بھی دو دن قبل اپنی بیٹی سے ملنے فیصل آباد گئی تھیں۔ ابھی تک واپس نہ آئی تھیں، ورنہ وہ جا کر انہیں ہی بلا لاتی۔ آج اتوار کے سبب کھڑوالے ڈاکٹر کی دکان بھی یقیناً بند ہی تھی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ پانی کی پٹیاں کرے۔ شاید اسی طرح ان کا بخار کچھ کم ہو جائے۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی۔ جب ماں کے کراہنے کی ہلکی سی آواز اس کے کانوں سے نکل گئی۔

”ہائے.....“

اتنی دیر میں یہ پہلا لفظ تھا جو اس کی ماں کے لبوں سے ادا ہوا۔ ماں کی تکلیف نے اس کے دل کو دکھی کر دیا اور آنکھیں پانی سے لبالب بھر گئیں۔

”ہائے رہا.....“

نیکیے پر ادھر ادھر سر مارتے ہوئے انہوں نے اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاتھ

اک ساگر ہے زندگی

میں پکڑا کٹورا ساتھ والی ٹیبل پر دھرا۔ بھگم بھاگ پانی کا گلاس بھرے وہ ایک بار پھر ان کے قریب آن پہنچی۔
”اماں پانی پی لو.....“

ماں کے کندھے کو ہلکے سے ہلاتے ہوئے اس نے متوجہ کیا۔ اماں نے مارے نقاہت کے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے اس پر نظر ڈالی۔

”تم نے کچھ کھایا ہے؟“

اتنی بیماری اور تکلیف میں بھی اسے اگر کوئی احساس تھا تو وہ صرف اپنی بیٹی کی بھوک کا، جبکہ بھوک تو وہ خود بھی تھیں۔ اسے آج پتا چلا اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت کیوں رکھی ہے۔
”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

جب وہ بولی تو لہجہ گلوگیر سا ہو گیا۔ جس کا اندازہ خود اسے بھی نہ تھا۔ ”میرے بچے کے نیچے کچھ پیسے رکھے ہیں۔ وہ نکال کر بھائی فرید کی دکان سے چاول لے آؤ..... اور وہاں اپنے ناشتے کے لیے بھی کچھ لے آنا۔“

اس نے دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بچے کو ایک سائینڈ سے اونچا کر کے اندر ہاتھ ڈالا، کچھ مڑے تڑے نوٹ اس نے ہاتھ میں آگئے جنہیں لیے وہ خاموشی سے باہر آگئی کچھ دور موجود کریمان کی دکان سے مطلوبہ سامان خرید کر واپسی پلٹی ہی تھی کہ جانے کہاں سے ایک دم محلے کا ایک ادباش نوجوان اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اسے ایک دو بار وہ پہلے بھی سکول سے واپس آتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ چلتا دیکھ چکی تھی مگر اپنی غلط فہمی سمجھ کر اس نے کوئی توجہ نہ دی مگر اب ایک دم اس طرح اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبراسی گئی، اس کے ہاتھ پاؤں کانپ اٹھے چاہا کہ کترا کر سائینڈ سے نکل جائے، مگر وہ اس کی نیت بھانپتے ہی فوراً دوسری جانب ہو گیا۔

”ہو میرے آگے سے۔“

ایک کپکپاتی موٹی آواز اس کے حلق سے بمشکل نکلی۔

”یہ تم صبح کیا لینے نکلی ہو۔“

اس وقت جب وہ مارے خوف کے شاید بے ہوش ہی ہو جاتی کہ اچانک اسے اپنے عقب سے فاطمہ خالد کی بہو شبانہ باجی کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا سامنے موجود نوجوان شاید خطرہ بھانپ کر کھسک گیا تھا اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور شبانہ باجی کی جانب دیکھا جو اس کے جواب کی منتظر کھڑی تھیں۔

”ناشتا لینے آئی تھی۔“

آہستہ آواز میں جواب دیتی وہ ان کے ساتھ چل دی۔

”اور یہ شوکت تمہیں کیا کہہ رہا تھا۔“

”کون شوکت.....“

اس نے حیرت سے اپنی آنکھیں پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ ہی جو تمہارے پاس کھڑا تھا۔“

”اچھا اس کا نام شوکت ہے۔“

اسے آج پہلی بار اس نوجوان کا نام معلوم ہوا۔

”کہا تو کچھ نہیں مگر جانے کیوں میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔“
کچھ دیر قبل والی صورت حال کو ذہن میں لاتے ہی وہ گھبرا اٹھی۔
”بڑا ہی بد معاش لڑکا ہے۔“

شبانہ باجی نے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔
”تمہاری امی کہاں ہیں جو تم صبح صبح اکیلی دکان پر آتی ہو۔“
شبانہ باجی جانتی تھیں کہ وہ کبھی بھی اس طرح دکانوں پر سودا خریدنے نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولیں۔

”ان کی طبیعت خراب تھی اس لیے مجھے آنا پڑا۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
”طبیعت خراب تھی؟“ شبانہ کو مزید حیرت ہوئی۔
”مگر کل تک تو وہ ٹھیک تھیں ابھی کل شام ہی تو انہوں نے میرا سوٹ سی کر بھیجا تھا پھر اب کیا ہوا۔“
”پتا نہیں، رات سے ہلکا ہلکا بخار تھا جو دن چڑھتے ہی شدید ہو گیا۔“
وہ آنکھوں میں آنی نمی چھپانے کی کوشش میں سر جھکاتے ہوئے بولی۔
”اچھا مجھے تو پتا ہی نہ تھا اب ایسا کرو تم گھر جاؤ میں اپنے بچوں کو مدرسے سے واپس لا کر تمہاری طرف ہی آتی ہوں دیکھو تو سہی ذرا..... آپا کو کیا ہوا۔“

”جی اچھا.....“

وہ جواب دیتے ہوئے تیزی سے گھر کی جانب بڑھی تاکہ اندر جا کر اپنی بیمار ماں کا حال دیکھ سکے اور انہیں کچھ کھانے کو بھی دے جبکہ اس کی پشت پر کھڑی شبانہ اس وقت تک اسے دیکھے گئیں جب تک اس نے اندر داخل ہو کر لکڑی کے دروازے کی کنڈی نہ لگالی۔

”بے چاری بچی جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے، آج اگر بیمار ماں کو کچھ ہو گیا تو یہ غریب کہاں جائے گی۔“
اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی انہیں ایک جھرجھری سی آگئی۔

”اللہ معاف کرے میں کیسی گھٹیا بات سوچ بیٹھی خدا اس کی ماں کو لمبی عمر دے۔“
دل میں آتے اپنے ہی خیال پر وہ تیزی سے لعنت بھیجتی مدرسے کی طرف جانے والی گلی کی سمت بڑھ گئی۔



اریشہ کی دی ہوئی مدت ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے اور ایصال کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس طرح پاپا سے بات کرے۔ کہاں تو پہلے وہ ہر وقت ہی بہانے بہانے سے اس کی شادی کا ذکر کیا کرتے اور کہاں اب یہ حال ہے کہ بالکل ایسے خاموش تھے جیسے انہیں ایصال کا کروایا جانے والا نکاح بھی بھول گیا ہو جبکہ اب وہ خود چاہتا تھا کہ پاپا اس کے نکاح کا تذکرہ کریں اور وہ اپنے دل کی بات ان تک پہنچائے مگر اب تیزی سے گزرتے وقت کے ساتھ پاپا کی طویل خاموشی اسے بے چین کر رہی تھی۔

بہر حال جو بھی تھا یقیناً فیصلہ کا وقت قریب آ گیا تھا آنے والے چند گھنٹے اس کے لیے نہایت اہم تھے ان ہی گھنٹوں میں کیا جانے والا کوئی ایک فیصلہ اس کی پوری زندگی کو بدل دینے پر قادر تھا۔ وہ زندگی جس کے ایک طرف اریشہ اور دوسری

اک ساگر ہے زندگی

طرف سبز دوپٹے والی وہ لڑکی جس کا نام بھی آج تک وہ نہ جان پایا اور نہ ہی جانا چاہتا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ ایشہ کے ساتھ زندگی کی ہر خوشی اس کا مقدر بن جاتی جبکہ دوسری صورت میں سوائے ایک دردناک اذیت کے کچھ ہاتھ نہ آتا اور اس دردناک اذیت سے نجات پانے کا بہتر طریقہ یہ تھا کہ پاپا سے بات کر کے اپنا انکار ان تک پہنچائے تاکہ اس رشتے کو ختم کر کے وہ ایشہ سے اس کے رشتے کی بات شروع کریں اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اب وہ بنا کسی انتظار کے خود ہی ان سے بات کر لے۔ یہ خیال دل میں آتے ہی اس کی بے چینی کسی حد تک کم ہو گئی۔

”ٹھیک ہے اب جو بھی ہو پاپا کے گھر آتے ہی مناسب وقت دیکھ کر میں خود ہی ان سے بات کر لوں گا۔“
یہ حتمی خیال دل میں آتے ہی وہ مطمئن سا ہو گیا اب اسے انتظار تھا تو صرف پاپا کی آفس سے واپسی کا، وہ چاہتا تھا کہ پاپا کھانے کے بعد جب سٹڈی جائیں تو وہ بھی وہیں جا کر ان سے ہر بات کرے حالانکہ یہ ایک کافی مشکل امر تھا مگر جو بھی تھا اسے پایہ تکمیل تک تو پہنچانا تھا اس طرح خاموشی سے سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر طوفان کا اندازہ کرنے سے زیادہ اچھا تھا کہ طوفان آنے سے قبل ہی اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نکال لی جائے اور یقیناً ایشہ کی محبت اب اسے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔



وہ نازیہ کے ساتھ جیسے ہی سپر سٹور میں داخل ہوئی دنگ رہ گئی یہ وہ وقت تھا جب یورپی انداز سے بنے ایسے سپر سٹور پاکستان میں اکا دکا ہی متعارف ہوئے تھے اور جہاں تک صرف ایک مخصوص طبقہ ہی کی رسائی بھی عام آدمی کا ان پہلے ترین سپر سٹور اور شاپنگ مال میں جانا بھی ایک خواب تھا۔ اب جو زینب اندر داخل ہوئی تو وہاں ایک وسیع و عریض دنیا دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”اس طرف آ جاؤ مجھے کچھ کرا کری اور بیڈ شیٹس لینے ہیں۔“

نازیہ ایک خالی ٹرائل لیے اس کی طرف آتے ہوئے بولی، وہ بنا کچھ بولے خاموشی سے اس کے ساتھ ہوئی، نازیہ نے کچھ گلاس اور کپ اٹھا کر ٹرائل اور میں ڈالے پھر کچھ بیڈ شیٹس اور تولیہ کے پیکٹ بھی ٹرائل میں ڈال لیے، وہ خاموشی سے ہر طرف کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔
”تم بھی لے لو اگر کچھ چاہیے ہو تو.....“

اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے یک دم نازیہ نے اسے مخاطب کیا۔

”نہیں تمہارا شکریہ میرے گھر یہ سب سامان فرہاد خود لے کر آتا ہے۔“

اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

وہاں سے فارغ ہوتے ہی نازیہ دوسرے حصے کی جانب آ گئی، جہاں کھانے پینے کی اشیاء یہاں سے وہاں تک بھری پڑی تھیں، جتنو سونگتی تھی جسے نازیہ کی ملازمہ نے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا نازیہ نے کچھ جوس کے پیکٹ اٹھا کر ٹرائل میں رکھ لیے، وہ خاموشی سے سب اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے چل رہی تھی کہ اچانک ہی مریم نے قریبی ریک میں موجود چاکلیٹ کا بڑا سا پیکٹ اٹھا لیا۔

”اماں مجھے یہ لینا ہے۔“

ہاتھ میں پیکٹ تھامے وہ زینب کی جانب امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، اب زینب کی سمجھ میں نہ آیا کیا کرے وہ

یک دم ہی گھبرا سی گئی۔

”بدمی بات بیٹا واپس رکھو اسے۔“

اس نے جلدی سے مریم کے ہاتھ میں تھما پکٹ پکڑ لیا۔

”افوہ کیا کر رہی ہو نینب رکھو اسے ٹرائی میں۔“

نازیہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر وہ پکٹ واپس اٹھا لیا نینب شرمندہ سی ہو گئی۔

”لینے دو مریم کو جو بھی لینا ہے پلیز تم اسے مت ٹوکو۔“

نینب کا دل چاہا اپنے قریب کھڑی مریم کو ایک زوردار تھپڑ رسید کرے مگر جانے کیسے اس نے اپنی اس خواہش کو دبا

لیا۔

”آؤ بیٹا میرے ساتھ تمہیں جو لینا ہے لے لو۔“

نازیہ مریم کا ہاتھ تھامے آگے بڑھ گئی۔

”دوبارہ اگر کبھی نازیہ کے ساتھ آنا پڑا تو مریم کو کبھی نہیں لاؤں گی، مجھے تو اس نے آج ذلیل ہی کر دیا۔“

دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے پکا عہد کر لیا۔

”آگے آؤ نینب وہاں اکیلی کیوں کھڑی ہوں۔“ اسے اپنی جگہ پر ساکت دیکھ کر، نازیہ نے پکارا۔

”آ رہی ہوں۔“

نازیہ کو جواب دے کر وہ تیزی سے اس سمت بڑھ گئی جس طرف نازیہ جا رہی تھی وہاں یقیناً کاؤنٹر تھا جہاں مل جمع کروا

کر اپنا تمام سامان وصول کرنے کے بعد انہوں نے باہر نکل جانا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ نازیہ نے مریم کے لیے مزید کیا کیا

لے لیا ہے مگر گھر پہنچتے ہی جو نازیہ نے ایک بڑا سا پلاسٹک کا بیگ اس کے حوالے کیا تو وہ مزید شرمندہ ہو گئی۔

”کیا ضرورت تھی نازیہ سب کچھ لینے کی۔“

شاہر ہاتھ میں تھامتے ہوئے وہ کچھ جھجکی۔

”میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں لیا یہ سب سامان میری بیٹی کا ہے اور ہاں خبردار میرے جانے کے بعد اب اسے کچھ

مت کہنا۔“

شاید وہ نینب کے دلی خیالات بھانپ چکی تھی۔

نینب نے خاموشی سے شاہر لے لیا، یہ پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا اس سے پہلے بھی نازیہ اور سالار اکثر و بیشتر اسے قیمتی

تحائف دیتے رہے تھے مگر اس کے لیے زیادہ شرمندگی کا باعث مریم کی سنور میں کی جانے والی حرکت تھی۔ اسے محسوس ہوا

کہیں نازیہ یہ نہ سوچے کہ میرے ہی ایما پر مریم نے یہ حرکت کی ہو اور یہی سوچ اسے بار بار شرمندہ کر رہی تھی جب کہ جانتی

تھی کہ نازیہ اتنی چھوٹی سوچ رکھنے والی عورت نہیں ہے۔

”بہر حال اب جو بھی ہو آئندہ میں نے کبھی بھی مریم کو اپنے ساتھ نہیں لے کر جانا۔“

مریم کو تیزی سے چاکلیٹ کا پکٹ کھولتے ہوئے دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں کیے جانے والے اپنے سابقہ فیصلے کو

ایک بار پھر دہرایا اور کچھ مطمئن سی ہو گئی۔



اک ساگر ہے زندگی

شاہ زین جیسے ہی اپنے آفس کے ہال میں داخل ہوا دروازے کے قریب ہی ٹھک کر رک گیا۔ کرن نے اپنے نکاح کی خوشی میں رکھی جانے والی اس چھوٹی سی تقریب کے حوالے سے ہال کو خاصا اچھا ڈیکوریٹ کر رکھا تھا، اس نے ستائشی انداز میں یہاں سے وہاں تک ایک نظر دوڑائی۔ اس سیکشن کے تمام ہی لوگ ہال میں موجود تھے سوائے ایک ہستی کے جس کی خاطر آج وہ بڑے تکسک سے تیار ہو کر آیا تھا، جیبہ پورے ہال میں کہیں موجود نہ تھی۔

”کہیں وہ آج پھر اپنے گاؤں نہ چلی گئی ہو۔“

یہ خیال دل میں آتے ہی وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔

”ارے سر اندرائیں نا آپ یہاں کیوں رک گئے۔“

اسے ہال کے دروازے کے قریب پریشان سی کیفیت میں گھرا دیکھ کر کرن تیزی سے اس کی جانب آئی۔

”دیکھ رہا تھا آج تو یہ ہال ہمارے آفس کا حصہ ہی نہیں لگ رہا۔“ اس نے بڑے دل سے ہال کی سجاوٹ کو سراہا۔

”یہ سب جیبہ کا کمال ہے دراصل اکاؤنٹینٹ کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی انٹیریئر ڈیکوریٹر بھی ہے اور آپ کی طرح اس کی یہ صلاحیت مجھ پر بھی آج ہی آشکار ہوئی ہے۔“

شاہ زین کی حیرت کو بھانپتے ہی وہ ہنس دی۔

”اچھا ویسے آپس کی بات ہے میں تو آج تک اسے ایک خشک مزاج سی اکاؤنٹینٹ ہی سمجھتا رہا۔“

شاہ زین نے ہنستے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کبے اس کی جانب بڑھایا۔

”تھینک یوسر۔“

کرن نے اس کے ہاتھ سے پھولوں کا بکے تھا ماہی تھا کہ یک دم اس کی نگاہ اپنے کیمین سے باہر نکلتی جیبہ پر پڑی۔ سلک کی بلیک پرنٹڈ لانگ شرٹ کے ساتھ وہ ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی یا شاید ہرگزرتے دن کے ساتھ شاہ زین کی بڑھتی ہوئی محبت نے اس کے دیکھنے کا انداز بھی تبدیل کر دیا تھا۔ ہرگزرتے دن اسے محسوس ہوتا جیبہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوتی جا رہی ہے وہ ابھی بھی اپنی جگہ مبہوت سا کھڑا اسے نکتے گیا جب اچانک کرن کی آواز اس کے کانوں سے نکرائی۔

”ایسا محسوس ہو رہا ہے سر جیسے آپ دونوں نے یہ بلیک ٹکرایک دوسرے کے ساتھ باہمی مشورے سے پہنا ہے۔“

وہ شاہ زین پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شرارتا مسکرائی۔

”کاش ایسا ہی ہوتا مگر آپ جانتی ہیں کہ یہ سب خام خیالی ہے آپ کی دوست کو اگر ذرا بھی علم ہوتا کہ میں آج بلیک ٹکرایک کر آ رہا ہوں تو وہ کبھی بھی یہ سوٹ نہ پہنتی اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔“

شاہ زین کی بات بالکل درست تھی، جواباً کرن ہلکا سا مسکرائی اور اسے اپنے ساتھ لیے ٹیبل کی جانب آگئی جہاں تقریباً تمام لوگ اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پلیز آپ لوگ تشریف رکھیں مجھے اس طرح کا پروٹوکول بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“

ان سب کو مخاطب کرتے ہی وہ جیبہ کے ساتھ موجود خالی کرسی پر بیٹھ گیا جو اسے قطعی نظر انداز کیے اپنے ہینڈ بیک میں ہاتھ ڈالے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

”السلام علیکم کیسی ہیں آپ.....“

شاہ زین نے اپنی شرٹ کا کالر درست کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

”ویسی ہی ہوں سر جیسی آپ کو نظر آ رہی ہوں۔“

بیک کی زپ بند کرتے ہوئے وہ سیدھی ہو گئی۔

”مجھے تو خاصی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔“ وہ شرارتاً ہنسا۔

”دکھائی نہیں دے رہی میں ہوں ہی خوبصورت۔“

اپنی خوبصورتی پر اترا تے ہوئے اس نے بالوں کو ہلکے سے جھٹکے سے پیچھے کیا۔

”یقیناً اس میں کوئی شک نہیں تم واقعی بے حد خوبصورت ہو۔“

اس دفعہ بڑی سنجیدگی سے اس نے حبیبہ کی خوبصورتی کو سراہا۔

”ہنا نہیں کیوں سر، مجھے کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مرد کے نزدیک عورت کی سب سے بڑی خوبی صرف اور صرف

اس کی خوبصورتی ہے اگر اس خوبصورتی کو عورت کی ذات سے علیحدہ کر دیا جائے تو شاید پھر اس کے پاس کچھ باقی نہیں بچتا

جس سے وہ مرد کے دل پر راج کر سکے..... صحیح کہہ رہی ہوں نا میں۔“

اپنی بات ختم کر کے اس نے شاہ زین سے تصدیق طلب کی۔

”اصل میں حبیبہ خوبصورتی دیکھنے والے کی اپنی نگاہ میں ہوتی ہے اگر ہمیں کسی سے محبت ہو جائے تو دنیا کی بد صورت

چیز بھی حسین ترین دکھائی دیتی ہے اور جو محبت نہ ہو تو زمانے بھر کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر انسان کے نزدیک

خوبصورتی کا اپنا اپنا معیار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے تم جو مجھے بے حد خوبصورت دکھائی دیتی ہو کسی دوسرے شخص کی نگاہ میں تمہاری

خوبصورتی کوئی معنی ہی نہ رکھتی ہو اس کے نزدیک خوبصورتی کا وہ معیار ہی نہ ہو جو میرا ہے صحیح یا غلط۔“

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں سر اور میرا خیال ہے یہ بات مجھ سے زیادہ اچھی طرح کوئی اور نہیں جان سکتا کیونکہ آپ نے تو

شاید کسی کتاب میں یہ سب پڑھا ہو مگر میرا اپنا تو یہ ذاتی تجربہ ہے۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر سے اپنے ہینڈ بیک کی زپ کھول کر کچھ تلاش کرنے لگی۔

”تمہارا ذاتی تجربہ.....“ شاہ زین تھوڑا سا حیران ہوا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔“

”کچھ نہیں سرویے ہی مذاق کر رہی تھی۔“

جانے جو کچھ اس نے کہا واقعی مذاق تھا یا اس نے بات بدل دی تھی شاہ زین کچھ سمجھ نہ پایا۔

”ایک بات پوچھوں حبیبہ۔“

وہ اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

”جی ضرور پوچھیں۔“

حبیبہ اپنا ہینڈ بیک بند کر کے ایک بار پھر سے سیدھی ہو بیٹھی۔

”تم شاید گاؤں اپنے چچا سے ملنے جاتی ہو؟“

”جی اور یہ بات تو آفس میں تقریباً تمام لوگ ہی جانتے ہیں۔“

حبیبہ شاہ زین کی باندھی جانے والی تہید سمجھ نہ سکی۔

”تمہارے والدین حیات نہیں ہیں؟“

وہ اپنی ماں کی اس دن والی باتوں کے باعث خاصا الجھا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ حبیبہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ بنیادی معلومات ضرور حاصل کر لے تاکہ آئندہ اپنی مہم سے ہونے والی گفتگو میں حبیبہ کی ذات کے حوالے سے ان کی تشویش کو دور کر سکے۔

”نہیں.....“

وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گئی۔

”کوئی بہن بھائی.....“

شاید آج شاہ زین اس کی شخصیت کے تمام اسرار جان لینا چاہتا تھا۔

”ایک بہن ہے سرگرم وہ یہاں پاکستان میں نہیں ہوتی۔“

اتنا کہتے ہی وہ کرسی کھسکاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایکسکیزومی سر مجھے کرن بلارہی ہے۔“

”اوکے.....“ شاہ زین نے جواب دے کر آگے کی طرف بڑھتی حبیبہ پر ایک نظر ڈالی۔

”افوہ اس کے والد کا نام تو میں نے پھر نہیں پوچھا۔ یہ ہی تو وہ سوال تھا جسے جاننے کے لیے مہم کچھ بے چین سی تھیں اور

یہ ہی میں بھول گیا۔“ یہ خیال ذہن میں آتے ہی اسے افسوس ہوا آج پہلی بار حبیبہ نے اس سے اتنی ساری باتیں کیں اور پھر

بھی جو وہ پوچھنا چاہتا تھا وہ پوچھ نہ پایا۔ ”چلو پھر کبھی سہی اب جب بھی میری اس سے تفصیلی بات ہوئی یہ بھی پوچھ ہی لوں گا۔“

ویسے بھی حبیبہ کے حوالے سے جو کچھ وہ دل میں ٹھانے بیٹھا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہ تمام ضروری معلومات

حاصل کر لے تاکہ بعد میں اپنی مہم کو آسانی سے مطمئن کر سکے۔



شبانہ باجی آئیں تو اپنے ساتھ کڑوا لے ڈاکٹر کو بھی لیتی آئیں۔

”تم یہ ناشتا کرو اتنی دیر میں ڈاکٹر صاحب تمہاری امی کا ذرا اچھا سا معائنہ کر لیں۔“

وہ اپنی ماں کے سرہانے بیٹھی ان کے ماتھے پر ہنسیاں رکھ رہی تھی جب شبانہ باجی نے اس کے قریب آ کر اسے بازو سے

پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اس نے ان کے ہاتھوں سے ناشتے کی ٹرے پکڑ کر قریب ہی موجود چھوٹی سی ٹیبل پر رکھ دی۔ اپنی ماں کو اس

حال میں دیکھ کر اس کی بھوک پیاس بالکل ختم ہو چکی تھی وہ وہیں اپنی ماں کے قریب ہی کھڑی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ گئی جو اس

کی ماں کا نہایت تفصیل سے معائنہ کر رہے تھے۔ پہلے سینہ پر اسٹیتھسکوپ رکھا، پھر پیچھے کمر پر لگایا، زبردستی انگوٹھے کی مدد سے

ان کی آنکھیں کھول کر اندر جھانکا اور پھر ایک پرچے پر کچھ لکھ کر وہ پرچہ شبانہ باجی کی جانب بڑھا۔

”یہ کچھ ٹیسٹ لکھ کر دے رہا ہوں میرا خیال ہے کہ آپ پہلی فرصت میں ہی کر دالیں۔“

”یہ کس چیز کے ٹیسٹ ہیں ڈاکٹر صاحب۔“ وہ فوراً ہی گھبرا کر بول اٹھی۔

”کچھ خاص نہیں ہیں، آپ گھبرا نہیں مت۔“

ڈاکٹر اس کے چہرے پر چھائی گھبراہٹ بھانپتے ہوئے بولے پھر انہوں نے اپنا بیگ بند کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پہلی فرصت میں تو آپ یہ سامنے والی کھڑکی کھولیں تاکہ تازہ ہوا اور کچھ دھوپ اندر آئے بہت جلد ہے اس کمرے

میں، اور ان کے لیے یہ جس بھی کافی نقصان دہ ہے۔“

ڈاکٹر نے چاروں طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے ہدایت جاری کی وہ اپنی جگہ بالکل خاموش کھڑی رہی شبانہ باجی نے آگے بڑھ کر باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی کھول دی جس کے ساتھ ہی باہر کھیلنے بچوں کا شور تیزی سے اندر کمرے میں داخل ہو گیا یہ ہی وہ سبب تھا جس کے باعث وہ ہمیشہ اس کھڑکی کو بند رکھتی تھی کیونکہ اسے شور و غل کی یہ آوازیں خاصی نا پسند تھیں مگر آج اس پر اس شور شرابے کا بالکل اثر نہ ہوا وہ دوبارہ اپنی ماں کی چار پائی پر بیٹھ گئی۔

”آپ پہلے یہ تمام ٹیسٹ مکمل کروالیں تاکہ اس کے بعد میں صحیح طریقے سے ان کا علاج شروع کر سکوں یہ گولیاں ہیں انہیں کچھ کھلانے کے بعد دے دیجیے گا۔“

پر جی کے بعد انہوں نے ہاتھ میں تھامی گولیوں کا چھوٹا سا پیکیٹ بھی شبانہ باجی کی طرف بڑھایا جو انہوں نے ایک بار پھر خاموشی سے تمام کمرے کے تنکے کے قریب ہی رکھ دیا، شبانہ باجی ڈاکٹر کو دروازے تک چھوڑ کر واپس آئیں تو ایک نظر اس پر ڈالی جو اپنی ماں کے قریب بیٹھی رو رہی تھی۔

”تم یہ ناشتا کرو۔“ اس کی دیگر گول دیکھ کر انہیں بے حد دکھ ہوا۔
”پانی.....“

ماں کی نفاہت زدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکراتے ہی اس کے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بھاگ کر باہر صحن میں رکھے کولر سے پانی کا ایک گلاس بھر لائی، ماں کے لبوں سے لگایا جسے وہ غٹا غٹ پی گئیں۔
”آپ کیسی طبیعت ہے اب تمہاری۔“

اماں کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر شبانہ باجی چار پائی کے قریب رکھی واحد کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔
جواباً اماں نے نفی میں سر ہلایا، مارے نفاہت کے ان کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔

”اللہ تمہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔“ اماں کے ماتھے کو چھوتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے کہا۔
”آمین.....!“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

”ایک مشورہ دوں آپ پر امت ماننا۔“

جانے کیا سوچ کر شبانہ باجی ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ اماں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

”جیسے ہی تمہاری طبیعت کچھ بہتر ہو اپنے پچھلے لوگوں کو بتاؤ کہ تم کہاں ہو اور کس حال میں ہو بے شک تم سے ان کا ہر رشتہ ختم ہو گیا ہو گا مگر یہ سچی تو ان ہی کی ہے نا، ایسا نہ ہو یہ تمہارے بعد بالکل تمہارے جائے۔ تم تو جانتی ہو زمانہ بہت خراب ہے اپنوں کے ساتھ دھوپ بھی چھاؤں جیسی ہوتی ہے اور اگر کوئی اپنا ساتھ نہ ہو تو چھاؤں بھی اندھیرے کے خوف سے ڈرتی ہے، موت تو برحق ہے آپ کسی بھی وقت آسکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم سے پہلے مجھے آجائے کوئی پتا نہیں مگر آئی تو ضرور ہے اس لیے کہتی ہوں اس سچی کا اپنی زندگی میں ہی کچھ انتظام کر لو۔“

اماں آنکھیں بند کیے خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھیں جس کا بخوبی اندازہ ان کی آنکھوں کے کنارے سے بہتے پانی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا وہ یقیناً رو رہی تھیں ٹائپ ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو تنکے کو بھگوتے جا رہے تھے۔
”اماں.....“

وہ بے اختیار اپنی ماں کا کندھا ہلاتی تھی۔

اک ساگر ہے زندگی

”آپاٹھ کر بیٹھو تھوڑی سی ہمت کر کے کچھ کھا لو پھر میں تمہیں دوائی کھلا کر اپنے گھر جاؤں۔“
شبانہ باجی اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

”چائے تو بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے لاؤ میں گرم کر لاؤں، تم اتنی دیر میں اپنی ماں کا ہاتھ منہ دھلو اور۔“
برتن ہاتھ میں لیے وہ باہر نکلتے ہوئے بولیں، اور پھر ڈاکٹر صاحب کی دی ہوئی دوا اور انجکشن کی بدولت شام تک ماں کی حالت کافی سنبھل گئی۔ ان کے بخار کی کم ہوتی شدت نے اسے خاصا مطمئن سا کر دیا اور صبح تک ماں کا بخار کافی کم ہو گیا۔



نازیہ کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب تھی، یہی سبب تھا جو زینب آج اس سے ملنے اس کے گھر چلی آئی، گھنٹی بجاتے ہی گیٹ نازیہ کی خاص ملازمہ سیکینہ نے کھولا جو زینب کو اپنے سامنے موجود پا کر یک دم ہی کھل اٹھی۔
”السلام علیکم بی بی جی۔“

گیٹ کھول کر ایک سائیڈ پر ہوتے ہوئے سیکینہ نے اسے راستہ دیا سیکینہ کی تقلید میں وہ اندر داخل ہوئی، پورے گھر پر طاری سناٹے سے یک دم ہی اس کا دل ہول اٹھا۔ بے شک نازیہ اس گھر میں اپنے ملازمین کے ہمراہ اکیلی ہی رہتی تھی مگر اس سے پیشتر جب بھی کبھی زینب آئی وہ اسے ہمیشہ لاؤنج یا کچن میں ہنسی بولتی ملتی، ٹی وی یا ڈیک کی تیز آواز اور میوزک گھر کے سناٹے پر غالب رہتا مگر آج تو ہر طرف ایک عجیب سی خاموشی کا راج تھا جس نے زینب کو بھی بوکھلا دیا اور وہ ایک دم ہی بول اٹھی۔

”نازیہ کہاں ہے؟“

”وہ تو جی اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں انہوں نے آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔“ اس دفعہ جواب دیتے ہوئے ملازمہ کی آواز میں ایک اداسی سی گل گئی جس میں چھپی نازیہ کی محبت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔
”اچھا.....“

مزید کوئی بات کیے بنا وہ تیزی سے آگے بڑھی، لاؤنج عبور کر کے اوپر جانے والی سیڑھیاں تیزی سے پار کرتی وہ بالکل سامنے نظر آنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ اس تمام عمل کے دوران جگنو آنکھیں موندے اس کے کندھے سے لگی رہی یہ ہی سبب تھا جو نازیہ کے روم میں داخل ہونے تک اس کی سانس بے ترتیب ہو چکی تھی۔ اس نے دھیرے سے دروازہ کھولا سامنے بیڈ پر موجود نازیہ کو دیکھتے ہی وہ حق دق رہ گئی نازیہ اپنے بستر پر بالکل بے سدھ پڑی تھی، زینب کے پیچھے پیچھے سیکینہ بھی اندر داخل ہو گئی اور سوئی ہوئی جگنو کو زینب کی گود سے لے لیا، وہ تیزی سے نازیہ کی سمت بڑھی۔
”نازیہ..... نازیہ.....“

قریب جا کر اس کا کندھا چھوتے ہوئے زینب نے پکارا۔

”ہاں.....“ بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے وہ سیدھی ہوئی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“

اس کی اس قدر محدود حالت دیکھ کر زینب قدرے گھبرا سی گئی۔

”کچھ نہیں شاید نوڈ پوائزن ہو گیا ہے رات سے کچھ ہضم ہی نہیں ہو رہا جو کھاتی ہوں وہ نکل جاتا ہے، اس قدر اٹلیاں ہو رہی ہیں کہ پانی کا ایک گھونٹ حلق سے اترنا بھی کسی عذاب سے کم محسوس نہیں ہو رہا۔“

اک ساگر ہے زعدگی

115

”اوہ یہ تو اچھی بات ہے۔“ دل ہی دل میں قیاس آرائی کرتی نینب خوش ہو اٹھی۔

”جانتی ہو، مریم اور جگنو دونوں کی دفعہ میری حالت بھی قدر خراب تھی۔“

”مطلب؟ میں کچھ بھی نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ نازیہ نے اٹھ کر جیکے سے ٹیک لگاتے ہوئے ناسمجھی کے عالم میں نینب کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”مطلب یہ کہ تم ماں بننے والی ہو۔“ بنا کچھ جانے، بنا کچھ پوچھے نینب نے اپنے لگائے گئے اندازے کی خود ہی تصدیق بھی کر دی۔

”اچھا.....“

نازیہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”تم ڈاکٹر کے پاس نہیں گئیں؟“ نینب نے تیزی سے سوال کیا۔

”جگنی تھی اس نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے ہیں جو آج ہوں گے پھر رپورٹس آئیں گی تو پتا چلے گا اصل مسئلہ کیا ہے کیونکہ میں تو اس تکلیف سے اب تھک گئی ہوں جانے کیا سبب ہے جو بخار ختم ہونے میں بھی نہیں آ رہا۔“

”تھکن نازیہ کے لہجے سے عیاں تھی۔“

”ان شاء اللہ تمہارے لیے ضرور کوئی خوش خبری آنے والی ہے، تم مٹھائی تیار رکھو۔“ نینب اسے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

”اللہ کرے.....“

جانے کیوں نازیہ کے لہجہ میں کچھ بے یقینی سی تھی جسے اپنے خیالوں میں ڈوبی نینب نے محسوس ہی نہیں کیا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے اتنی جلدی ابھی تو سیکہ نہ تمہارے لیے کھانا تیار کر رہی ہے۔“

نازیہ اسے اس قدر جلد واپسی کے لیے تیار دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”دراصل مریم سکول ہے مجھے اسے واپس لیتے ہوئے گھر جانا ہے اس کی چھٹی ہونے میں ایک گھنٹہ رہ گیا ہے اور تقریباً اتنا ہی وقت مجھے یہاں سے اس کے سکول جانے میں لگے گا پھر کسی دن آؤں گی اور تمہارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں گی۔“

نینب نے نازیہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے بڑی محبت سے جواب دیا۔

”رک جاؤ میں خان بابا سے کہتی ہوں وہ تمہیں چھوڑ آئیں۔“

”ارے رہنے دو میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“

مگر نازیہ نہ مانی اور پھر خان بابا نے اس کے ساتھ جا کر سکول سے مریم کو لیا اور پھر انہیں گھر چھوڑ کر ہی واپس گیا، نازیہ کی یہ ہی محبت تھی جو اس کی کوئی بھی تکلیف نینب کو بالکل ایسے دکھی کر دیتی تھی جسے کسی سگی بہن کا دکھ یا تکلیف۔

○.....❖.....○

وہ سکول سے گھر آئی تو اماں کو اپنے کمرے میں موجود نہ پا کر ایک دم گھبرا اٹھی شاید وہ کئی دنوں سے ماں کو اپنے کمرے میں ایک مخصوص جگہ پر دیکھنے کی عادت ہو چکی تھی۔

”اماں.....اماں.....“

اک ساگر ہے زندگی

زور زور سے آواز لگاتی وہ چیزی سے کچن کی جانب آئی جو بالکل خالی پڑا تھا وہ دھک سے رہ گئی۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ وہ سکول سے گھر آئے اور ماں موجود نہ ہو اور پھر گھر کا دروازہ بھی اس طرح کھلا ہو۔
”اماں کہاں گئیں؟“

اس سے قبل کہ وہ گھبرا کر دروازہ کھول کر باہر نکلتی کہ اسی پہلے ہاتھ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا، اماں کو باہر نکلتے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ماں ہاتھ روم میں ہوگی یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا اپنی کچھ دیر قبل والی گھبراہٹ یاد کر کے وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

”کیا ہوا کیوں اس طرح شور مچا رہی ہو۔“ اماں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا۔
”مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

آج کئی دنوں بعد اماں کو اس طرح اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھ کر اس کا دل یک دم خوشی سے بھر گیا خوشی نے اس کی بھوک کو بھی دو چند کر دیا۔

”ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لو میں کھانا لگاتی ہوں۔“
اور پھر اگلے ہی پہل وہ بڑی بھرتی کے ساتھ کپڑے تبدیل کر کے دسترخوان پر آ گئی جہاں موجود آلو کے پرائٹھے، سلاد اور رائس نے اس کی بھوک میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ ماں کی محبت اور من پسند کھانا یہ دونوں احساس اسے اندر تک خوش کر گئے۔
”اماں آپ کو کیسے پتا چلا آج میرا دل آلو کے پرائٹھے کھانے کو چاہ رہا تھا۔“ وہ ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے لاڈ سے بولی۔
”اگر ماں اپنی اولاد کے دل کا حال نہ جانے تو کون جانے گا۔ جانتی ہوں اتنے دنوں کی بیماری کے باعث تمہارے لیے کچھ اچھا نہ بنا پائی تھی اس لیے جیسے ہی آج طبیعت کچھ بہتر ہوئی میں نے اپنی بیٹی کا من پسند کھانا بنا دیا۔“
انہوں نے مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ ساری وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں کھانا کھا کر یہ کپڑے کا تھیلہ سامنے والی شیم خالہ کو دے آؤ ان سے کہنا کہ پیسے ابھی دے دیں، ہمیں ضرورت ہے۔“

روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے کہتے ہوئے سامنے چار پائی پر موجود تھیلے کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائی۔

”آج ہی تو آپ کی طبیعت ٹھیک ہوئی تھی پھر کیا ضرورت تھی مشین پر بیٹھ کر سلائی کرنے کی، ایک دو دن تو مزید صبر کر لیتیں، طبیعت مزید بہتر ہوتی تو کپڑے بھی سل جاتے۔“

اس نے ماں کے سوتے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔
”شکر الحمد للہ آج میں پہلے سے بہت بہتر ہوں اس لیے سوچا جلدی جلدی تمام کام نمٹا لوں اور تم فکر نہ کرو اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اللہ کرے آپ ایسے ہی ٹھیک رہیں۔“

دھیرے سے جواب دے کر وہ اپنے سامنے رکھا پراٹھا بڑی رغبت سے کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے آج جانے کتنے دنوں بعد اسے کھانا نصیب ہوا ہو۔



”کیا بات ہے آج کل تمہارے ٹیوشن کے بچے نہیں آرہے۔“

پچھلے دو دن سے خالی صحن دیکھ کر فرہاد نے اپنے دل میں آیا سوال پوچھ ہی لیا۔

”آج کل میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور پھر جگنو بھی دانت نکالنے کے باعث خاصی چڑچڑی سی ہو گئی ہے ہر دم روتی رہتی ہے اس لیے میں نے انہیں کچھ دنوں کی چھٹی دے دی ہے، ویسے بھی سب کے امتحانات بھی ختم ہو چکے ہیں اور کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہیں تھا۔“

مڑھیل کے ٹوکری میں ڈالتے ہوئے نینب نے دھیرے دھیرے تمام وضاحت کی۔

”اچھا ایسا نہ ہو اس دوران انہیں کوئی اور اچھا ٹیچر مل جائے۔“

بظاہر ہنستے ہوئے فرہاد نے مذاق کیا، مگر جانے کیوں اسے فرہاد کا اس طرح کہنا کچھ اچھا نہ لگا۔ وہ بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہ کر اس بات کی منتظر رہی کہ شاید فرہاد اس سے پوچھے کہ تمہاری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟ مگر لا حاصل، وہ جانتی تھی کہ فرہاد شروع سے ہی اس طرح کی کوئی روایت نبھانے کا کبھی بھی قائل نہ رہا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی جانے کیوں آج نینب کا دل چاہا نکلتا ہی سہی، فرہاد اس کا دل رکھنے کے لیے اس کی طبیعت کے حوالے سے اپنی تھوڑی سی پریشانی ظاہر کر دے، سوال کرے کہ تمہاری طبیعت کو کیا ہوا ہے؟ تم اتنی تھکی تھکی سی کیوں ہو؟ مگر وہ منتظر ہی رہی اور فرہاد خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا۔ وہ مڑھیل سے بھری باسکٹ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی جب کچھ سوچتے ہوئے اسے فرہاد نے پکارا۔

”جتنے دن تم نے بچوں کو پڑھایا ہے اس کی ٹیوشن فیس تمہیں مل گئی تھی۔“

وہ ہڑسوچ لگا ہیں اس کے چہرے پر گاڑے بیٹھا تھا۔

”کیوں.....؟“

فرہاد کا یہ سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

”ایسے ہی پوچھ رہا ہوں جب تم نے اتنے دن محنت کی تو فیس ملنا تو تمہارا حق تھا نا۔“ اس کی یہ ہمدردی نینب کو قطعاً پسند نہیں آئی۔

”فیس میں ایڈوانس میں لیتی ہوں۔“ دل نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وضاحت کرنا پڑی۔

”ویسے ایک بات بتاؤ تمہاری طبیعت کو ایسا کیا ہوا تھا جو تم نے اچھے خاصے ٹیوشن کے بچے چھوڑ دیئے اب لگی بندھی رقم اگر ہاتھ میں آجاتی تھی تو کیا برا تھا۔“

یہ تھی وہ اصل وجہ جس کی تمہید شروع سے باندھی جا رہی تھی۔

”میں بہت تھکنے لگی تھی اور یہ تھکن میرے چہرے پر چھا کر اس کے نقوش خراب کرنے لگی تھی۔ اس ٹیوشن نے تو میرے چہرے کی تمام رونق ہی ختم کر دی تھی۔“

یہ تمام الفاظ سالار کے ادا کیے ہوئے تھے اس نے کہا تھا کہ چند سو روپوں کے لیے دو گھنٹے تک اپنا جود ماغ کھپاتی ہو اس کے اثرات تمہارے چہرے پر نمایاں ہونے لگے ہیں، سالار کے پیش کردہ اس تجزیہ سے خوف زدہ ہو کر اس نے ٹیوشن چھوڑ دی۔

اس کا حسن ہی تو ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے باعث وہ کئی لوگوں میں نمایاں تھی اور جو یہ حسن ہی نہ رہتا تو شاید اس کے پاس کچھ باقی نہ بچتا اور وہ بھی دنیا کی عام سی عورتوں میں ہی شامل ہو جاتی۔ مگر اسے خود کو خاص رکھنا تھا اور اس کے لیے اسے

اپنی حفاظت کرنی ہے جس کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے آپ کو ریلیکس کرتی۔
 ”اچھا بھلا چہرہ ہے تمہارا کوئی روفق، ختم نہیں ہوئی اور جہاں تک تھکنے کا تعلق ہے وہ ایک الگ مسئلہ ہے ورنہ تین، چار بچے پڑھانے سے کون تھکتا ہے؟ اب اپنی دوست سادیہ کو ہی دیکھ لو پانچ گھنٹے سکول میں دماغ کھا کر آتی ہے مگر پھر بھی کتنی فریش نظر آتی ہے! تمہاری ٹیوشن کے بہانے تو مریم بھی پڑھ لیا کرتی تھی۔“
 ”مریم کو تو ظاہر ہے ابھی میں نے ہی پڑھانا ہے اور پڑھا بھی رہی ہوں کیونکہ وہ میری ذمہ داری ہے۔“
 اس کا انداز خاصا جتنا ہوا سا تھا، جسے فرہاد نے محسوس ہی نہیں کیا اور ریموٹ ہاتھ میں لے کر چیئل سرچ کرنے لگا، نینب کو اس کا اس طرح ٹیوشن پڑھانے پر زور دینے والا مشورہ بالکل بھی پسند نہیں آیا یا شاید اپنی منفی سوچوں کے باعث وہ ہر بات کو ہی منفی انداز میں دیکھنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔



سالار نے ذرا سی گردن گھما کر دیکھا، نازیہ گہری نیند میں ڈوب چکی تھی اس کی یہ نیند شاید ان دواؤں کے زیر اثر تھی جو وہ اپنی بیماری کے پیش نظر دن میں کئی بار کھاتی تھی۔ مگر اس نیند کی حالت میں بھی ایک تکلیف اور اذیت اس کے چہرے پر نمایاں تھی، وہ آج بھی اس کے تمام ٹیسٹ کروا کر آیا تھا رپورٹس اگلے ہفتے تک مل جانی تھیں اس کے بعد ہی صحیح معنوں میں نازیہ کے علاج کا عمل شروع ہوتا۔ ابھی تو عارضی طور پر اس کی بیماری کو کنٹرول میں کرنے کے لیے اسے کچھ دوائیاں دی جا رہی تھیں اس کے باوجود اس کی دن بدن گرتی صحت سالار کو تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔
 مگر وہ اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا تھا جب تک اس کی بیماری کا علم نہیں ہو جاتا، اس نے آہستہ آواز میں نازیہ کے سر ہانے رکھا لپ آف کر دیا، کمرے میں زیر و پاؤر کی ہلکی نیلی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تکیہ سیدھا کر کے لیے لیٹنے سے قبل اس نے ایک نگاہ پھر سے نازیہ پر ڈالی مگر اب وہاں نازیہ نہیں تھی بلکہ گہری نیند میں ڈوبی نینب کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔
 ”نینب.....“

مارے خیر کے سالار کے منہ سے ہلکی سی آواز برآمد ہوئی۔

”ہائے.....“

نازیہ کروٹ بدلتے ہوئے کراہی، نینب کا چہرہ ہوا میں کہیں تحلیل ہو گیا سالار فوراً چونک کر سیدھا ہوا وہ منتظر تھا کہ شاید نازیہ کے منہ سے کوئی اور آواز نکلے مگر اب وہاں سوائے نازیہ کی تیز سانسوں کی آواز کے کچھ نہ تھا۔ وہ کروٹ بدلتے ہوئے ایک بار پھر گہری نیند میں ڈوب چکی تھی مگر سالار کی نیند دور کہیں غائب ہو گئی اس کے تصور پر بری طرح نینب غالب آ گئی۔
 وہ اٹھ بیٹھا جانتا تھا کہ اس کے یہ خیالات سوائے ذہنی پراگندگی کے کچھ نہیں مگر پھر بھی پچھلے کچھ عرصہ سے نینب اس کے ان خیالات پر بری طرح حاوی ہو چکی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک شادی شدہ عورت اور دو بچیوں کی ماں ہے۔ سالار چاہتے ہوئے بھی اس کے خیالات سے بچھانہ چھڑا پارہا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ دن بدن نینب کی محبت میں غرق ہوتا جا رہا ہے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کی اس اندھی محبت کا انجام کیا ہوگا مگر پھر بھی اپنا یہ پاگل پن اسے اس وقت خوف زدہ کر دیتا جب اس کے نزدیک موجود نازیہ کا وجود نینب کے ہیولے میں ڈھل جاتا۔ اسے ڈر لگتا، کہیں وہ اپنی بے خودی میں نینب کے نام سے نہ پکار لے۔ یہ بھی سبب تھا جو وہ نازیہ سے طویل گفتگو کرتے ہوئے گھبرانے لگا تھا۔ اس کی تمام گفتگو صرف ہوں ہاں میں سمٹ کر رہ گئی تھی جس کا افسوس اسے بھی ہوتا مگر کیا کرتا وہ مجبور تھا۔

اس نے ایک بار پھر تازیہ پر نگاہ ڈالی اور اٹھ بیٹھا اس کی نیند اب بالکل اچاٹ ہو چکی تھی وہ اٹھ کر باہر ٹیرس میں آ گیا جہاں چلنے والی ٹھنڈی اور تازہ ہوائ نے اسے بالکل فریش کر دیا اس نے وہاں موجود کرسی کو ریلنگ کے قریب کیا اور اس پر بیٹھ کر اپنے آپ کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دیا اپنے ذہن کو ہر طرح کے خیالات سے آزاد کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔



وہ مریم کا یونیفارم استری کر رہی تھی جب بیرونی دروازہ کھول کر فرہاد اندر داخل ہوا۔

”یہ گیٹ کیوں کھلا ہوا ہے؟“

اندر آتے ہی اس کے تنقیدی عمل کا آغاز ہو گیا۔

”مریم سادیہ کے گھر گئی ہے۔“

نہن جواب دینے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں بھی مصروف رہی۔

”اس وقت.....“

فرہاد نے سامنے موجود گھڑی پر ایک نظر ڈالی۔

”ہاں میں نے کھیر پکائی تھی سوچا اسے بھی بھیج دوں وہ ہی دینے گئی ہے بس اب آتی ہی ہوگی۔“

”عجیب کم عقل عورت ہوتی، بھلا رات کے آٹھ بجے کون اکیلی بچی کو اس طرح باہر بھیجتا ہے۔“ وہ اٹلے پاؤں واپس

گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

نہن نے کوئی جواب نہیں دیا حالانکہ جانتی تھی کہ اس وقت پوری گلی میں موجود بچے جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں کھیل کود رہے ہیں مگر فرہاد کو اس کی وضاحت کرنا بھینس کے آگے بین بجانا تھا لہذا خاموشی سے اپنا کام مکمل کرنے لگی۔ فرہاد کے باہر نکلنے سے قبل ہی مریم دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

السلام علیکم ابو جی.....“

فرہاد کو گھر دیکھتے ہی وہ خوشی سے نہال ہو گئی فرہاد نے کچھ کہے بنا آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالیا، کچھ دیر قبل والا فرہاد کا غصہ بالکل ختم ہو گیا۔ نہن اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ دسترخوان لگا سکے جب اچانک اس کی نگاہ چار پائی پر رکھے ایک بڑے سے تھیلے پر پڑی۔

”یہ کیا ہے؟ کون لایا ہے؟“

اسے حیرت ہوئی کہ یہ تھیلا کون لایا ہے۔

”ظاہر ہے میں باہر سے آیا ہوں میں ہی لایا ہوں۔“

نہن کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ باہر لگے نلکے پر ہاتھ دھونے چلا گیا، نہن کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر دیکھے اس تھیلے میں کیا ہے؟ مگر اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ بنا اجازت اس تھیلے کو ہاتھ لگائے اسی لیے خاموشی سے کچن میں آگئی۔ جلدی جلدی کھانا گرم کر کے ٹرے میں لیے باہر آگئی جہاں سامنے ہی چار پائی پر فرہاد بڑا سا شاہ پر کھولے بیٹھا تھا غالباً اس میں کچھ کپڑے تھے جو نہن کو دور سے ہی دکھائی دیئے تھے۔

”اصل میں میرا ایک دوست یا سمین آپا کی طرف جا رہا تھا تو سوچا کیوں نہ ان کے لیے کچھ بھیج دوں۔“

تھیلے سے کپڑے باہر نکالتے ہوئے فرہاد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”اچھا.....“

نہنب نے صرف اتنا ہی کہا اور ٹرے اس کے سامنے رکھے کٹری کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا دل ایک دم ہی مرجھا گیا اسے لگا جیسے تمام الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔

”یہ دوسوٹ تمہارے ہیں۔“

دوسوٹ خود ہی الگ کر کے اس نے نہنب کی طرف بڑھائے۔

”دراصل یاسمین آپا نے کہا تھا ان کے لیے گرین اور ریڈ کلر کے کپڑے خریدوں، اس لیے یہ والے دونوں ان کے ہیں۔“

مزید دونوں سوٹ نہنب کو دکھائے بنا ہی اس نے تھیلا بند کر دیا دل تو چاہا ہاتھ میں پکڑے دونوں سوٹ بھی واپس وہیں چارپائی پر رکھ دے اور کہے کہ یہ بھی یاسمین آپا کو ہی دے دیں مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ دونوں سوٹوں کو اٹھا کر کمرے میں موجود الماری میں جا ڈالا۔

فی الحال اس کا ارادہ ان میں سے کوئی بھی سوٹ سلوا کر پہننے کا نہیں تھا حالانکہ جانتی تھی کہ اس کے اس عمل کا کوئی بھی فرق فرہاد پر پڑنے والا نہیں ہے مگر پھر بھی وہ اپنی اس دلی تکلیف کو شاید اسی طرح کم کرنا چاہتی تھی۔

اپنے حق میں کیے جانے والے فیصلے سے مطمئن ہو کر وہ برآمدے میں آگئی تاکہ خود بھی کھانا کھالے اور ویسے بھی وہ مریم کو بھی اپنے ہاتھوں سے ہی کھانا کھلایا کرتی تھی اور یقیناً اس وقت بھی باہر موجود مریم اس کی منتظر تھی اس کی اپنی بھوک بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس نے خاموشی سے مریم کو کھانا کھلایا اور برتن سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی، فرہاد اس سے پہلے ہی کھانا ختم کر کے ٹی وی کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سامنے موجود چارپائی پر ڈالی جو اس وقت بالکل خالی تھی یقیناً کپڑوں کا شاپرا اٹھالیا گیا تھا۔

”کھانا کھالیا ہو تو ایک کپ چائے کا بنا دینا۔“

کچن میں داخل ہونے سے قبل اسے اپنے عقب میں فرہاد کی آواز سنائی دی۔ برتن دھونے کے ساتھ ساتھ، چائے کا کپ تیار کر کے جب وہ برآمدے میں آئی تو فرہاد بڑے انہماک کے ساتھ کوئی پاکستانی فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ نہنب نے خاموشی سے اس کے قریب چائے کا کپ رکھ دیا۔

”چائے لے لیں۔“

ساتھ ہی آواز لگا کر اس نے فرہاد کو مخاطب بھی کیا مبادا بے دھیانی میں کہیں گرم چائے گرمی جائے، فرہاد نے ایک سرسری سی نگاہ کپ پر ڈالی اور پھر سے ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ نہنب نے اس کے قریب لیٹی جگنو کو آگے بڑھ کر اٹھالیا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“

غلاف توقع فرہاد نے اس پر ایک نگاہ طائرانہ ڈالتے ہوئے حیرت سے سوال کیا شاید اسے نہنب کے بگڑے موڈ کا اندازہ ہو چلا تھا۔

”کچھ نہیں.....“

اس کا موڈ فی الحال کوئی بھی شکوے شکایت کرنے کا نہیں تھا۔

”تو پھر منہ کیوں اس طرح بنایا ہوا ہے؟“

اس نے ریوٹ سے ٹی وی کی آواز قدرے کم کرتے ہوئے پوچھا۔
”میرا خیال ہے تمہیں اچھا نہیں لگا کہ میں نے تمہارے ساتھ ساتھ یاسمین آپا کے لیے شاپنگ کیوں کی ہے، صحیح کہہ رہا ہوں نا میں۔“

”بات یہ نہیں ہے دراصل آپ کو چاروں جوڑے میرے سامنے رکھ دینے چاہیے تھے تاکہ جو کچھ مجھے پسند آتا میں لے لیتی ورنہ میرے لیے جو بھی کچھ خریدیں مجھے ساتھ جا کر خریدنا کریں۔“
اب چونکہ وہ بتا کہ اب سب کچھ جان چکا تھا لہذا دل میں کوئی بات رکھنے کا فائدہ نہیں تھا اس لیے نینب نے ہر بات کہہ ڈالی۔

”بات صرف اتنی ہے نینب، تمہارے خاندان میں بیٹیوں کو دینے کا قطعی کوئی رواج نہیں ہے۔ اب تم خود کی دیکھو کبھی تمہارے بھائی یا ماں نے عید پر بھی تمہیں کچھ نہیں بھیجا اس لیے شاید تمہیں برا لگتا ہے اگر میں یاسمین آپا کے لیے کچھ لے کر آؤں ورنہ ہمارے یہاں تو ہر عید، شبِ برأت، شادی شدہ بیٹیوں کے گھروں میں بہت کچھ جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمہارے گھر والے بھی تمہیں دیں صرف بتا رہا ہوں کہ فضلہ بھائی اور صاحبہ بھابی کے میکے سے تو ہر سال گرمیوں اور سردیوں کے کپڑے بھی آتے ہیں، یہی وجہ ہے جو ہمیں بھی اپنی بہن کے لیے کرنا پڑتا ہے۔“
وہ بات کو بالکل ہی غلط رخ پر لے گیا تھا غصے پر دکھ کی کیفیت غالب آگئی اور یہ دکھ اسے فرہاد کے بے لاگ تہرے نے دیا تھا۔ اس کے حلق میں یک دم ہی ایک آنسوؤں کا گولہ پھنس گیا۔

”آپ اچھی طرح جانتے ہیں میری ماں نے اپنی بیوی میں ہم بہن بھائیوں کی پرورش محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھا کر کی اور پھر بھی اللہ کا شکر ہے انہوں نے ہمیں کبھی بھی کسی کم مانگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ابھی بھی اپنی حیثیت کے مطابق وہ ہر سال عید پر مجھے اور آپا کو کچھ رقم ضرور بھیجتی ہیں، ویسے بھی جہاں تک میں سمجھتی ہوں بیٹیوں کو کچھ دینا اپنی خوشی اور خواہش ہوتی ہے اس سلسلے میں ہمارے مذہب میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔“

”یہی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں، یاسمین آپا کو اگر ہم کچھ دیتے ہیں تو اپنی رضامندی اور خوشی کے ساتھ دیتے ہیں اس سلسلے میں ان کی طرف سے ہم پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا۔“

”میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں فرہاد، آپ نے اگر شاپنگ سے قبل آپا کو فون کر کے ان کی پسند و ناپسند کے بارے دریافت کیا تھا تو کم از کم آپ کی بیوی ہونے کے ناطے میرا بھی یہ حق ہے کہ آپ کے سامنے اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کر سکوں۔“

”یہ چائے اٹھا لو تم نے شاید غصہ میں بے تحاشا پتی ڈال دی ہے حلق سے ایک گھونٹ اترا نا محال ہو گیا، سارا حلق بھی کڑوا کر رکھ دیا۔“

شاید اس کے پاس نینب کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا اور جب وہ لا جواب ہوتا اپنا غصہ فوری طور پر کسی اور سمت منتقل کر دیتا۔

”لائیں تھوڑا دودھ اور ڈال کے لے آؤں۔“
جانتی تھی کہ چائے میں پتی روزمرہ کے حساب سے بالکل صحیح ہے اور یہ صرف فرہاد کو اسے اپنے موضوع سے ہٹانے کا ایک طریقہ تھا۔

”رہنے دو مجھے نہیں پنی۔“

چائے کا ٹرے پرے کھسکاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا، زینب نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جہاں نظر آنے والی کرختگی نے اس کے دل کو تھوڑا سا خوف زدہ کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ فرہاد کا موڈ بری طرح آف ہو چکا ہے اور اب جانے مزید کتنے دن لگیں اس کے موڈ کو دوبارہ بحال ہونے میں۔ ”کیا ضرورت تھی مجھے بلا وجہ یا سہین آپا کے کپڑوں کو لے کر اتنی باتیں بنانے کی۔“

یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں بہت بچھتاؤں مگر اب افسوس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے چائے کا کپ اٹھا لیا اور مردہ قدموں سے کچن کی جانب چل دی جبکہ فرہاد اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔



”ایکسکوز می مس.....“ وہ کلاس لے کر باہر نکلی ہی تھی کہ اپنے عقب سے آنے والی مردانہ آواز سن کر اس کے قدم وہیں ختم ہو گئے۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اس کے عین سامنے کھڑا نوجوان یقیناً اس کا کلاس فیلو تھا مگر چونکہ اس کی سوائے حصہ کے کسی سے کوئی دوستی نہ تھی اس لیے وہ کسی کو پہچانتی بھی نہیں تھی۔

”یہ نوٹ بک غالباً آپ کی ہے۔“

اس کے پیچھے دیکھتے ہی نوجوان نے اپنے ہاتھ میں پکڑی نوٹ بک اس کی جانب بڑھائی جو یقیناً اس کی تھی۔

”اوہ.....“ بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں نے حصہ کو دی تھی شاید وہ بھول گئی۔“

جواب دے کر اس نے ایک نگاہ کچھ دور کھڑی حصہ پر ڈالی جو مس رشیدہ سے اپنے اسائنمنٹ کے سلسلے میں کوئی بات کرنے میں مصروف تھی۔

”بہر حال بہت بہت شکریہ آپ کا، یہ میری ایک اہم نوٹ بک تھی۔“

اس نے مسکراتے ہوئے اس نوجوان کے ہاتھ میں پکڑی اپنی نوٹ بک واپس لے لی۔ اس نوٹ بک میں اس کا وہ اسائنمنٹ بھی موجود جو اگلے پیرڈے میں اسے جمع کروانا تھا اور اگر آج یہ نوٹ بک کھو جاتی تو اسے ایک بار پھر نہ صرف اسائنمنٹ مکمل کرنے کے لیے محنت کرنا پڑتی بلکہ آج اسائنمنٹ نہ دینے کی صورت میں مس آمنہ کی باتیں بھی سننا پڑتیں۔

”نہیں اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔“

اس کی بات کا جواب دے کر وہ نوجوان آگے کی جانب بڑھ گیا۔ جب حصہ اس کے قریب آئی۔

”اوہ خوب باتیں ہو رہی تھیں مطلب یہ کہ تم نے بھی دوست بنانے شروع کر دیئے ہیں۔“ جواباً اس نے کوئی وضاحت نہ کی صرف ہلکا سا مسکرا دی۔

”یارتو اتنی خوب صورت ہو کہ لگتا ہے گریجویشن مکمل کرتے کرتے تمہارا رشتہ بھی پکا ہو جانا ہے اور مجھے تو مشکل لگتا ہے کہ تم آگے مزید تعلیم حاصل کر سکو۔“

حصہ پہلے دن سے اس کے حسن سے اس قدر ہی متاثر رہا کرتی تھی۔

”تمہارے سب اندازے غلط ہیں۔“

وہ حصہ کے ساتھ چلتی ہوئی دھیرے دھیرے سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ ”اس کالج میں داخلہ لینے سے قبل ہی نہ صرف یہ کہ میرا رشتہ پکا ہو چکا تھا بلکہ آل ریڈی میں نکاح شدہ ہوں۔“
وہ تلخ سچائی جو وہ کبھی کسی سے شہر نہ کرتی تھی جانے کیسے آج خود بخود اس کے منہ سے نکل گئی یا شاید اب یہ راز دل میں رکھ رکھ کر وہ بھی تھک سی گئی تھی۔

”واٹ.....؟“

حصہ کو جیسے جھٹکا لگا۔

”تم نے تو مجھے آج تک نہیں بتایا۔“

وہ حیرت میں ڈوبی اپنی جگہ پر ہی کھڑی رہ گئی۔

”کون ہے وہ خوش نصیب جسے تمہارا شوہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔“

”ہے میرا ایک کزن مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ خوش نصیب ہے یا بد نصیب۔“

جملہ ختم کرتے ہی وہ ہلکا سا ہنس دی اس ہنسی میں چھپا درد کوئی محسوس نہیں کر سکتا تھا سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بے حد قریب تھے۔

”تمہارے آج کے اس انکشاف نے تو مجھے حقیقت میں شاکہ کر دیا ہے بہر حال اب تمہاری سزا یہ ہے کہ آج تم مجھے کینٹین میں ایک اچھی سی ٹریٹ دو گی۔“

اس کے دل کا حال جانے بنا حصہ تیز تیز بولتی آگے کی جانب چل دی اور وہ بنا کچھ کہے اس کی تقلید میں قدم اٹھانے لگی۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ جذبات میں بہہ کر منہ سے نکلنے والی اس کی باتوں کا حصہ نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا ورنہ تو شاید اس کے لیے مشکل ہو جاتا حصہ کو اس سلسلے میں کوئی بھی وضاحت دینا کیوں کہ ابھی تو حقیقت کیا ہے وہ خود نہیں جانتی تھی۔

اس رشتہ کے حوالے سے سوائے ملک صاحب کے آج تک کوئی اس کے سامنے نہیں آیا تھا اور غالباً یہ وہ وجہ تھی جو کئی بار راتوں میں اس کی نیند اڑا جایا کرتی تھی اور ایسے میں وہ اپنی تمام طنائیں وقت کے ہاتھوں میں تھما کر مطمئن ہونے کی کوشش کیا کرتی اور اکثر کامیاب بھی ہو جاتی۔

بہر حال جو بھی تھا اس کی زندگی کس سمت بہہ رہی تھی؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ فی الحال وہ کچھ نہیں جانتی تھی اس لیے چپ چاپ خاموشی سے زندگی کو بس جے چلی جا رہی تھی اس امید میں کہ وہ دن جلد آئے گا جب وہ ایٹال کی ہر ای میں ملک صاحب کے گھر کی دہلیز پر اپنے قدم رکھ سکے اس کی زندگی جینے کا شاید یہی ایک مقصد اب باقی رہ گیا تھا۔

○.....◇.....○

آج کئی دن ہو گئے تھے اسے نازیہ کی کوئی خبر ہی نہیں ملی تھی، ایک تو مریم کے سالانہ امتحانات شروع تھے جن میں وہ بری طرح مصروف تھی دوسرا جگنو کو بھی پچھلے کئی دنوں سے بخار تھا کئی بار کوشش کی کہ فون پر بھی بات کرے مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ جانتی تھی فرہاد ہر چیز کی طرح ٹیلیفون کا بھی بڑا حساب کتاب رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں ٹیلیفون کا ذرا سا بھی زیادہ آجانے والا بل اس کا موڈ کئی دنوں تک آف کر دیتا۔

جبکہ نصاب اگر نازیہ سے بات کرتی تو یقیناً آدھ، ایک گھنٹہ تو ضرور صرف ہوتا، جس کے نتیجہ میں بل میں ہونے والا

اک ساگر ہے زندگی

اضافہ اسے فراہادی عدالت میں کھڑا کر دیتا۔ اس کا کہنا تھا کہ فون پر کی جانے والی گفتگو مختصر ہونی چاہیے اور بلا ضرورت فون کا استعمال نہ صرف پیسہ بلکہ وقت کا بھی ضیاع ہے جبکہ شاید اس قانون سے وہ اور اس کی بہن بالاتر تھے۔

بہر حال جو بھی تھا دو دن قبل اس نے ذرا سی دیر کے لیے نازیہ کے گھر فون کیا تھا، وہ تو نہیں تھی شاید ہاسٹل گئی تھی مگر سیکنڈ سے جو بات ہوئی اس سے زینب کو صرف اس قدر معلوم ہو چکا کہ نازیہ کی تمام رپورٹس آگئی تھیں مزید اس حوالے سے سیکنڈ کچھ نہیں جانتی تھی۔ آگے مزید کچھ جاننے کے لیے زینب کی نازیہ سے ملاقات اشد ضروری تھی۔

”شام میں فرہاد سے کہوں گی کہ مجھے نازیہ کی عیادت کے لیے جانا ہے مجھے اپنے ساتھ لے کر جائے۔“

یہ سوچ کر وہ تھوڑا سا مطمئن ہو گئی آج تو اس نے کئی بار فضا بھابی کو بھی دل سے یاد کیا وہ جو یہاں ہوتیں تو ہر پل کی خبر دے دیتیں مگر افسوس وہ ابھی واپس نہ آئی تھیں۔

وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی جب اچانک گیٹ کے باہر ابھرنے والی رکشا کی تیز آواز سے چونک اٹھی شاید ہمارے گھر ہی کوئی آیا ہے، اگلے ہی پل اطلاعی گھنٹی کی آواز نے اس کے خیال کی تصدیق بھی کر دی، وہ کچن سے باہر نکلی مریم ہٹا پوچھے گیٹ کھول چکی تھی باہر موجود شخصیت اندر داخل ہوئی جسے دیکھتے ہی زینب کچھ دیر قبل والی ساری کو فٹ بھول کر خوشی سے کھل اٹھی۔

”السلام علیکم اماں۔“

اپنی ماں کو آج کئی ماہ بعد اچانک اس طرح اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی اور تیزی سے آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔

”علیکم السلام۔“ اماں بی نے سیدھا ہاتھ اس کے سر اور کمر پر پھیرتے ہوئے اسے پیار کیا۔

”میں تو سمجھی شاید تم پاکستان چھوڑ کر کسی دور دراز ملک میں جا رہی ہو جو ماں اور بہن بھائیوں کی خیر خبر لینے سے ہی گنیں۔“

اماں بی نے ہنستے ہنستے پیار بھرا شکوہ کیا۔

”بس اماں کیا بتاؤں گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی ورنہ سچ جانیں کوئی ایسا پل نہیں جو میں آپ کو یاد نہیں کرتی۔“ انہیں ساتھ لیے وہ اندر برآمدے میں داخل ہو گئی۔

”آپ اکیلی آئی ہیں؟“

اپنی خوشی میں وہ یہ بات پوچھنا تو بھول ہی گئی تھی جو سب سے پہلے پوچھنا چاہیے تھی۔

”ہاں بیٹا تم خود اس قدر کم آتی جاتی ہو کہ میرا دل ہی نہ چاہا کہ تمہاری کسی بھابی سے یہاں آنے کا ذکر کرتی، حسن تو ویسے بھی یہاں نہیں ہے آفس کے کام کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا ہے، احسان صبح دکان پر جاتا ہے اور رات میں واپس آتا ہے۔ اب بھلا کس کے پاس اتنا ٹائم جو مجھے لیے لیے پھرے اور دل تم سے ملنے کے لیے اس قدر اتار دلا ہو رہا تھا کہ میں نے کسی سے کہا بھی نہیں، دل میں تمہاری محبت کا اہال آیا خود ہی رکشا کیا اور یہاں تک آگئی۔“

اماں بی نے تخت پر بیٹھتے بیٹھتے ہر بات کی وضاحت کر دی۔

”چلیں یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا اب آپ دو تین دن یہاں رہیں گے میرے پاس۔“

وہ دلار سے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

”ارادہ تو یہ ہی ہے اگر احسان لینے نہ آگیا تم تو جانتی ہو وہ شروع سے ہی رات مجھے کہیں نہیں رہنے دیتا۔“
 ”کوئی بات نہیں آج میں خود فون کر کے اسے منع کر دوں گی کہ آپ کو لینے نہ آئے ماں تو ہم سب کی ایک جیسی ہے۔
 اچھا یہ سب چھوڑیں پہلے یہ بتائیں آپ کھانے میں کیا کھائیں گی۔“
 باتوں کے دوران زینب نے دیکھا کہ مریم بھاگ کر اندر کمرے سے نکلے لے آئی تھی جو اس نے نانی کی کمر کے پیچھے لگا دیا تھا۔ مریم کا نانی کے لیے اتنا خیال، زینب کو بہت اچھا لگا۔
 ”جو دل چاہے بنا لو مجھے تو تمہارے ہاتھ کا کھانا ویسے بھی بہت پسند ہے ماشاء اللہ بڑی لذت ہے تمہارے ہاتھوں میں۔“
 زینب سر ہلاتی فریح کی جانب بڑھی تاکہ دیکھے اگر کچھ گوشت یا مرغی ہو تو ماں کے لیے کھانا تیار کر سکے کچھ دیر قبل اپنا دال، چاول بنانے کا ارادہ اس نے قطعی طور پر ترک کر دیا۔



وہ صوفے پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا، مافون پر اس بری طرح مصروف تھیں کہ انہیں ایصال کی پریشانی نظر ہی نہیں آرہی تھی۔ بنا پوچھے ہی وہ جان چکا تھا کہ فون کے دوسری طرف یقیناً آپا ہیں جو اس کی سگی بہن تو نہیں تھیں مگر ماما کے نزدیک سگی اولاد سے بڑھ کر تھیں اور وہ ہر دوسرے دن یو کے سے ماما کو کال ضرور کرتی تھیں اور ماما بھی دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اس کال کی منتظر رہا کرتیں۔ ایصال کا انتظار ختم ہوا اور ماما نے فون بند کر کے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔
 ”کیا ہوا تم کیوں اتنے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔“
 ”ایصال کے قریب ہی صوفے پر آن بیٹھیں۔“
 ”آپ اچھی طرح جانتی ہیں ماما اور ایصال کی دی ہوئی مہلت ختم دے میں صرف آج کی رات باقی ہے کل صبح شاید وہ شاہ زیب کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دے گی۔“
 دو انگلیوں کی مدد سے اپنا ماتھا گرگڑتے ہوئے وہ دھیرے سے بولا۔
 ”اور میری سمجھ میں نہیں آرہا میں پاپا تک اپنا انکار کس طرح پہنچاؤں کیسے انہیں آمادہ کروں کہ وہ پہلے والا رشتہ ختم کر کے میرے لیے نیا رشتہ استوار کریں۔ شروع شروع میں آسان دکھائی دینے والا یہ کام ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“
 ”جو بھی ہے بات تو تمہیں کرنا ہی پڑے گی ورنہ ساری زندگی اسی طرح رو دو دھو کر گزر جائے گی اور میں ایسا بالکل نہیں چاہتی۔“

ماما نے اس کے کندھے کو ہولے سے دبا دیا۔

”میرا خیال ہے کہ آج مجھے ہمت کر کے پاپا سے ہر حال میں بات کرنا ہوگی چاہے کچھ بھی ہو ورنہ ایسا نہ ہو میرے سوچنے سوچنے میں وقت ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل جائے۔“
 ”لیکن آج تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے تمہارا اپنے پاپا سے کوئی بھی بات کرنا کیونکہ وہ ابھی دو گھنٹے تک دوسری جانے والے ہیں ان کے دوست اسماعیل کو تو جاننے ہونا بس ان کے بیٹے کی شادی ہے جس میں شریک تو مجھے بھی ہونا تھا، مگر میری یہاں ایک بہت ضروری میٹنگ تھی جس کی وجہ سے میں نہیں جاسکتی۔“

”افوہ ماما اب میں کیا کروں اگر آج کی یہ رات بنا کسی فیصلہ کے گزر گئی تو کل کا سورج یقیناً اریشہ کو مجھ سے دور کر دے گا پلیز ماما خدا کے لیے کچھ کریں۔“

پاپا کے جانے کا سنتے ہی اس کی بے چینی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔
”کچھ نہیں ہوتا اریشہ کو، میں اسے ابھی فون کر کے سمجھا دیتی ہوں۔“
ایصال کی پریشانی نے ماما کو بھی ڈسٹرب کر دیا۔
”وہ نہیں مانے گی آپ جانتی ہیں نا وہ کس قدر ضدی ہے میں ہی کچھ کرتا ہوں۔“
عالم اضطراب میں، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”کس کی ضد کی بات ہو رہی ہے؟ اور یہ تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔“
اپنی باتوں میں مگن ماں بیٹے کو احساس ہی نہ ہوا کہ ملک صاحب لاؤنج کا دروازہ بے آواز کھول کر ان کے سروں پر آن کھڑے ہوئے اب جوان کی آمد کا علم ہوا تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر سن کھڑے رہ گئے۔

○.....❖.....○

”ایک بات تو بتاؤ فضل دین۔“ سیکنڈ ہر سوچ لگا ہوں سے اسے نکلتے ہوئے بولی۔
”ہاں بولو۔۔۔۔۔“ کھانا کھاتے فضل دین نے ہاتھ روک دیا۔

”ایک بے اختیار انسان، کسی دوسرے انسان کی زندگی کا فیصلہ کرنے سے پہلے سوچتا کیوں نہیں۔ فضل دین جب ہم اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اپنے کیے گئے فیصلے دوسروں سے منواسکیں، تو پھر ایسے فیصلے ہی کیوں کرتے ہیں جو ہماری وجہ سے اپنے لوگوں کی زندگی خراب کر دیں جن کا خدا کے بعد اس دنیا میں سوائے ہمارے کوئی دوسرا سہارا بھی نہ ہو۔“
بات ختم کرتے ہوئے سیکنڈ کی آواز بھیگ سی گئی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی بنا کسی وضاحت کے فضل دین جان چکا تھا۔
”بھلی مانس شاید ٹو بھول گئی انسان کبھی بھی با اختیار نہیں ہوتا، وہ تو ہمیشہ سے ہی بے اختیار ہے، با اختیار تو صرف سوہنے رب کی ذات ہے۔ ہم تو صرف کٹھ پتلیاں ہیں جو اوپر والے کے اشاروں پر چلتی ہیں اور شاید ایسے میں ہم جو بھی فیصلہ کرتے ہیں وہ ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے اور نصیب کے آگے تو ہم سب ہی بے بس ہیں اور یہ بات تو..... ٹو بھی اچھی طرح جانتی ہے۔“

”تو کیا اس سوہنے رب نے ہماری بی بی کے نصیب میں ہمیشہ کے لیے تہنائی ہی لکھ دی ہے؟ تو کیا اس کا مقدر یہ ہی ہے کہ وہ اپنی ساری جوانی ہم جیسے کمیں لوگوں کے ساتھ ہی گزار دے، اس غریب کے نصیب میں اپنوں کا پیار، اپنوں کا ساتھ کچھ نہیں ہے۔“

وہ سوالیہ انداز میں اسے نکلتے ہوئے دیکھی لہجہ میں بولی۔

”اللہ نہ کرے سیکنڈ کیوں ایسی بد فال منہ سے نکالتی ہے۔ خدا سے ڈر، جانے اسے تیری کون سی بات کب بری لگ جائے تو بہ کر بھلی مانس تو بہ۔۔۔۔۔“

فضل دین نے قدرے برا مناتے ہوئے اسے گھر کا۔

”یہ بد فال نہیں ہے، فضل دین سچائی ہے، ایک تلخ سچائی تو مجھے صاف دکھائی دے رہی ہے اور یہ بات تو تم بھی بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ ملک صاحب اپنی بیگم اور بیٹے دونوں کے سامنے بالکل بے بس ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ معصوم بچی

اتنے سالوں سے یوں تنہا ہمارے سہارے نہ پڑی ہوتی، بلکہ کب کے ملک صاحب اسے اپنے ساتھ لے گئے ہوتے اپنی بہو بنا کر۔ اب بھلا اتنے سالوں میں جو بات وہ آج تک نہ منوائے تو خود سوچو کس طرح وہ اس معصوم کو اس کا حق دلا سکیں گے۔ مجھے تو اپنی زندگی میں یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔“

آج سیکنہ کے دل میں جو کچھ تھا وہ کہہ دینا چاہتی تھی۔ پھر جانے یہ موقع دوبارہ کبھی ملے یا نہ ملے، کیونکہ فضل دین اس موضوع پر ہمیشہ بات کرنے سے کتراتا تھا۔

”اللہ سے اچھے کی امید رکھو، وہ جو کرے گا ان شاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔“

فضل دین نے مختصر جواب دے کر بات ختم کرنا چاہی۔

”میری تو ہمیشہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس معصوم بچی کا نصیب جلد ہی اچھا کرے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی بہت پریشان اور دکھی ہے اور سچ مانوں تو جب جب میں اسے دیکھتی ہوں اس کی تنہائی کے تصور سے ہی میرا دل ہول اٹھتا ہے۔“

اسے مسلسل بولتا دیکھ کر فضل دین ہنا کوئی جواب دیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں بی بی کو لینے کالج جا رہا ہوں، تم مزید باتیں بنانا چھوڑو اور اٹھ کر جلدی سے کھانا تیار کرو۔“

سیکنہ کو ہدایت دیتا وہ قریبی ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتا ہوا لکڑی کا دروازہ دھکیل کر باہر نکل گیا۔



”میں نے تمہیں منع کیا تھا ابھی اماں جی کو لینے مت آنا، میں کچھ دن انہیں اپنے ساتھ رکھوں گی، مگر تم پر تو شاید کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا، میرے روکنے کے باوجود لینے آگئے ہو۔“

احسان کو دیکھتے ہی نضب نے برا سامنہ بنایا۔

”ارے آپ آپ یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں، مجھے اماں کے بغیر نیند نہیں آتی۔“

بہن کی بات کا برا منائے بغیر اس نے ماں سے لاڈ کرتے ہوئے جواب دیا اور اماں بی کا تو مانو سیروں خون ہی بڑھ گیا۔

”اب جب گھر آئی تو تمہاری بیوی کو بتاؤں گی یہ بات پھر اسے بھگتنا۔“ نضب ہنستے ہوئے بولی۔

”ہاں..... ہاں..... ضرور بتا دے گا، میں تو خود چاہتا ہوں وہ ناراض ہو کر میکے جائے اور مجھے دوسری شادی کرنے کا موقع ملے۔“ وہ شرارتا ہنسا۔

”اللہ نہ کرے بیٹا کیسی باتیں کرتے ہو۔“ اماں بی ہول ہی لگئیں۔

”مذاق کر رہا ہوں اماں۔“ ماں کو سنجیدہ دیکھ کر احسان بھی سنجیدہ ہو گیا۔

”چلیں اب اٹھ جائیں، گھر پہنچتے پہنچتے گھنٹہ سے بھی اوپر ہو جانا ہے۔“

”بیٹھو میں کھانا لارہی ہوں، کھا کر جانا۔“

”ارے نہیں، کھانا ہم گھر جا کر کھائیں گے، پھر کہیں فرہاد بھائی یہ نہ کہہ دیں کہ مہینے بھر کا راشن نضب کے میکے والے ایک ہی دن میں ہڑپ کر جاتے ہیں۔“

بظاہر مذاق میں کہا گیا احسان کا یہ جملہ نضب کے دل میں ترازو ہو گیا۔ بہت سال قبل مذاق ہی مذاق میں کہا گیا یا سمیں

آپ کا یہ جملہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا، جبکہ اس وقت محض وہ سکول کا طالب علم تھا اور آج پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ چکا تھا، مگر پھر بھی اتنی پرانی بات آج تک دل میں سنبھالے بیٹھا تھا۔ شاید کچھ باتیں دلوں میں اسی طرح نقش ہو جایا کرتی ہیں۔ بہر حال جو بھی تھا نوب کو احسان کی بات پسند نہ آئی۔

”بری بات ہے احسان، بنا جانے کسی کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار نہیں کرتے اور فرہاد تو پھر تمہارا بہنوئی ہے۔“

نوب کے ماتھے پر بڑی تیوریاں اماں بی کو صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

”مذاق کر رہا ہوں اماں، آپ تو پھر سے سنجیدہ ہو گئیں۔“

اپنی کئی گئی بات کی سنگینی دور کرنے کے لیے ہمیشہ اسے مذاق کا رنگ دینا اس کی پرانی عادتوں میں سے ایک تھی۔ اماں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مریم نے تیزی سے آگے بڑھ کر تخت کے نیچے سے ان کی چپل نکالی اور پاؤں کے بالکل قریب رکھ دیں۔ اس کی اس بے اختیار حرکت نے سب کو ہی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ماحول میں پھیلی ہوئی کچھ دیر قبل والی تلخی یک دم ہی دور ہو گئی۔

”جیتتی رہو بچہ..... اللہ تعالیٰ نصیب اچھا کرے، سو ہمارے زندگی میں ہر خواہش پوری کرے، وہ سب کچھ عطا کرے جو تم چاہتی ہو، سدا خوش رہو۔“

انہوں نے مریم کو خود سے لگا کر ڈھیر ڈھیر دعائیں دے ڈالیں۔

”لگتا ہے اماں آپ نے کبھی مجھے اتنے دل سے دعا نہیں دی تھی۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی اک شکوہ نوب کے لبوں پر آ گیا۔

”اماں کی دی جانے والی ہر دعا دل سے ہی نکلتی ہے نوب اور پھر بتاؤ بھلا تمہیں زندگی میں کیا کی ہے۔ اچھا گھر اور بچے اور محبت کرنے والا شوہر اس سے بڑھ کر کسی عورت کی خواہش اور کیا ہو سکتی ہے؟“ اماں قدرے برا مناتے ہوئے بولیں۔

”دکھ تو یہ ہی ہے اماں کہ شوہر محبت کرنے والا نہیں ہے۔ محبت تو ایک طرف وہ تو میری کسی ضرورت کو بھی سمجھنے کے قابل نہیں ہے۔“ وہ ہی پرانا شکوہ اور شکایت۔

”بیٹا تم جاؤ گاڑی اشارت کرو، میں آرہی ہوں۔“ انہوں نے احسان کو فوراً ہاں پر بھیجا۔

”دیکھو بیٹا ہر شخص کے محبت کرنے کا انداز دوسرے سے جدا ہوتا ہے اور کچھ لوگ تو محبت کا اظہار کرنا بھی نہیں جانتے۔

ان کے نزدیک محبت اظہار کی محتاج نہیں ہوتی اور یقیناً مانو فرہاد کا تعلق بھی ایسے ہی لوگوں سے ہے۔ ورنہ وہ تم سے اور اپنی بچیوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ بس صرف اظہار کرنا نہیں جانتا۔“

بیٹی کے دل میں آیا بال دور کرنا ان کی ذمہ داری تھی اور اپنی ہر ذمہ داری بھانا وہ بخوبی جانتی تھیں۔

”محبت الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی اماں اور یہ بات میں بھی جانتی ہوں۔“ نوب نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”یہ تو وہ جذبہ ہے جو بنا کہے بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ کیا جائے اور یقیناً جانیں دکھ کی بات صرف یہ ہے کہ

فرہاد کا دل میری محبت سے یکسر خالی ہے۔ یہاں تک کہ بیوی کے ناطے میرا کوئی احساس، کوئی ذمہ داری بھی اس کے نزدیک قطعی غیر اہم ہے، کیونکہ میں ہی اس کے نزدیک اہم نہیں ہوں۔“

”غلط فہمی مت پالو بیٹا، یہ غلط فہمیاں رشتوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ ان سے بچو، یہ شیطانی طور طریقے ہیں اپنے دل میں

ہمیشہ اچھی باتیں اور اچھے خیالات کو جگہ دو، خوش رہو گی، ورنہ یہ دوسرے تمہیں کمزور کر دیں گے۔“
اماں نے بے اندر کا دکھ جانتی تھیں۔ وہ شروع سے ہی لوگوں کی نظروں میں رہنے کی عادی تھی، کسی کا نظر انداز کیا جانا اسے کبھی نہ بھاتا تھا، اپنی تعریف وصول کرنا وہ اپنا حق سمجھتی تھی، سچے سنورنے کی شوقین تھی۔ انہوں نے اپنے حالات کے مد نظر کبھی فالتو پیسہ اولاد پر خرچ نہ کیا، بیٹیوں کو تو ہمیشہ یہ ہی کہا کہ جو کرنا ہے اپنے گھر جا کر کرنا، ہر خواہش پوری کرنا میری اوقات نہیں اور نئے خواہشات کا ایک محل اپنے ساتھ لے کر فرہاد کے گھر آئی تھی جو یہاں آتے ہی چکنا چور ہو گیا۔

روپے پیسے کے حساب کتاب سے زیادہ خود کو نظر انداز کرنا اسے اندر تک مار گیا، اپنے ہاتھوں کا کھلا پیسہ خرچ کرنے کی دلی خواہش سک سک کر دم توڑ گئی اور سب کچھ عین اس کی خواہش کے مطابق پورا کرنا اماں جی کے اختیار میں نہ تھا۔
ماسوائے اس کے کہ وہ نئے خواہشات کو سمجھا بھجا کر ہر ادھوری رہ جانے والی خواہش کو غیر ضروری قرار دے دیں اور وہ ہمیشہ ایسی ہی کوشش کیا کرتیں ابھی بھی نئے نئے خواہشات کے پاس رک کر اسے سمجھانے کا ان کا یہ ہی مقصد تھا۔

”اچھا بیٹا، اب میں چلوں اور ہاں تم یہ کچھ پیسے رکھ لو، جلدی میں آئی تھی، کچھ لائے گی، اب جو تمہارا دل چاہے اپنی خواہش کے حساب سے خرید لینا۔“ انہوں نے نئے نئے خواہشات کی فہم میں کچھ روپے دبائے۔
”اور ہاں فرہاد کے لیے اپنے دل میں اچھے خیالات رکھو، کچھ لوگ اظہار میں کنجوس ہوتے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ محبت نہیں کرتے۔“ اماں نے اسے پھر سے تسلی دینا چاہی، وہ مسکرا دی۔

”کاش صرف جذبات کے اظہار میں کنجوس ہوتا تو شاید اتنی مشکل نہ ہوتی، مگر وہ تو ہر معاملے میں ہی کنجوس ہے۔“
دل میں آئی یہ بات وہ کہہ نہ سکی، کیونکہ اب وہ مزید بحث کے موڑ میں نہ تھی۔ جانتی تھی اس کے جواب دیتے ہی اماں بی نے پھر سے اخلاقیات کی چٹاری کھول کر اس میں سے کچھ نہ کچھ نکال لیتا تھا۔

”اچھا بیٹا اللہ حافظ۔“

اسے خاموش دیکھ کر اماں بی نے سر پر ہاتھ رکھ کر خود سے قریب کیا۔ ”بچوں کی چھٹی والے دن تم بھی وقت نکال کر آ جانا واپس احسان چھوڑ دے گا۔“

”جی اچھا۔۔۔۔۔“

وہ گھر کی دہلیز پر کھڑی اپنی ماں کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک احسان کی چھوٹی سی گاڑی گلی کے موڑ سے گھوم کر نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔



برستی بارش کی آواز نے اس کی سوئی ہوئی ساعتوں کو بحال کر دیا۔ وہ یک دم اٹھ بیٹھی۔

”باہر بارش ہو رہی ہے۔“

وہ بھاگ کر کھڑکی کے قریب آئی، جلدی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ نیچے پارٹمنٹ کے لان میں برستی بارش کی بوندیں ایک عجیب سی بہار کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی ہریالی ماحول کو مزید خوب صورت اور دلکش بنا رہی تھی۔ وہ مبہوت سی ہو کر کھڑکی کے قریب جم سی گئی، بارش ہمیشہ سے ہی اس کی کمزوری رہی تھی، مگر بارش میں اتنا خوب صورت منظر شاید آج وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

”اسے نیچے لان میں جانا چاہیے۔“

آس پاس کے پارٹنرش کی کچھ خواتین بھی نیچے لان میں آگئی تھیں۔ وہ پاؤں میں چپل پہن کر تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔

”ارے بیٹا، کہاں جا رہی ہو..... سنو تو سہی۔“

اسے بھاگتا دیکھ کر سیکنہ نے فوراً سے پیشتر ہی داخلی دروازے کے قریب ہی جا دھرا۔

”سردیوں کی بارش ہے، مت جاؤ بیمار پڑ جاؤ گی۔“

سیکنہ کے لہجہ میں جھانکتی فکر اور تشویش نے اس کے قدم سُست کر دیئے۔ وہ وہیں ٹھم گئی اسے محسوس ہوا جیسے یہ آواز اور الفاظ اس کی ماں کے ہوں۔ اس احساس کے دل میں آتے ہی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

وہ واپس پلٹ آئی، سارا گھر پکوڑوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ مگر اب اسے کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بارش اور بارش کے پکوان وہ سب کچھ یکسر بھلا چکی تھی۔ اسے اگر کچھ یاد تھا تو صرف اپنا گھر اور اس کے کچے آنگن کو گیلیا کرتی بارش۔

”اماں بارش ہو رہی ہے، میں سامنے ارم کے گھر جا رہی ہوں، اس نے پیپنگ (جھولا) ڈالی ہے اور سب دوستیں اسی کے گھر جمع ہیں۔“

وہ بھاگتی ہوئی کچن میں آئی، جہاں ماں سلور کا کٹورا ہاتھ میں لیے کچھ گھولنے میں بری طرح مصروف تھیں۔

”چلی جاؤ، مگر جلدی آ جانا، میں تمہارے لیے گلگے بنانے لگی ہوں اور ویسے بھی شام ڈھلنے والی ہے اور بارش کا موسم تو ڈھلتی شام کو بھی رات میں بدل دیتا ہے۔ ہر طرف جلد ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ایسے عالم میں بچوں کا گلی محلے میں پھرنا اچھا نہیں لگتا۔“

ماں نے اجازت دینے کے ساتھ ہر بات تفصیل سے سمجھا دی۔

”بس ابھی تھوڑی دیر میں ہی واپس آ رہی ہوں۔“

بھاگ کر تار پر لٹکا دوپٹا اٹھا کر خود کو ڈھکتے ہوئے وہ باہر کی سمت لپکی۔ تیزی سے دروازہ کھولا۔ اس سے قبل کے قدم باہر رکھتی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کا سارا جوش و خروش سرے سے ہی ختم کر دیا۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس پلٹ آئی۔ ارم کے گھر کے باہر چوتھے پر شوکا دو، تین لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے دوست بھی اس کے جیسے اوباش تھے۔ جن کے پاس سے اس برستی بارش میں گزرنے کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔ خاموشی سے واپس پلٹ کر اپنا دوپٹا اچھی طرح جھاڑ کر تار پر پھیلا یا اور کچن کی جانب آگئی۔

”کیا ہوا لگئیں نہیں۔“ چولہا جلاتی اماں نے پلٹ کر استفسار کیا۔

”نہیں باہر خاصا اندھیرا ہو چکا ہے۔ آپ گلگے بناؤ، مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“

گھی میں آٹا ڈالتے ہی گلگلوں کی خوشبو سے صحن مہک اٹھا۔ وہ مردہ قدموں سے چلتی کچن سے واپس نکل آئی اور صحن میں رکھی لکڑی کی کرسی پر جا بیٹھی۔ اسے سمجھ نہ آیا یہ منحوس شوکا آخر اس کے پیچھے ہی کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا۔ جبکہ وہ تو شروع دن سے ہی چپ چاپ سیدھے راستے سکول جانے اور آنے کی عادی تھی۔ وہ تو راستے میں دوسری لڑکیوں کی طرح ہنسی، ٹھٹھول بھی نہیں کرتی۔ پھر یہ مصیبت اسی کے گلے کیسے پڑ گئی۔ دل چاہا ماں کو سب کچھ بتا دے۔ مگر کیا فائدہ یہ ہی سوچ کر خاموش ہوئی۔

”یہ لو.....“ اماں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

”لے کر اندر چلی جاؤ، باہر سب کچھ گیلا ہو جائے گا۔“

کچھ دیر قبل والی ہلکی بوند باندی اب تیزی بارش میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔ یک دم ہی لائٹ چلی گئی اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اتنے اندھیرے میں ہونے والی ایسی تیز بارش اسے سخت ناپسند تھی۔

”اچھا ہوا جو تم نہیں گئیں، ورنہ اب اتنے اندھیرے میں تمہیں لینے کے لیے مجھے ارم کے گھر جانا پڑتا۔“
اماں نے لائٹیں کاشیشہ بٹاتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ وہ بنا کوئی جواب دیئے پلیٹ تھامے اندر کمرے کی جانب بڑھ گئی۔



ملک صاحب کی اچانک، اس وقت آمد شاید ان دونوں کے لیے ہی قدرے غیر متوقع تھی۔ ایصال نے پلٹ کر مہار پر ایک نظر ڈالی۔ جو تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی۔ وہ ڈر رہی تھیں کہ کہیں ملک صاحب نے کچھ سن تو نہیں لیا۔ لاکھ وہ ایصال کو ہر وقت اس رشتہ کے خلاف بھڑکانیں، مگر پھر بھی وہ کئی سال قبل ملک صاحب کی طرف سے طلاق کی دی جانے والی دھمکی نہ بھولی تھیں۔ انہیں خدشہ لاحق ہوا، کہیں ایصال کوئی غلط بات نہ کر دے۔

”کیا ہوا بھئی، یہ تم دونوں ماں، بیٹا یک دم اتنے خاموش کیوں ہو گئے ہو۔“

اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر ملک صاحب نے مسکراتے ہوئے دونوں پر ایک نظر ڈالی۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا.....“

”جی پاپا..... دراصل میں اریشہ کی ضد کی بات کر رہا تھا۔“

ایصال کو لگا آج اسے قدرت نے ایک بہترین موقع فراہم کیا ہے جو اگر ہاتھ سے نکل گیا تو شاید وہ دوبارہ نہ ملے گا۔

”ہاں..... میں نے بھی یہ بات کئی بار نوٹ کی ہے۔ وہ خاصی ضدی اور خود سر لڑکی ہے۔“

ایصال کے ساتھ اریشہ کی دوستی پاپا کو کبھی بھی پسند نہ آئی تھی اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر اس وقت اس کا مقصد پاپا کی اریشہ سے متعلق رائے تبدیل کرنا نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ اپنے اور اریشہ کے سلسلے میں فاصلے بات کرنے کا ارادہ باندھ چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”نہیں پاپا..... آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت وہ جو ضد کر رہی ہے وہ غلط نہیں ہے۔“

”کیا مطلب.....“

ملک صاحب نے ایک طائرانہ نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”کوئی مطلب نہیں، بس ایسے ہی بول رہا ہے۔ آپ آکر تیار ہو جائیں، آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔“

مما اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی ہوئی فوراً آگے بڑھیں۔

”پلیز ماما..... مجھے پاپا سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ آپ ہمیں کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔“ وہ ہمت باندھ چکا

تھا۔

”کون سی ضروری بات.....“

ایسا لگا جیسے پاپا کچھ سمجھ چکے ہیں۔ انہوں نے لب بھینچتے ہوئے ایصال کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر یک دم کڑھکی

سی چھا گئی تھی۔

”پاپا مجھے شادی کرنی ہے۔“ وہ بنا سوچے کچھ تیزی سے بولا۔

”اوہ..... میں ڈر گیا، جانے کیا کہنا چاہتے ہو۔“

پاپا نے کافی دیر سے روکی ہوئی سانس باہر خارج کی اور ہنس دیئے۔

”دراصل مجھے پاپا مجھے ایشہ سے شادی کرنی ہے۔“

وہ آج ہر بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ پاپا کے چہرے سے ہنسی غائب ہو گئی۔ اور چہرے کی رنگت ہلکی سی سرخ ہو گئی، جو شاید ان کے شدید غصہ کو ضبط کرنے کی علامت تھی۔ انہوں نے اپنی ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کی۔

”آپ اندر آ کر تیار ہو جائیں، اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔“

مما ایک بار پھر دونوں کے درمیان آگئیں، ایصال کو جو کہنا تھا وہ کہہ چکا تھا۔ اب اسے پاپا کے رد عمل کا انتظار تھا۔

”تم جانتے ہو، تم مجھ سے کیا بات کر رہے ہو؟“ ممما کو پیچھے ہٹاتے ہوئے پاپا عین اس کے سامنے آ گئے۔

”پلیز پاپا..... میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں اور یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ ہے جس میں ممما کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ میری آپ سے گزارش ہے میرے کسی بھی فیصلے کی غلطی کی سزا صرف اور صرف مجھے دیں۔ اس کے نتیجہ میں اپنی زندگی برباد مت کیجیے گا، کیونکہ بالغ ہونے کے ناطے مجھے اپنی زندگی کے ہر فیصلہ کا حق حاصل ہے۔“

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم آل ریڈی ایک شادی شدہ مرد ہو، جس کی منکوہ اس انتظار میں بیٹھی ہے کہ کب تمہاری تعلیم مکمل ہو اور تم اسے پورے استحقاق کے ساتھ رخصت کروا کر اس گھر میں لاسکو۔ ایصال تم تو کئی سال قبل ہی کسی کی امانت بن چکے تھے اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے بھی تھے۔ پھر تم نے یہ سب کیوں کہا مجھ سے، یہ سب کچھ کہنے سے پہلے کیوں نہ سوچا۔“ ان کا اشارہ ایصال کی کچھ دیر قبل کہی ہوئی بات کی جانب تھا۔

”میں مجبور ہوں پاپا۔ میں ایشہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اگر آپ کو میرے فیصلے سے اختلاف ہے تو میں واپس لندن چلا جاتا ہوں۔ وہاں مجھے جاب مل گئی ہے۔ ایشہ بھی کچھ عرصہ میں وہیں آ جائے گی۔ پھر ہم دونوں کسی اسلامک سنٹر میں جا کر نکاح کر لیں گے۔ ویسے بھی معاف کیجیے گا پاپا میرا نکاح، میری مرضی کے بغیر ہوا تھا۔ میں نے تو آج تک اس لڑکی کو دیکھا تک نہیں، میں اس کا نام نہیں جانتا، پھر بھلا میں اسے کیسے بیاہ کر اس گھر میں لاسکتا ہوں۔ سوری پاپا..... آپ جب کہیں گے میں طلاق نامہ پر سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر رخصتی نہیں کرواؤں گا۔“

ایصال کے الفاظ ملک صاحب کی توقع کے بالکل خلاف تھے۔ وہ اپنے نکاح سے ناخوش تھا۔ یہ تو وہ جانتے تھے۔ وہ ایشہ کو پسند کرتا تھا۔ انہیں یہ بھی علم تھا، مگر شاید وہ اس سے اتنے صاف انکار کی امید نہ رکھتے تھے۔ وہ ساکت کھڑے یک تنہا ایصال کو گھور رہے تھے۔ چہرے پر چھائی کرختگی بنجیدگی اور پھر پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔

”پلیز پاپا..... میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میرا ارادہ آپ کو دکھ یا تکلیف دینے کا بالکل نہیں ہے، مگر میں خود بھی مجبور ہوں۔ میں ایشہ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ پاپا اور یہ بات شاید آپ بھی جانتے ہیں۔“ وہ روہانسا ہو گیا۔

”اِس اوکے.....“ ملک صاحب نے ایک گہری سانس لی۔

”ابھی تو مجھے جانا ہے۔“ انہوں نے سامنے لگی دیوار گیر کھڑی پر ایک نظر ڈالی۔

”واپس آ کر اس موضوع پر تم سے بات ہوگی۔“

ان کا رد عمل ایسا اور ماما کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔
 ”میرا بیگ پیک کر دیا ہے۔“ پاپا نے پلٹ کر ماما کی جانب دیکھا۔
 ”ہاں جی کر دیا ہے، آپ چل کر تیار ہو جائیں۔“ ماما کے کی جانب چل دیں۔
 ”میری تم سے صرف ایک درخواست ہے بیٹا، باپ ہونے کے ناطے اگر تم اسے مانو تو.....“ ماما کے باہر نکلتے ہی وہ ایسا ل کے قریب آ گئے۔
 ”جی پاپا..... بولیں۔“

دل ہی دل میں خوف زدہ ہوتے ایسا ل نے آہستہ سے جواب دیا۔
 ”مجھے تمہاری اریشہ سے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔“
 ایسا ل کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولے۔
 ”میں اگر تمہاری ماں کی بیٹی کو تمہارے لیے قبول کرنے پر تیار ہوں تو تم بھی میری بیٹی کو طلاق نہیں دو گے۔ اس وقت تک جب تک تم اس سے ایک ملاقات نہ کر لو۔“
 پاپا کی عجیب و غریب شرط اس کی سمجھ میں نہ آئی۔
 ”ٹھیک ہے پاپا، مجھے منظور ہے۔“
 بظاہر اس شرط میں کوئی تباہی نہ تھی۔
 ”مگر میں اپنی شادی سے قبل اس سے ملنا نہیں چاہوں گا۔“ ملک صاحب کا آخری ترپ کا پتا بھی ناکام ہو گیا۔
 ”تم جب دل چاہے اس سے ملو، مگر طلاق اسے ملنے کے بعد ہی دو گے۔“
 اپنی بات ایک بار پھر سے دہراتے ہوئے وہ لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ ایسا ل کے لیے ان کی رضامندی بھی کافی تھی۔
 اس نے پاپا کے باہر نکلتے ہی جیب سے موبائل نکالا، تاکہ اریشہ کو فون کر کے اپنی کامیابی کی خبر سنائے۔ فی الحال اس کا ارادہ پاپا کی شرط سے متعلق اسے کچھ بھی بتانے کا نہ تھا۔



”مجھ سے مل سکتی ہو۔“
 فون کے دوسری جانب یقیناً سالار تھا۔ جس کی آواز وہ لاکھوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی۔
 ”کب.....“
 اتنے دنوں بعد سالار کی آواز سن کر اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے شاید اپنی آواز زندگی ہوئی بھی محسوس ہوئی۔

”جب تمہیں آسان لگے، مگر جلد ہی.....“
 ”گھر آ جاؤں؟“
 ”نہیں میں تم سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔“ جواب دہن کی توقع کے عین مطابق تھا۔
 ”کل صبح میں آ جاؤں؟“
 مریم کو سکول چھوڑنے کے بعد کم از کم دو گھنٹے وہ سالار کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ جس کا علم فرہاد کو نہیں ہو سکتا تھا۔

”نہیں کل صبح تو شاید ہم اسلام آباد جا رہے ہیں، وہاں مجھے ویزے کے لیے اپلائی کرنا ہے، ایک، دو دن لگ جائیں گے۔“ ہم سے مراد یقیناً سالار اور نازیہ دونوں تھے۔

”خیریت..... کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟ اور ہاں نازیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

”نازیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسے باہر علاج کے لیے لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اس کا بڑا بھائی میری پوری مدد کر رہا ہے۔ بہر حال وہ تو جب تم مجھ سے ملو گی ہر تفصیل بتا دوں گا۔ فی الحال مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے اور میں چاہتا ہوں لندن جانے سے قبل تم سے لازمی ملاقات کر لوں۔“

”ٹھیک ہے اسلام آباد سے واپس آ کر مجھے اطلاع کر دینا، میں آ جاؤں گی۔“

سالار کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک فیصد بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر اس کے لہجہ میں کچھ ایسا ضرور تھا جس نے زینب کو بے چین سا کر دیا۔

”شکریہ زینب تم نے میری بات کا مان رکھ لیا۔ ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ انکار کر دو گی۔“

”میں نے آپ کی کسی بھی بات کو ماننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔“ وہ جتلاتے ہوئے بولی۔

”مجھے علم ہے بہر حال اپنا خیال رکھنا، واپس آنے کے بعد ان شاء اللہ تم سے ملاقات ہوگی اور پھر تم گھر کا ایک چکر بھی ضرور لگانا، نازیہ بہت یاد کر رہی ہے۔“

”ہاں ان شاء اللہ ضرور آؤں گی۔“

”اچھا خدا حافظ۔“

سالار کچھ جلدی میں تھا۔ اس نے فون بند کر دیا۔ وہ اس سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟ اس سلسلے میں زینب نے اپنے دماغ پر زیادہ زور نہیں دیا۔



”بی بی جی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے؟“

”مجھ سے ملنے؟“ حبیہ نے حیرت سے استفسار کیا۔

”کون کرن ہے؟“ خون ہی سوال کر کے جواب بھی دے دیا۔

”نہیں جی، کوئی صاحب ہیں۔“

اتنی صبح صبح اس سے یہاں اس اجنبی شہر میں کون ملنے آ گیا۔

”بی بی جی میں نے تو انہیں خود آج پہلی بار دیکھا ہے۔ ورنہ آپ سے ملنے یا تو کرن بی بی آتی ہیں یا آپ کے چاچا جی، اتنا اسمارٹ بندہ تو کبھی آپ سے ملنے نہیں آیا۔“ اسے خاموش دیکھ کر جیلہ پھر سے شروع ہو گئی۔

”اچھا تم جاؤ، میں آرہی ہوں۔“ وہ کسلمندی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ پہلے فریش ہو لیں، پھر اچھا سا تیار ہو کر آئیے گا۔“

اسے ہدایت دیتے ہی جیلہ غراب کر کے دروازے کے باہر غائب ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ آنے والا ضرور ویٹنگ روم میں ہوگا اور یقیناً جیلہ کو میڈم نیمہ نے ہی بھیجا ہوگا۔ کیونکہ وہ خاصی با اصول خاتون تھیں اور اس طرح ہر ایریا غیر اس ویمن ہوسٹل میں آ کر کسی لڑکی سے نہیں مل سکتا تھا۔

اک ساگر ہے زندگی

حبیبہ نے کھڑے ہو کر دیوار گیر آئینہ میں اپنا مکمل جائزہ لیا۔ بال اچھی طرح کنگھی کیے اور قریب ہی رکھا دوپٹا اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ سلپہر میں پاؤں پھنسائے وہ دیننگ روم کی جانب آگئی۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے نظر آنے والی شخصیت پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی جگہ ٹھک کر رک گئی۔ کچھ بھی سہی اسے کبھی بھی اس ہوٹل میں اس طرح شاہ زین کی آمد متوقع نہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ دیننگ روم میں اس کا منتظر شخص شاہ زین ہوگا۔

”سر آپ.....“

مارے حیرت کے اس کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا، شاہ زین اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی میں.....“ وہ ہنس دیا۔

”آپ کو کس نے بتایا، میں یہاں رہتی ہوں۔“

اسے سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی حیرت کا اظہار کس طرح کرے۔

”جودل میں رہتے ہوں ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔“

دل میں آیا یہ جملہ وہ لمبوں تک نہ لاسکا۔

”پلیز سر آپ بیٹھیں.....“ اسے خاموش کھڑا دیکھ کر حبیبہ فوراً آگے بڑھی۔

”پپی برتھ ڈے حبیبہ، مینی مینی پپی ریٹرنس آف دا ڈے، ہمیشہ خوش رہو۔“ وہ جیسے ہی اس کے قریب پہنچی، شاہ زین نے اپنی کمر کی طرف کیا ہوا سیدھا ہاتھ ایک دم اس کے سامنے کر دیا۔ جس میں تازہ گلابوں کا خوب صورت کپے تھاما ہوا تھا۔

جنہیں دیکھتے ہی وہ کھل اٹھی۔ سرخ گلاب ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہا تھا۔

”تھینک یو سر، تھینک یو سوچ، آپ کو کیسے پتا چلا آج میری برتھ ڈے ہے۔“

سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ مارے خوشی سے اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں، جنہیں اس نے اپنے ہاتھ کی

ہتھیلی سے فوراً ہی صاف کر لیا۔

”پہلے تو تم مجھے یہ سر..... سر کہنا بند کرو، کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کوئی ساٹھ سالہ بزرگ شخص ہوں۔ جس

کی عزت افزائی تمہارے جیسی خوب صورت لڑکی مسلسل سر، سر کی گردان سے کر رہی ہے۔“

اپنی مسکراہٹ ہونٹوں کے کنارے دہاتا وہ شرارت سے مسکرایا۔

”او کے سر..... سوری شاہ زین۔“

اپنی غلطی فوراً ہی محسوس کرتے وہ یک دم کھلکھلا کر ہنس دی، مدھر گھٹٹیوں کی آواز شاہ زین کے چاروں اور پھیل گئی۔

”میں نے تمہاری وارڈن سے بات کر لی ہے۔ تم چندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے پارکنگ میں آ جاؤ۔ ہم بریج کے لیے

جار ہے ہیں۔“

قریبی ٹیلی پر رکھی گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھاتے ہوئے اس نے حبیبہ کو ہدایت دی۔

”اکیلے.....“

وہ شاید تھوڑا سا نزوس ہو گئی تھی یا شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا۔ ”آپ کہیں تو پورے آفس کو ساتھ لے لیتے ہیں۔“

”نہیں سر..... مطلب شاہ زین.....“ وہ پھر سے بوکھلا گئی۔

”ڈرومت حبیبہ میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔“

شاید شاہ زین کو اس کا اس طرح کا رد عمل کچھ ناگوار لگا۔
 ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں، میں کسی سے نہیں ڈرتی اور مجھے اپنی اس خوبی پر فخر ہے۔ اس کے علاوہ آپ شاید بھول گئے ہیں۔ آپ کے ساتھ دو، تین بار پہلے بھی اکیلے سفر کر چکی ہوں، بنا کسی ڈر و خوف کے ویسے ایک بات بتائیں آپ کو کیسے پتا چلا آج میری برتھ ڈے ہے۔“
 اسے اپنا سوال ایک بار پھر سے یاد آ گیا۔
 ”کرن نے بتایا تھا، ورنہ میں کوئی نجومی نہیں ہوں، اب تم ذرا جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جاؤ، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

شاید آج پہلی بار حبیبہ کو شاہ زین کا خود کو اتنی اہمیت دینا بہت اچھا لگا، وہ تو ان سب باتوں کی بالکل عادی بھی نہیں تھی۔ بہن، بھائی اس کا کوئی تھا نہیں اور زیادہ دوست بنانے کی وہ بالکل قائل نہ تھی اور یہ سالگرہ وغیرہ بنانا بھی اس کے نزدیک انتہائی فضول سی رسم تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آج اسے پہلی بار ہوا اور اس کا کریڈٹ یقیناً شاہ زین کو ہی جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج وہ شاہ زین سے کوئی ایسی بات نہ کرنا چاہتی تھی جو اسے بری لگے۔ پندرہ منٹ میں ہی اچھا سا تیار ہو کر نیچے آ گئی، جہاں گاڑی سے ٹیک لگائے شاہ زین اس کا منتظر کھڑا تھا۔ ایک نظر حبیبہ کا بغور جائزہ لیتے اس نے فرنٹ ڈور کھول دیا۔ اس کے اندر بیٹھنے ہی گاڑی سبک خرامی سے چلتی مین روڈ پر آ گئی۔

”پہلے تو میرا ارادہ آج تمہیں اپنے گھر لے کر جانے کا تھا، تاکہ مامی سے اچھی طرح مل لیں، کیونکہ وہ اکثر ہی تمہارا پوچھتی رہتی ہیں۔“

گاڑی کے اندر پہلی حمیر خاموشی کو شاہ زین نے اپنی گفتگو کے آغاز سے توڑنے کی کوشش کی۔

”اچھا..... مگر وہ مجھے کیسے جانتی ہیں؟“ شاہ زین کی بات نے حبیبہ کو خاصا حیران کر دیا۔

”جب وہ آفس آتی ہیں ہمیشہ تو تمہیں دیکھتی ہیں۔“ شاہ زین نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”اچھا..... لیکن وہاں تو اور بھی بہت سارے ورکرز ہوتے ہیں، پھر خاص میرا ہی کیوں پوچھتی ہیں۔“ اس کی حیرت اپنی جگہ برقرار تھی۔

”اس لیے کہ ان تمام ورکرز میں تم سب سے زیادہ خوب صورت ہو اور میری ماں کو ہمیشہ خوب صورت لوگ اٹریکٹ کرتے ہیں۔“

اپنی ماما کے مسلسل تفتیشی عمل سے شاید اس نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔

”اچھا.....“

”مگر پھر اچانک ماما کو کسی ضروری کام سے کہیں جانا پڑ گیا تو سوچا کیوں نہ تمہیں باہر لے جا کر ایک چھاسا ناشتہ کرا دوں، ویسے تم چائیز تو کھاتی ہونا۔“

اس نے گاڑی سی دیو جانے والی روڈ پر ڈال دی۔

”ہاں بہت شوق سے۔“ حبیبہ کا جواب ابھی بھی مختصر سا ہی تھا۔

”اگر تم بور ہو رہی ہو تو ہم کرن کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں ایک سے دو بھلے۔“ اس کی خاموشی سے شاہ زین نے یہی

نتیجہ نکلا۔

”نہیں میں بور نہیں ہو رہی اور ہم پہلے بھی دو ہی ہیں۔“
 حبیبہ کا سادگی سے کہا گیا جملہ پل بھر میں ہی شاہ زین کو خوش کر گیا۔
 ”چلو شکر ہے، ورنہ میں تو ڈر رہا تھا کہ شاید آج کے بعد تم کبھی بھی میرے ساتھ کہیں نہیں جاؤ گی۔“
 حبیبہ اس کی بات سن کر ہلکا سا مسکرا دی۔
 ”ویسے کیا آپ کی ماما کو علم ہے کہ آج آپ مجھے میری برتھ ڈے کی خوشی میں ٹریٹ دینے کسی ریسٹورنٹ میں لے جا رہے ہیں۔“
 اپنے سیل فون میں مصروف حبیبہ کو شاید اچانک ہی یہ خیال آ گیا۔
 ”نہیں اور ویسے بھی اب ہر کام اپنی ماں کو بتا کر کرنے والی عمر گزر گئی ہے۔ اب میں جو کچھ کرتا ہوں پوری خود مختاری سے کرتا ہوں۔“
 ”اوہ.....“

حبیبہ نے صرف اتنا ہی کہا اور پھر سارے راستے ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ شاہ زین خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا، جبکہ حبیبہ جانے فون پر کس سے مصروف تھی کہ گاڑی رکنے تک اس نے سر اٹھا کر بھی شاہ زین کی جانب نہیں دیکھا اور پھر گاڑی پارک کرتے ہی وہ شاہ زین کی سنگت میں دو دریا کے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں داخل ہو گئی۔



”جلدی کرو، اگر ناشتا تیار ہے تو دے دو، ورنہ میں جاؤں، مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ فرہاد نے کچن کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر آواز لگائی۔
 ”میں لا رہی ہوں۔“ زینب نے جلدی جلدی پراٹھے پر کچی لگایا اور قریبی رکھے انڈے میں باریک باریک پیاز کترنے لگی۔

”تم کیا رات برتن دھو کر نہیں سوتیں، کس قدر ڈھیر لگا ہوا ہے۔“
 کچن میں رکھا برتنوں کا ڈھیر فوراً ہی اس کی تنقید کا نشانہ بن گیا اور ناگواری سے ناک سکوڑتے ہوئے بولا۔
 ”آج رات میں جلدی سو گئی تھی۔“ زینب نے وضاحت کرتے ہوئے پراٹھا توڑے سے اتارا۔
 ”ہمیں یاد ہے، ہماری ماں ہمیشہ کچن صاف کر کے سوتی تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں کچن میں رات بھر پڑے برتن بے برکتی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اب ہماری بہن کو بھی دیکھ لو، کبھی تمہیں اس کے کچن میں اس طرح برتن پڑے دکھائی نہ دیں گے۔“

”ان کے گھر مدد کے لیے کام والیاں موجود ہیں۔ وہ خود تو شاید کبھی گھر کا کوئی کام کرتی بھی نہیں ہوں گی اور مجھے ہر کام خود کرنا پڑتا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی زینب کا لہجہ تیز ہو گیا۔
 ”تو یہ کون سی انوکھی بات ہے، تمہاری ماں، بھابی سب ہی اپنے گھر کے کام خود کرتی ہیں۔ ان کے ہاں کون سی ملازمائیں ہیں۔“ فرہاد نے ترکی پر ترکی جواب دیا۔
 ”میں نے دیکھا ہے تمہارے ہاں زیادہ صفائی کا رواج نہیں ہے۔ سب ایسے ہی گندے ہیں۔“ ابھی وہ مزید زہر افشانی کرتا کہ اچانک ہی اندر لاؤنج میں رکھا فون بج اٹھا۔

”یہ صبح کس کا فون آگیا۔“

زیر لب بڑبڑاتا وہ لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔ نینب نے شکر ادا کیا، ورنہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ گھر جنگ کا منظر پیش کرنے جا رہا تھا۔ پراٹھا اتار کر ہاٹ پاٹ میں ڈالا۔ جلدی جلدی آلیٹ بنایا۔ رات کا سالن گرم کر کے وہ لاؤنج میں ہی آگئی جہاں فرہاد کرسی پر بیٹھا بڑے مطمئن اور سرشار انداز میں کسی سے گفتگو فرما رہا تھا۔ یقیناً فون کے دوسری جانب اس کی بہن تھی، جس کا بخوبی اندازہ فرہاد کے چہرے پر پھیلی خوشی کی کیفیت کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔

نینب نے ناشتا لکڑی کی ٹیبل پر رکھا اور خود کچن میں واپس آگئی۔ چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر برتن دھوئے اور پھر کچن صاف کیا۔ جالی سے باہر جھانکا فرہاد ابھی بھی فون پر ہی مصروف تھا۔ اس نے دو کپ چائے تیار کر کے ٹرے میں رکھی اور ایک بار پھر سے لاؤنج میں آگئی۔ فرہاد شاید بھول گیا تھا کہ اسے کسی کام سے جانا تھا اور کچھ دیر قبل وہ خاصی جلدی میں تھا۔

نینب ہٹائو کے خود ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئی۔ پراٹھا ختم کر کے اس نے چائے پی اور پھر اپنے برتن اٹھا کر کچن میں آگئی۔ فرہاد کی چائے واپس کیتلی میں انڈیل دی۔ اسے فرہاد اور یاسمین آپا کی گفتگو سننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کچن بند کر کے وہ باہر آگئی تو فرہاد فون رکھ چکا تھا۔

”تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ فضلہ بھابی بھی واپس آگئی ہیں۔“

فون بند کرتے ہی اس کی توپوں کا رخ نینب کی جانب مڑ گیا۔

”مجھے ان کی واپسی کا علم ہوتا تو یقیناً آپ کو بھی ضرور بتاتی اور ویسے بھی مجھے آپ کی بھابی کے شیڈول سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔“ نینب کے منہ کے کپڑے زراویہ نے فرہاد کو تپا دیا۔

”ظاہر ہے تمہاری دلچسپی صرف اپنے لوگوں تک ہی محدود ہے۔“

فرہاد کسی بھی طور مقابلے میں پیچھے رہنا نہ چاہتا تھا۔

”میں نجومی نہیں ہوں فرہاد اور مجھے کسی کی بھی آمد و رفت کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ بتایا نہ جائے اور اطلاعاً عرض ہے مجھے فضلہ بھابی نے اپنی واپسی کی کوئی خبر نہیں دی۔“ جواب دیتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بہر حال آپا نے کہا ہے کہ ہمیں ان سے ملنے جانا چاہیے تو ایسا کر تم شام میں تیار ہو جانا ہم جا کر مل آئیں گے۔“

”معذرت کے ساتھ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ خود جا کر ہو آئیں۔“ فرہاد کی باتوں نے نینب کے اچھے بھلے موڈ کو خاصا خراب کر دیا تھا۔

”جیسی تمہاری مرضی۔“

چائے کا آخری گھونٹ بھر کر اس نے کپ واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ نینب اندر کمرے میں آگئی۔ اسے محسوس ہوا وہ اگر مزید وہاں رہی تو ضرور فرہاد سے الجھ جائے گی۔

”بہر حال اب اگر فرہاد نے مجھ سے فضلہ بھابی کے گھر جانے کے لیے کہا تو صاف انکار کر دوں گی۔“

اسے سخت غصہ آیا۔ اتنی دور بیٹھی یاسمین آپا کو ان کی واپسی کا علم ہو گیا اور یہاں فضلہ بھابی نے بتانے کی زحمت نہ کی، میں تو فرہاد کو صاف منع کر دوں گی کہ جب انہوں نے ہمیں خود اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تو ہمارے ملنے جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ رات تک یہی ارادہ باندھتی رہی، مگر فرہاد کے گھر آتے ہی اس کے تمام ارادہ چکنا چور ہو گئے۔

”یہ کچھ سامان ہے جو تمہارے لیے صباحت بھابی نے بھیجا ہے۔ فضلہ بھابی بھی تمہارے اور بچوں کے تحائف دے

رہی تھیں، لیکن پھر بولیں، میں خود جب ملنے آؤں گی تو لیتی آؤں گی۔“
اندرواغل ہوتے ہی فرہاد نے ایک شاپر اس کی جانب بڑھایا۔ جسے خاموشی سے تمام کر ننب نے بنا دیکھے ہی قریب موجود چھوٹی سی لکڑی کی ٹیبل پر رکھ دیا۔

”کھانا گرم کر دوں؟“ حلق میں آئے آنسو، شکل نکلتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔
”نہیں میں کھا کر آیا ہوں اور یہ کھول کر دیکھ تو لو بھابی نے کیا بھیجا ہے۔“ اس کا اشارہ یقیناً ٹیبل پر رکھے شاپر کی جانب تھا۔

”ابھی فارغ ہو کر دیکھوں گی۔“ وہ لڑنے کے موڈ میں بالکل نہ تھی۔

”ما شکری عورت.....“

کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے فرہاد طنزاً بڑبڑایا، ننب نے بالکل انکور کر دیا۔ فرہاد کا موڈ جانے کیوں آج صبح سے ہی خراب تھا اور جب کبھی ایسا ہوتا وہ بہانے بہانے سے لڑنے کی کوشش کرتا جیسے آج صبح سے ہی کئی بار کر چکا تھا۔ اس وقت ننب کا کمرے میں جانا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہ وہیں لاؤنج میں موجود ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی، جہاں کوئی پاکستانی فلم آرہی تھی۔ فلم ختم ہوتے ہوتے رات کے تین بج گئے۔ ننب نے ٹی وی بند کر کے ایک نظر کمرے کے بند دروازے پر ڈالی۔ فرہاد یقیناً سوچکا تھا۔ وہ آہستہ آواز میں دروازہ کھول کر کمرے میں آئی اور خاموشی سے بیڈ کے کنارے تک کمرے کی کوشش کرنے لگی۔



سکول سے باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ روڈ کے دوسری جانب پڑی جہاں فٹ پاتھ پر دو عجیب لوہرے سے نوجوان کھڑے تھے۔ جن میں سے ایک یقیناً شوکا تھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے۔

شو کے پر نظر پڑتے وہ ذریعہ بڑبڑائی، ساتھ ہی مارے خوف کے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں سے جان ہی نکل گئی ہو آج ارم بھی سکول نہیں آئی تھی اور اب گھر واپسی کا تقریباً پندرہ منٹ کا سفر اسے اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ اس نے اپنے گرد اچھی طرح دوپٹا لپیٹا اور ہمت باندھتی ہوئی روڈ کراس کی، شو کے، کے قریب سے گزرتی ہوئی وہ مین روڈ پر آگئی۔ اس سے آگے پیچھے سکول کی کچھ لڑکیاں بھی اپنے گھروں کو رواں دواں تھیں۔ ویسے بھی یہ روڈ خاصی بارونق ہوا کرتی تھی۔ اصل مسئلہ تو اپنی گلی کا تھا، جو ہر نام ہی مکمل طور پر سنسان ہوتی۔ تیز تیز چلتے اسے سانس چڑھ گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے شوکا اس کے پیچھے ہی آرہا ہو۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ اپنے گھر جانے والی پہلی ہی گلی کی جانب مڑ گئی۔ جب اچانک تیز تیز چلنا شوکا اس کے بالکل سامنے آگیا۔

”سوہنوسی میرے سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟“

اپنے کندے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا وہ اک ادا سے بولا۔

”تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے جو تم سے ڈروں۔“

اپنے کپکپاتے لہجے پر قابو پاتے ہوئے وہ ذرا زور سے بولی۔

”ہاہاہا..... اچھا.....“

ایسے جیسے شو کے نے اس کے جواب کو خوب انجوائے کیا۔

”پھر اتنا بھاگ بھاگ کر گھر کیوں جا رہی ہو، میں تمہیں کھاتھوڑی جاؤں گا۔“ وہ اس کے مزید قریب ہوا۔

”میرے آگے سے ہٹو۔۔۔۔۔“

وہ چلائی اور تیز تیز چلتی آگے بڑھ گئی۔ تین گھر چھوڑ کر چوتھا اس کا تھا۔ بھاگتی ہوئی گھر کی دہلیز عبور کرتی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی سامنے ہی محن میں اماں کھڑی تھیں۔ اس کی سانس ابھی تک بحال نہ ہوئی تھی۔

”کیا ہوا تمہیں، کیوں اتنا گھبرائی ہوئی ہو۔“

اس کے چہرے پر اڑتی ہوئیاں انہیں دور سے ہی دکھائی دے گئیں۔

”کچھ نہیں، گرمی لگ رہی ہے۔“

منہ پر آیا پسینہ دوپٹے سے پونچھتی وہ اندر چل دی۔ اماں نے بالٹی میں رکھا آخری کپڑا تار پر ڈالا اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئیں۔

”تم نے کھانا نہیں کھانا۔“ وہ ہمیشہ گھر آ کر کھانے کا شور مچایا کرتی تھی۔

”بھوک نہیں ہے۔“

شو کے کی آج والی حرکت نے اس کی بھوک پیاس سب ختم کر دی تھی۔ مارے خوف کے ابھی تک اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

”تمہیں شو کے نے کچھ کہا ہے؟“

اماں یک دم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں لرزتی خوف کی پرچھائیاں اسے صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

اپنی ماں کے اس قدر درست اندازے نے اسے حیران کر دیا۔ اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس نے اماں سے کبھی شو کے کا کوئی ذکر کیا ہو۔ پھر ماں نے اس سے ایسا سوال کیوں کیا۔ وہ حیرت زدہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ”اماں آپ کو شو کے کا کس نے بتایا۔“

”میں ماں ہوں تمہاری، مجھے تمہارے ہر عمل پر نظر رکھنا پڑتی ہے اور یہ میری ذمہ داری ہے۔ بارش والے دن تمہارا خوف کے مارے دروازے سے واپس پلٹ آنا میں کبھی نہیں بھولی، پھر ایک، دو دفعہ تم سے سرزد ہونے والی حرکات نے مجھ پر واضح کیا کہ تم شو کے سے خوف زدہ ہو، کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔“

انہوں نے مسلسل اسے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ان کی آواز بھی شاید ہلکی سا کپکپا رہی تھی۔

”وہ بہت بد تمیز لڑکا ہے، بنا کسی رسپانس کے جانے کیوں مجھے تنگ کر رہا ہے۔“

”میں اس کے گھر جا کر اس کی ماں سے بات کروں گی، آخر یہ پورا محلہ بچپن سے مجھے جانتا ہے۔ ایک عزت ہے میری اس محلے میں پھر کس طرح محلے کا کوئی ادبائش نوجوان میری بچی کو اس طرح تنگ کر سکتا ہے۔“

”چھوڑ دیں اماں، آپ کسی سے کوئی بات نہیں کریں گی، ایسا نہ ہو آپ کے منہ سے نکلنے والی کوئی بات بلا سبب مجھے اس محلے میں بدنام کرنے کا باعث بن جائے اور ویسے بھی جو اولاد اپنے ماں، باپ سے ڈرتی ہو یا ان کا عزت و احترام کرتی ہو وہ

یہ جیسی نہیں ہوتی۔“

وہ درست کہہ رہی تھی اماں کی سمجھ میں اس کی بات آگئی۔
 ”پھر بتاؤ، بھلا اس مسئلہ کو کیسے حل کروں، ہماری خاموشی تو اس بد معاش کو مزید شدہ دے گی وہ ہمیں مجبور اور بے بس سمجھ کر مزید شیر ہوگا۔“ بے بسی اماں کے لہجہ میں درا آئی۔
 ”کچھ نہیں ہوتا، اماں اللہ پر بھروسہ رکھیں۔“ وہ ماں کو مزید خوف زدہ نہ کرنا چاہتی تھی۔
 ”کھانا گرم کریں، میں یونیفارم تبدیل کر کے آ رہی ہوں۔“ ماں کا دھیان شو کے سے ہٹانا اس وقت اشد ضروری تھا۔
 ”اچھا.....“

اماں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالی اور بکن کی جانب چل دیں۔

○.....◇.....○

”بس بھائی صاحب آپ خود ہمارے گھر آگئے۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“
 ماموں نے ہاتھ اٹھا کر ممانی کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ ایصال نے اپنی کافی دیر سے روکی ہوئی سانس بحال کی۔
 اسے خدشہ تھا کہیں ممانی اس موقع پر اس کے سابقہ نکاح کا حوالہ دے کر کوئی بات خراب نہ کر دیں، مگر ماموں جان کی بروقت مداخلت نے اس کا یہ خدشہ فوراً دور کر دیا۔ ایصال کے ساتھ ساتھ ماما کے چہرے پر بھی اطمینان سا پھیل گیا۔
 ”پھر میں آپ کی طرف سے ہاں سمجھوں؟“

پاپا کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہی ممانو اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولیں۔ ایصال نے بغور پاپا کی جانب نکا، ان کے چہرے پر پھیلی الجھن وہ واضح طور پر محسوس کر سکتا تھا۔
 ”میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ بھائی صاحب کی آمد کے بعد اب مزید کسی شک و شبہ یا انکار کی گنجائش باقی نہیں رہی، پھر بھی میں اپنی تسلی کے لیے چاہوں گا کہ.....“
 ماموں جان کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ پاپا کے سیل کی مخصوص آواز نے کمرے میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔
 ”ایک سیکنڈ می.....“

پاپا نے فون کی سکرین پر ایک نظر ڈالی اور اسے ہاتھ میں لیتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”میرا ضروری فون ہے۔“

یس کا بشن دبا کر فون کان سے لگاتے انہوں نے وضاحت کی اور پھر اسی طرح ٹیبلٹ میں نکلنے والے دروازے سے باہر نکل گئے۔ ممانے جیسے شکر کا سانس لیا۔ انہیں خدشہ تھا کہیں پاپا اپنی اس شرط کا ذکر نہ کر دیں جو انہوں نے ایصال کے سامنے اس کے نکاح کے حوالے سے رکھی تھی۔

”اریشرہ بیٹا صفیہ کے ساتھ مل کر کھانا لگاؤ۔“ ممانی نے آواز لگائی۔

”نہیں بھابی اب ہم چلیں گے۔ ملک صاحب کو کہیں ضروری کام سے جانا ہے۔“

پاپا نے یہاں آنے سے قبل ہی وضاحت کر دی تھی کہ انہیں جلد واپس گھر آنا ہے، کیونکہ آج شاید ان کی کوئی ضروری میٹنگ تھی۔ ماما کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان کے ساتھ اریشرہ کا رشتہ مانتے، ان کے بھائی کے گھر آگئے۔ حقیقت میں یہ وہ عمل تھا جس کی انہیں ملک صاحب سے اپنی زندگی میں کم از کم ایک فیصد بھی امید نہ تھی۔ مگر شاید اللہ تعالیٰ جو کچھ نصیب میں لکھ دیتا ہے وہ اسی طرح پورا ہوا کرتا ہے۔

”اپنے پاپا کو بلاؤ، گھر چلیں دیر ہو رہی ہے۔“
 ممانے ہاتھ میں پکڑا خالی گلاس سائیز ٹیبل پر رکھتے ہوئے ایٹال کو اشارہ کیا۔ ایٹال فوراً سے پیسٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ لاؤنچ
 کا دروازہ کھول کر اس نے ٹیرس میں جھانکا۔ پاپا ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ فون جانے کب کا بند ہو چکا تھا۔ اب وہ
 اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھے۔ جب انہیں ایٹال نے پکارا۔

”پاپا.....“

وہ یک دم چو گئے۔

”آجائیں ماما، بلا رہی ہیں، گھر جانا ہے۔“

”اچھا.....“ اثبات میں گردن ہلاتے وہ ایٹال کے پیچھے ہی واپس آ گئے وہ بے حد پریشان تھے۔ جس کا اندازہ ان کے
 چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ مگر اپنی خواہش کے حصول میں گمن ہر شخص انہیں جان بوجھ کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ شاید
 اپنی کامیابی اور خوشی کے لیے دوسروں کا حق چھیننا ہی زندگی ہے، ملک صاحب نے تو اس تمام عمل سے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا۔ جس
 سے وہ خامسے مایوس بھی ہوئے۔

”ہم چاہتے ہیں، آپ کوئی قریبی تاریخ دیکھ کر نکاح کی تقریب رکھ لیں، کیونکہ ایٹال نے لندن واپس جانا ہے اور میں
 چاہتا ہوں اریشہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی جائے۔“

اپنے لہجہ کو حتی الامکان نرم بناتے ہوئے پاپا نے ایٹال پر ایک نظر ڈالی۔ پاپا کے اس فیصلے کا علم بھی انہیں یہاں آ کر ہی
 ہوا۔ ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس کے لندن شفٹ ہو جانے کی دھمکی نے پاپا کو اس رشتہ پر رام کیا ہے۔ اس کا یہ خیال بھی دوسرے
 تمام خیالوں کی طرح غلط ثابت ہوا۔ اسے اندازہ ہوا اس کی سوچ ہمیشہ ہی غلط رہی ہے۔

”اچھا ہم تو سمجھے اب وہ آپ کے ساتھ کاروبار سنبھالے گا۔ ہمیں تو نہیں پتا کہ وہ لندن واپس جائے گا۔“ ممانی نے
 حیرت کے عالم میں ماما پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

”ماما یہ فیصلہ میرا ہے۔ مجھے لندن جا کر اپنا فیشن ڈیزائننگ کا ڈپلومہ مکمل کرنا ہے اور ایٹال نے میرے کہنے پر وہاں
 اپلائی کیا تھا۔ اسے اچھی جاب مل گئی ہے۔“

ایٹال کی مدد کے لیے فوراً اریشہ اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی اور اس میں کوئی مبالغہ آمیزی بھی نہیں تھی۔
 ”جیسے بچوں کا دل چاہے یہ زندگی گزاریں، ہم اور آپ کون ہوتے ہیں اعتراض کرنے والے۔“ ماموں کے ان الفاظ
 نے ایٹال کو خاصا حوصلہ دیا۔ ”آپ یہ مٹھائی رشتہ داروں میں بانٹ دیجیے گا، تاکہ سب کو علم ہو جائے کہ ہم نے ایٹال
 اور اریشہ کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔“

ممانے اریشہ کو خود سے لگا کر پیار کرتے ہوئے ممانی کو ہدایت دی۔ اس ہدایت کا کیا مقصد تھا۔ شاید پاپا سمجھ چکے تھے
 اسی لیے وہ اپنی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ اپنی خوشیوں میں گمن کسی بھی فرد نے ان کی
 خاموشی کو محسوس ہی نہیں کیا۔



وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئیں سامنے نظر آنے والے منظر نے انہیں اپنی جگہ بالکل ساکت کر دیا۔ حبیب، شاہ زین کے
 انتہائی قریب کھڑی دور سے ہی خاصی شاداں و فرحاں دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ زین جانے اسے ایسا کیا سنار ہا تھا کہ ہنسی اس

کے لبوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور ایسے میں وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ جانے کیوں انہیں یہ منظر خاصا ناگوار لگا۔ انہوں نے آفس کے ہال پر چاروں طرف ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی، دونوں کمپیوٹر آپریٹر اپنے اپنے کمپیوٹر پر بری طرح بڑی تھے۔ عمر صاحب کی ٹیبل خالی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی ہی تھیں کہ اچانک ہی کرن جانے کس سمت سے نکل کر ان کے سامنے آگئی۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئیں۔

”السلام علیکم میم! کیسی ہیں آپ.....“ کرن ان سے خاصی بے تکلف تھی۔
”وعلیکم السلام۔“

ابھی بھی وہ دونوں ان کی نگاہوں کی زد میں تھے جب اچانک حبیبہ کی نگاہ ان پر پڑ گئی۔ اس کے مسکراتے لب یک دم بھیج گئے۔ اس کے خاموش ہوتے ہی شاہ زین نے پلٹ کر دیکھا اور ماما کو کرن سے بات کرتا دیکھ کر مسکراتا ہوا ان کے قریب آگیا۔
”ارے پاپا تو ابھی ابھی کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ آپ کی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ وہ سمجھا شاید ماما، پاپا کے پاس آئی ہیں۔

”اچھا..... میں نے کہا تو تھا میرا ویٹ کریں، مگر شاید مجھے راستہ میں ٹریفک کے باعث کچھ زیادہ دیر ہوگئی، خیر کوئی بات نہیں، مجھے علم ہے وہ کہاں گئے ہیں۔“

”السلام علیکم.....“ جانے کب حبیبہ، شاہ زین کے بالکل قریب کھڑی ہوئی، انہیں پتہ ہی نہ چلا۔
”وعلیکم السلام.....“ جواب کے ساتھ ہی انہوں نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

”ماما یہ حبیبہ ہے۔ آپ جانتی ہیں نا اور حبیبہ یہ میری ماما۔“

اس موقع پر شاہ زین نے انہیں متعارف کروانا ضروری سمجھا۔

”میں جانتی ہوں، تم سے کئی بار ذکر سن چکی ہوں۔“

شاید وہ کچھ دیر قبل والی ناگوار کیفیت سے باہر آئی تھیں۔

”تم آؤ کسی دن کرن کے ساتھ ہمارے گھر یہ تو اکثر آ جاتی ہے۔“ ان کی خود پر پڑنے والی گہری نظروں نے حبیبہ کو کچھ کنفیوز سا کر دیا۔

”جی ضرور.....“

حبیبہ کو شاید ان کے اس طرح بات کرنے کی امید نہ تھی ویسے بھی وہ کرن سے ان کے پُر غرور رویہ کے بارے میں خاصا کچھ سن چکی تھی۔ جبکہ اس وقت وہ ایسی بالکل دکھائی نہ دے رہی تھیں۔

”اچھا میں چلتی ہوں تمہاری آپا کے لیے کچھ سامان بھیجنا ہے۔ ان کی ایک دوست آئی ہوئی ہے اور آج شام کی فلائٹ سے ان کی واپسی بھی ہے اور آج ہی میرا اسے ہر حال میں سامان پہنچانا اشد ضروری ہے۔“ وہ وہیں سے واپس مڑ گئیں۔

”شاید دو ماہ تک آپا بھی کراچی آئیں تو میں تمہیں ان سے ضرور ملواؤں گا۔ مجھے امید ہے ان سے مل کر تمہیں بہت اچھا لگے گا، کیونکہ وہ بہت ہی اچھی ہیں، نہایت لوتنگ اور دوسروں کا خیال رکھنے والی۔“

”اچھا.....“

مختصر سا جواب دے کر حبیبہ کرن کی جانب بڑھ گئی، جبکہ شاہ زین اسے وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔



”ایک بات پوچھوں بیٹا۔“ مڑھیلے چھیلے سیکنڈ کو جانے کیا یاد آ گیا۔

”جی آئی ضرور پوچھیں، ویسے بھی مجھ سے کچھ پوچھنے کے لیے آپ کو اس طرح اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“

تیزی سے کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے اس کا ہاتھ یک دم رک گیا۔

”تمہارے پاس ایصال صاحب کا نمبر نہیں ہے؟“

سیکنڈ کا سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ وہ حیران سی رہ گئی۔

”مطلب.....“

وہ تانجی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”مطلب ان کا فون نمبر وغیرہ.....“

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ آئی میں نے اس سے کبھی رابطہ نہیں کیا تو پھر فون نمبر ہونے کا کیا جواز بنتا ہے۔“

”پھر بھی نمبر ہونا تو چاہیے۔ آخر اتنا حق تو تمہارا بنتا ہے۔“

”مجھے اس قسم کے حق جتانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے بھی اگر اسے میری کبھی کوئی ضرورت ہوتی اتنے سالوں

میں کم از کم ایک آدھ بار مجھ سے رابطہ ضرور کرتا اور یہ سب اس کے لیے اتنا مشکل نہ تھا۔“

مطلب وہ سب کچھ جانتی تھی، سیکنڈ چوری بن گئی۔

”ویسے آپ کو آج یہ خیال آیا کیسے؟“ سیکنڈ کو خاموش دیکھ کر اس نے ایک بار پھر بات شروع کی۔

”دراصل بیٹا میرا دل چاہتا ہے کہ اتنے سالوں قبل شروع ہونے والا یہ آنکھ پھولی کا کھیل اب ختم ہو جانا چاہیے۔“ ان کا

اشارہ یقیناً اس کے نکاح کی جانب تھا۔

”تمہیں کوئی ایک فیصلہ کر لینا چاہیے۔ کتنے سالوں سے تم ایصال کے نام پر بیٹھی ہو اور جانے کب تک یوں ہی بیٹھی رہو

گی۔“ سیکنڈ نے اپنی آواز کو مزید آہستہ کیا۔

”تمہیں اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنا ہوگا۔ آریا پار..... ورنہ اس طرح تمہاری ساری زندگی یوں ہی گزر جائے

گی اور جانتی ہو لڑکیوں کی ایک عمر ہوتی ہے جب انہیں اپنے گھریلو کار کا ہو جانا چاہیے اور اگر آج تمہاری یہ عمر نکل گئی تو ہمیشہ یوں ہی

تمہا زندگی گزر جائے گی اور کسی عورت کے لیے تمہا زندگی سے بڑھ کر کوئی دوسرا عذاب نہیں ہوتا۔“

سیکنڈ آج اسے ہر بات سمجھا دینا چاہتی تھی۔

”پھر آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑے قلم پر کیپ لگا کر ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔ اب وہ

مکمل طور پر سیکنڈ کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”ایصال سے بات کرو، اگر وہ رخصتی پر آمادہ ہے تو ٹھیک..... ورنہ کوئی اور اچھا لڑکا دیکھ کر شادی کرو اور اپنا گھر بساؤ۔“

سیکنڈ نے جان بوجھ کر طلاق کا لفظ استعمال نہ کیا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”جانتی ہیں میری ماں کے ایک غلط فیصلے نے انہیں ساری زندگی تپتے ریگستان میں برہنہ پاؤں کھڑا رکھا۔ جس نے ان

کے پاؤں آبلہ پا کر دیئے..... مگر اس طرح کہ وہ اپنا دکھ اور تکلیف کسی سے کہنے کے قابل بھی نہ رہیں۔ کیونکہ انہوں نے خود

اپنے تمام رشتوں کو کھو دیا تھا، مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے اپنی ماں کے دامن پر لگا داغ دھونا ہے۔ وہ لوگ جو مجھے میری

ماں کے حوالے سے شاید ایک بدکردار لڑکی سمجھتے ہیں، انہیں بتانا ہے کہ میری طرح میری ماں بھی ایک معصوم عورت تھی جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ حالات کی سنگینی نہ برداشت کر سکی اور مردوں کے اس معاشرے میں ایک مرد سے بھی لینے والے انتقام نے اس کو انجانے میں تباہ کر دیا۔“ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”تو پھر تم کیا ساری زندگی اسی طرح گزار دو گی۔“

”جو بھی ہے آنٹی میں ایصال سے کبھی اور کسی صورت طلاق نہیں لے سکتی۔ چاہے اسی طرح اپنی عمر کی تمام بہاریں دیکھ کر میں خزاں رسیدہ ہو جاؤں۔ مگر میں کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ اس کا لہجہ جتنی تھا۔

”یہ پھر تمہاری خود اپنے ساتھ زیادتی ہو گی۔“

”آپ بس میرے لیے دعا کیا کریں۔“

وہ دوبارہ سے ہاتھ میں قلم تمام کر اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گئی۔ اس پل سکینہ کو اس چھوٹی سی معصوم لڑکی پر اس قدر ترس آیا کہ جو اس کے بس میں ہوتا وہ دنیا بھر کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتی۔ مگر یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہ تھا۔



”تم نے وجاہت کا رشتہ کہیں طے کیا۔ مطلب اس کی شادی کی یا ابھی بھی کنوارا ہی ہے۔“

آج کئی ماہ بعد خالدہ خالہ کو جانے کیوں وجاہت کا خیال ایک دم پھر سے آ گیا۔ رابعہ بھی سن کر حیران ضرور ہوئی۔ مگر بولی کچھ نہیں۔ ”وہ تو پچھلے چار ماہ سے دہلی میں ہیں کسی بڑی کنسرکشن کمپنی میں انہیں کام مل گیا تھا جو ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔“ رابعہ نے خالہ کے بیٹھنے کے لیے کرسی باہر برآمدے میں رکھتے ہوئے انہیں مکمل تفصیل سے آگاہ کیا۔

”چلو اچھا ہے..... وہاں تو سنا ہے پیسہ بھی بہت ہے۔“ خالہ نے برقعہ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا۔

”میں کھانا کھاؤں گی۔“

رابعہ کو بچن کی جانب بڑھتا دیکھ کر انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی مبادا کہیں وہ چائے نہ بنا لائے۔ کچھ دیر بعد ہی رابعہ نے کھانے کی ٹرے ان کے قریب لا کر رکھ دی۔

”ارے کر لیے گوشت تو مجھے ہمیشہ سے بہت پسند رہے ہیں۔“

سالن پر نگاہ ڈالتے ہی وہ خوشی سے کھل گئیں۔ رابعہ نے خاموشی سے پانی کی بوتل ان کے قریب لا رکھی۔

”اچھا..... یہ بتاؤ اب تمہیں وجاہت میاں کی شادی کرنی ہے یا نہیں۔“

”ظاہر ہے خالہ کرنی ہی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اچھی لڑکی مل جائے۔“

”لڑکی تو خیر بہت اچھی ہے..... بسم اللہ.....“ خالہ نے لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا۔ ”خوب صورت تو ایسی مانو ہاتھ لگائے

میلی ہو اور عمر بھی کوئی زیادہ نہیں، یہ ہی کوئی مشکل سے بائیس، تیس سال۔“

”حد ہے خالہ اتنی چھوٹی اور خوب صورت لڑکی کو ایسی کیا مشکل پیش آگئی۔ جو آپ اس کا رشتہ وجاہت بھائی کے لیے

لے آئیں۔“ خالہ کی تفصیل نے رابعہ کو خاصا حیران کر دیا۔

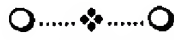
”مجبوری ہے بیٹا۔ بچی اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ ایک ماں تھی، وہ بھی فوت ہو گئی۔ اب رشتہ داروں کے در پر

پڑی ہے۔ تایا کے بیٹے سے شادی ہوئی تھی۔ وہ بھی چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا۔“

”وہ کیوں بھاگ گیا۔ اتنی خوب صورت بیوی چھوڑ کر.....“
 ”زیادہ تفصیل تو مجھے نہیں معلوم..... اتنا ضرور علم ہے وہ کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ بس اسی کی خاطر اس معصوم کو طلاق دے دی۔ وہ تو کسی بھی ایسے شخص سے شادی پر راضی ہے جو صرف اسے ایک گھر اور اس کے لیے چھت فراہم دے۔ اس بچی کی تو کوئی شرط بھی نہیں۔“

”اللہ معاف کرے..... خالہ کس قدر بے حس لوگ ہوتے ہیں۔“ رابعہ کا حساس دل دکھ گیا۔ ”مجھے امید تو نہیں ہے بھائی اتنی چھوٹی لڑکی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اب وہ جب واپس آئے تو میں ان سے پوچھوں گی ضرور۔“
 ”چلو اگر وہ مان جائے تو بتانا۔ ورنہ میں کوئی اور رشتہ ڈھونڈوں۔“
 ”جی ضرور.....“

رابعہ ان کے خالی برتن اٹھا کر کچن کی جانب بڑھ گئی۔ ”اچھا اب چائے مت بنانا، مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہوگئی۔ آج ایک لڑکی دکھانے جانا ہے۔ دعا کرو کہ کام بن جائے۔“
 ”ان شاء اللہ خالہ اگر بہتری ہوئی تو ضرور بنے گا۔ آپ بیٹھ جائیں، میں چائے بنا کر لا رہی ہوں۔“
 حسب توقع خالہ فوراً واپس بیٹھ گئیں۔



”مجھ سے شادی کرو گی؟“ سالار کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ زینب ہکا بکا رہ گئی۔
 ”آپ سے شادی.....“ پہلے تو اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔
 ”ظاہر ہے، میں کوئی فاری تو نہیں بول رہا ہوں۔“
 ”میرا خیال ہے آپ مذاق کر رہے ہیں۔“
 اس نے ہنستے ہوئے قریب رکھے جگ سے گلاس میں پانی اٹھایا۔ اس کا حلق شدید ترین خشک ہو چکا تھا۔
 ”میں اس قسم کے مذاق نہیں کرتا اور نہ ہی میری عمر مذاق کی ہے۔“ اس نے برا سامنہ بتایا۔
 ”میرا خیال ہے نازیہ کی طبیعت کی خرابی نے آپ کے دماغ پر بھی اثر ڈالا۔“ زینب ابھی بھی غیر سنجیدہ تھی۔
 ”میں نے جو پوچھا ہے زینب، مجھے اس بات کا جواب دو، ہاں یا نا.....“
 وہ ٹیبل پر دونوں کہنیاں ٹکا کر اس کی طرف جھکا زینب کو اس کی نگاہوں میں اپنی بات کی مضبوطی جھلکتی دکھائی دی۔ اسے سمجھ ہی نہ آیا وہ کیا جواب دے۔

”آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میں نہ صرف ایک شادی شدہ عورت، بلکہ دو بچیوں کی ماں بھی ہوں۔“
 ”تو کیا ان تمام مجبور یوں نے تم سے تمہارا دل چھین لیا ہے۔ تمہارے جذبات اور احساسات کو ختم کر دیا ہے۔ کیا شادی شدہ عورت مر جاتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی خواہشات نہیں ہوتیں۔“ زینب ایک دم خاموش ہوئی۔
 ”بولو زینب، جواب دو۔“

اب زینب کی سمجھ میں ہی نہ آیا، وہ کیا جواب دے۔ سالار نے اسے ایک عجیب و غریب دورا ہے پر لا کھڑا کیا تھا، جس کے ایک طرف اس کا شوہر اور دو بچیاں تھیں۔ دوسری طرف سالار کی محبت اپنی تمام تر عنایتوں سمیت کھڑی تھی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک عجیب طرح کے شش و پنج میں گھر چکی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے آج کا دن روزِ قیامت سے

بھی زیادہ مشکل ہو گیا ہو۔ وہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی۔ جو کچھ سالار نے کہا ویسا اس سے کبھی نہ ہو جائے۔

”میری بات کا جواب دو زینب.....“

کچھ دیر انتظار کے بعد سالار نے اسے ایک بار پھر سے پکارا، چائے میں چمچہ چلاتے زینب یک دم چونک اٹھی اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر اسے نکا جو، اپنی بات کے جواب کے انتظار کے لیے بے چینی سے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں زینب بے حد محبت، ایسی بے اختیار محبت جس پر اب شاید مجھے خود بھی اختیار نہیں رہا اور شاید اس محبت میں، میں اس دن ہی گرفتار ہو گیا تھا جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم ایک شادی شدہ عورت ہو میں خود کو نہ روک پایا اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتی ہو۔“

اک دم وہ بات کرتے کرتے سانس لینے کے لیے رکا زینب نے بغور اس کے چہرے کی جانب نظر ڈالی اک انجانا کرب سا اس کے چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔

”اور میں یہ بھی جانتا ہوں زینب کہ تم بھی مجھے پسند کرتی ہو۔“

اپنی دونوں کہنیاں ٹیبل پر ٹکائے آگے کی جانب جھکا زینب کو محسوس ہوا شاید وہ اس کے لیے لفظ ”محبت“ استعمال کرتے ہوئے جھجک سا گیا ہے۔

”ہاں یہ سچ ہے کہ میں آپ کو بے حد پسند کرتی ہوں مگر اس کا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھ بیٹھے ہیں۔“

وہ جب بولی تو اسے اپنا لہجہ خود بھی سچ سے عاری محسوس ہوا۔

”واٹ؟“ سالار کو جیسے کرنٹ لگا۔

”میں تمہاری بات سمجھا نہیں۔“

حیرت اس کے لہجہ میں در آئی۔

”سالار آپ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں ایک ایسے قابل اعتبار دوست جس پر شاید اس دنیا میں، میں سب سے زیادہ بھروسہ اور اعتماد کر سکتی ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں فرہاد اور اپنی بچیوں کو چھوڑ کر آپ سے شادی کر لوں۔ پتا نہیں آپ نے ایسا سوچا بھی کس طرح، مجھے تو اس بات پر حیرت ہے۔“

وہ خود پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی جس کا اندازہ اس کے لہجہ کی خود اعتمادی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”تم غلط کہہ رہی ہو زینب، عورت اور مرد کبھی دوست نہیں ہو سکتے یا شاید میرے نزدیک ایسی دوستی کوئی معنی نہیں رکھتی اور ویسے بھی ہمارے اس معاشرے میں ایسی دوستی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی جاتی اور یہ ہی وہ سبب ہے جس کے باعث میں تمہیں عزت دینے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم جانے کیوں یہ سب کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے گھبرار رہی ہو۔“

وہ آج ہر بات واضح کر دینا چاہتا تھا پھر جانے زندگی میں ایسا موقع ملے نہ ملے کیونکہ اسے تقریباً ایک ہفتہ تک نازیہ کے ساتھ ابرو ڈھچلے جانا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب مجھے چلنا چاہیے مریم کی چھٹی کا ٹائم ہونے والا ہے۔“

سالار کی کسی بھی بات کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”یاد رکھو زینب قسمت ہر انسان کو اس کی زندگی بدلنے کا ایک موقع ضرور دیتی ہے جو آج تمہیں بھی مل رہا ہے مگر تم شاید بچنے پر دستک دینے والی اس خوش قسمتی کو دنیا کے خوف سے ٹھکرا رہی ہو ابھی بھی سوچ لو وقت ہے ایسا نہ ہوکل کو تمہیں پچھتانا پنے در پر دستک دینے والی اس خوش قسمتی کو دنیا کے خوف سے ٹھکرا رہی ہو ابھی بھی سوچ لو وقت ہے ایسا نہ ہوکل کو تمہیں پچھتانا

پڑے۔“

سالار نے ایک آخری کوشش اور کی۔

”میری اچھی یا بری قسمت میرے بچوں اور شوہر کے ساتھ ہے۔“

نہیں جانتی تھی کہ فرہاد کی بے اعتنائی کے باعث کسی دوسرے مرد سے کی جانے والی دوستی کے نام پر حاصل ہونے والی تسکین اسے آج اس مقام لا کھڑا کرے گی جس کے ایک طرف کھائی ہوگی اور دوسری جانب محبت کے نام پر بہتا تیز دریا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے جانے کو تیار تھا۔ سالار کا یہ مطالبہ اس کے لیے بالکل ناقابل یقین تھا۔ اسے کبھی یہ امید نہ تھی کہ کوئی مرد اس قدر دلیر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ یہ ہی سمجھتی رہی کہ اس کے اور سالار کے درمیان جو ڈھکا چھپا سلسلہ چل رہا ہے، وہ ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔ مگر حالات نے آج جو رخ اختیار کیا وہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا۔ مرد کی ایسی مضبوط محبت کا تصور بھی شاید اس کے نزدیک محال تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی میں ہمیشہ فرہاد جیسے مرد کو ہی دیکھا تھا۔ لا پرواہ، بے خبر اور محبت سے قطعی عاری شخص جس کے نزدیک کسی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، مگر شاید سالار بھی نازیہ کے لیے فرہاد جیسا ہی ایک مرد تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ بے اختیار بول اٹھی۔

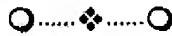
”مجھے بہت افسوس ہے سالار تم نے میری محبت کے حصول کی خاطر اپنی بیمار بیوی کو یکسر فراموش کر دیا، تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مجھ سے دوسری شادی کی خبر نازیہ کے لیے کسی قدر اذیت کا باعث ثابت ہوگی۔“

”اس کا ذکر مت کرو، وہ سب کچھ جانتی ہے اور وہ خود چاہتی ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں اور یہ اس کی خواہش تھی جو آج میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“

سالار کا جواب اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ نازیہ سب کچھ جانتی ہے۔ اس سوچ نے ہی اسے مزید شرمندہ کر دیا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ کرسی پیچھے کھسکاتی وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

سالار بنا کچھ کہے میز پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھاتا اس کے قریب سے گزرتا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ یقیناً وہ ناراض ہو چکا تھا۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی نینب اسے منانے کی ہمت خود میں نہ رکھتی تھی۔ اسی لیے تھکے تھکے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے چل دی۔



”اماں کیا سوچ رہی ہو؟“

ماں کو اتنی دیر تک خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بے اختیار اس کا کندھا ہلانا بیٹھی۔

”آں..... ہاں کچھ نہیں.....“

انہوں نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے کھڑی بیٹی پر ڈالی۔ سرو قد اور خوب صورت خدو خال کی مالک، اپنی عمر سے قدرے بڑی دکھائی دے رہی تھی۔

”یہ تو بالکل میری جوانی ہے ہو، ہو میرے جیسی۔“ وہ یک دم ہی خوف زدہ ہو گئیں۔

”یہ اتنی بڑی ہو گئی اور مجھے آج تک چٹا ہی نہ چلا۔“ اس خیال کے آتے ہی انہوں نے یک دم جھرجھری سی لی۔

”کیا ہوا اماں.....“ اس نے دوبارہ ماں کا کندھا ہلایا۔

”اور یہ سب کیا ہے؟“ جواب نہ پا کر ماں کے سامنے کھڑے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

”کچھ نہیں.....“

وہ جلدی جلدی تمام کاغذات سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اماں کیا ہوا تمہیں، کیوں اس قدر پریشان ہو؟“

ماں کے چہرے پر چھائے تاثرات نے اسے پریشان کر دیا۔

”نہیں بیٹا تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، میں بھلا کیوں پریشان ہونے لگی۔“ وہ شاید خود پر قابو پا چکی تھیں۔

”تمہارے امتحانات کب سے شروع ہو رہے ہیں؟“

”شاید اگلے ماہ کی بیس تاریخ ہے۔“

”اچھا.....“

ماں نے ہاتھ میں پکڑے تمام کاغذات ایک خالی لفافے میں ڈال دیئے اور پھر وہ خاکی لفافہ ٹرک کے اندر رکھ کر

واپس پلٹ آئی۔

”اماں.....“

اس نے کچھ سوچتے ہوئے ایک بار پھر ماں کو پکارا۔

”کیا ہوا؟“

”اماں مجھے نیاٹی وی لے کر دو۔“ شاید اب وہ اپنے گھر میں پھیلے سنائے سے تنگ آ چکی تھی۔
”ٹی وی.....“

اماں نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کچھ دور کٹری کی ٹیبل پر موجود ایک کالے سے ڈبے پر نظر ڈالی۔
”اماں اب یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا، جانے کتنا پرانا ہے، مجھے تو اب نیاٹی وی لے کر دو جس پر کیبل بھی آتا ہو، اب تو سارے ہی محلے کے لوگ کیبل پر ڈرامے دیکھتے ہیں ایک سوائے ہمارے۔“
وہ شاید اپنی ماں کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ اس لیے لاڈ سے بولی۔
”اچھا فاطمہ خالہ کے پاس میری ایک کمیٹی ہے، پوچھتی ہوں کہ کب تک دیں گی۔“
حالانکہ یہ کمیٹی انہوں نے اپنے علاج کے لیے ڈالی تھی، مگر بیٹی کی اس فرمائش کو شاید وہ زندگی میں پہلی بار رد نہ کر سکیں۔
”بس اماں..... پھر ان سے کہو ہمیں جلدی سے کمیٹی دے دیں۔“ ماں کی ہاں نے یک دم ہی اس کے دل کو خوشی سے بھر دیا۔

”اچھا.....“

اماں نے باہر نکلتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی، جہاں خوشی کے سارے رنگ کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔
”یا اللہ اسے ہمیشہ اتنا ہی خوش رکھنا۔“ بے اختیار ہی ان کے دل سے یہ دعا نکلی۔
”آمین.....“ اپنی دعا پر خود ہی آمین کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئیں۔

○.....❖.....○

”سالار، نازیہ کو علاج کے لیے ملک سے باہر لے کر جا رہا ہے۔“
اپنے تئیں فضا بھابی نے اسے نئی خبر سنائی۔
”ہاں مجھے پتا ہے اس کا آپریشن ہے، شاید پیٹ میں ٹیومر ہے، میری تو دعا ہے اللہ اسے جلد ہی صحت و تندرستی عطا فرمائے۔“
”ہاں بھئی ہم سب کی تو یہی دعا ہے، مگر اس آپریشن کے بعد ہو سکتا ہے وہ ساری زندگی ماں نہ بن سکے اور یہ اس کی زندگی کی کتنی بڑی خواہش ہے ہم سب ہی جانتے ہیں۔“
”مگر اللہ کی مرضی کے آگے ہم سب بے اختیار ہیں بھابی۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”سنا ہے اس نے تو سالار کو دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی ہے، مگر بھئی آفرین ہے اس مرد پر جو اپنی بیوی سے اس قدر بے لوث محبت کرتا ہے کہ اسے ہر بیماری سمیت دل سے قبول کرنے پر آمادہ ہے، کہتا ہے مجھے صرف نازیہ کا ساتھ چاہیے۔ بچے غیر ضروری ہیں۔“

فضا بھابی جو ایک بار شروع ہو تئیں تو بمشکل ہی چپ ہوا کرتیں۔

”بھابی عورت کوئی درخت نہیں جو پھل نہ دے تو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔“

”نہیں بھئی یہ تو اپنی اپنی سوچ کی بات ہے، ورنہ آج کل تو لوگ بچوں والیوں کو بھی نکال باہر کرتے ہیں۔ کئی مرد، بیٹوں کا بہانہ بنا کر دوسری گھر لے آتے ہیں اور گچی بات تو یہ ہے کہ نہ صرف مرد اس زمانے میں تو عورت کو بھی سکون نہیں۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی یہاں وہاں منہ مارتی ہیں۔ بس یہ عشق انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔“ جانے وہ کیا جتنا چاہتی

تھیں زنبب سمجھ نہ پائی۔

”آپ کے لیے چائے بناؤں۔“

انہیں اس موضوع سے ہٹانے کا کوئی اور طریقہ اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

”ہاں بنا لو ڈرائیور کسی کام سے گیا ہے، اسے واپس آنے میں کچھ ٹائم لگے گا۔“ وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔ زنبب خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔



”مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے ساتھ ہو، ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارا یہ ساتھ صرف ایک خواب ہے جو آنکھیں کھولتے ہی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔“

جہاز کے ٹیک آف کرتے ہی وہ اریشر کا ہاتھ تھامتے نہایت ہی پیار سے بولا۔

”سچ جانو یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا، وہ سب کچھ جو اس قدر مشکل اور دشوار لگ رہا تھا، اتنی آسانی سے ہو جائے گا آئی کانٹ بلیواٹ۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولی۔

”ہاں اریشر نہ صرف ایسا ہوتا ہے بلکہ اب تو ہمارے ساتھ ہو چکا ہے اور ایسے ہی واقعات ہیں جو اللہ پر ہمارا یقین مزید مضبوط کرتے ہیں اور شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوڑے آسمان پر بننے ہیں اور ہمیں ہمیشہ وہ ہی ملتا ہے جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے۔“

”ایک بات تو بتاؤ ایصال۔“ اسے جیسے اچانک ہی کچھ یاد آ گیا۔

”تم نے اپنی کزن کو طلاق تو دی نہیں اور اگر کل وہ کسی بھی لمحہ تمہارے درمیان آگئی تو.....“

دل کا خدشہ اس کی زبان پر در آیا۔

”ایسا کچھ نہیں ہوگا تمہارے اور میرے درمیان اب کوئی نہیں آ سکتا۔“

اس نے پیار سے اپنا بازو اریشر کے گرد حائل کر کے اسے خود کے قریب کر لیا۔

”اور یہ خیال ہمیشہ کے لیے اپنے دل سے نکال دو مجھے فی الحال اب لوٹ کر پاکستان بھی نہیں جانا، وہ میرا ایک گزرا ہوا تلخ ترین کل تھا، جس کا خوف تمہارے ساتھ نے میرے دل سے بالکل نکال دیا ہے۔ اب اسے طلاق دینے یا نہ دینے پر مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی اپنی زندگی کا معاملہ ہے چاہے تو میرے نام پر بیٹھ کر اسے برباد کر دے۔“

اس کے لہجہ کی سختی نے اریشر کے دل میں موجود تمام خدشات کو دور کر دیا۔ وہ ایک دم ہی شانت ہو گئی اور ہر سکون انداز میں ایصال کے کندھے پر اپنا سر ٹکائے ہوئے آنکھیں موند لیں۔



”ملک صاحب آگئے ہیں۔“

کان سے لگا ہون بند کرتے ہوئے فضل چا جانے اطلاع دی۔

”اکیلے.....“

اس کے دل میں آنے والا خیال سیکھنے کی زبان پر سوال بن گیا۔

”پتا نہیں۔“

چاچا مختصر سا جواب دیتے ہوئے داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ اپنی جگہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد ملک انکل، چاچا فضل کی ہمراہی میں اندر داخل ہوئے۔ وہ آج بھی تنہا تھے۔ اس کا دل یک دم بچھ سا گیا۔

”السلام علیکم انکل۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”علیکم السلام! کیسی ہو بیٹا۔“ اس کے سر پر دستِ شفقت رکھتے ہوئے ملک صاحب نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ خود بخود اس کی آواز بھگ سی گئی۔

”صاحب کے لیے کھانا لگاؤ۔“ اس کا مختصر سا سامان کمرے میں رکھ کر چاچا نے سیکڑہ کو مخاطب کیا۔

”نہیں میں کھانا نہیں کھاؤں گا، ہو سکے تو ایک کپ کافی بنا دیں۔“

جانے کیوں انکل کچھ بچھے بچھے سے تھے یا شاید اسے وہم ہوا تھا۔

”اب تمہارا گریجویٹیشن کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“ آنٹی کے کچن میں جاتے ہی ملک انکل نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرا ارادہ.....؟“

وہ یک دم گڑ بڑا سی گئی۔ سوال اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔

”ہاں بیٹا، میں چاہتا ہوں تم ہائر ایجوکیشن حاصل کرو، ماسٹرز کر لو یا کوئی اور ڈگری جو تم کرنا چاہو۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں اپنا سر صوفہ کی بیک سے نکال لیا۔

مطلب یہ کہ اس کا تنہائی کا یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا، منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ گریجویٹیشن کے بعد ملک صاحب اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اس کا یہ خیال، خام ثابت ہوا، اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

”اگر تمہیں انٹرنسٹ ہو تو فیشن ڈیزائننگ کر لو۔“ اسے خاموش دیکھ کر وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ اس کی آواز کچھ بھاری سی ہو گئی۔

سیکنڈ نے چھوٹی سی ٹرائی ان کے صوفہ کے قریب کی۔

”آپ کافی لیس، میں ذرا فریش ہو کر آتی ہوں۔“

اس وقت وہاں سے اٹھنے کا اس سے بہتر بہانہ اسے کوئی اور نہ سوچا۔ ”اوکے بیٹا، ویسے آپ کا فنکشن کل کس وقت ہوگا۔“

”صبح دس بجے۔“

انہیں جواب دے کر وہ اندر اپنے کمرے میں آگئی اور پھر واش روم میں داخل ہوتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ چاچا فضل اور سیکنڈ کے ساتھ قید تنہائی کاٹتے ہوئے تھک سی گئی تھی اور اب مزید اس گھر میں اس طرح زندگی گزارنے کا تصور بھی اس کے نزدیک سوہان روح تھا۔ جس کے خوف نے اسے اس طرح رونے پر مجبور کر دیا۔



”حبیبہ.....“

”ہاں.....“ اس نے اک ادا سے اپنے بالوں کو جھٹکتے ہوئے شاہ زین پر نظر ڈالی۔

”کچھ نہیں۔“ جانے وہ کیا کہنا چاہتا تھا جو کہ نہ پایا۔
”اوکے۔“

کریدنے کی عادت اس میں بالکل نہ تھی۔

”ایک بات پوچھوں۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ایک بار پھر سے بول اٹھا۔

”پوچھو کیا پوچھنا چاہ رہے ہو۔“

پچھلے کچھ دنوں سے ان کے درمیان موجود تکلف کی دیوار تقریباً گر چکی تھی اور وہ دونوں دوستانہ انداز سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

”تم نے کبھی محبت کی ہے؟“ بہت سوچتے ہوئے اس نے دیر سے سوال کیا۔

حبیب نے چونکتے ہوئے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی، جہاں امید کے کئی جگنو جھلما رہے تھے۔

”نہیں..... ابھی تک کوئی ایسا ملا ہی نہیں جس سے محبت کی جاسکے۔“ اپنی گردن لفی میں ہلاتے ہوئے وہ نہایت صاف

گوئی سے بولی۔

”کمال ہے تم جیسی خوب صورت لڑکی کو محبت کرنے کے لیے کوئی ملا نہیں یا تم نے کبھی اپنے آس پاس دیکھا نہیں۔“
شاہ زین کی آواز مزید گھمبیر ہو گئی۔

”واؤ..... آپ کی آواز تو بہت خوب صورت ہے۔“

تعریف کے ساتھ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ شاہ زین کے آس پاس تقریباً گھنٹیوں کی آواز گونج اٹھی۔ وہ کچھ دیر قبل والے طلسم سے باہر نکل آیا۔

”اور تمہاری ہنسی میری آواز سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے۔“ گھنی گھنی مونچھوں کے سائے تلے اس کے لب مسکرائے۔

”چلو جی حساب برابر ہو گیا۔ تعریف کے بدلے تعریف، اب چلیں۔“ اپنا ہینڈ بیک سنبھالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شاہ زین جیسے جیسے اسے سمجھ رہا تھا اپنے سابقہ خیالات پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ تو خاصی نرم خوار و محبت کرنے والی لڑکی تھی، جبکہ شاہ زین اسے بد مزاج، مغرور اور جانے کیا کیا سمجھتا رہا۔
”چلو.....“

گاڑی کی چابی اٹھا تا وہ اس کے نہایت قریب آ گیا۔ اسے ہمیشہ سے یوں ہی حبیب کے سگ چلنا اچھا لگتا، اس کی ہمرای میں پارکنگ تک آتے اس کے دل نے کئی بار اس ساتھ کے امر ہو جانے کی دعا کی۔



اس کا موڈ آج صبح سے ہی بہت خوشگوار تھا۔ نئے سوٹ کے ساتھ ہلکا ہلکا میک اپ کیے وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ فراہادی پسند کا کھانا تیار کرتے ہوئے وہ ہلکا ہلکا گنگنا رہی تھی۔ جب بیرونی دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔
”باہر کا گیٹ کیوں کھلا ہوا ہے۔“ صحن میں آتے ہی اس نے زوردار آواز لگائی۔

”فائزہ کرایہ دے کر گئی تھی، میں کنڈی لگانا بھول گئی۔“

اس نے جلدی سے پگن سے باہر نکل کر وضاحت دی۔ خلاف توقع وہ خاموشی سے لاؤنج کی جانب بڑھ گیا۔

”تم فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگا رہی ہوں۔“ زینب نے پگن کی جانب پلٹتے ہوئے اسے ہدایت دی۔

”اچھا.....“

اور جب وہ کھانا کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی تو فرہاد ہاتھ میں کپڑا پکڑے کمرے میں موجود واحد کھڑکی صاف کرنے میں مصروف تھا۔ کچھ کہے کھانا لکڑی کی چھوٹی سی ٹیبل پر رکھے وہ اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”تم میرے انتظار میں بلاوجہ بھوکی مت بیٹھو، کھانا کھا لو، میں نہادھو کر فریش ہونے کے بعد کھاؤں گا۔“

ہنا اس پر توجہ دیئے وہیں سے ہی اس نے کہا۔

”اچھا.....“ زینب کا خوش فہم دل مر جھسا گیا۔

”اسے اپنی جانب راغب کرنے کے لیے ٹو خود کو بدل، اس سے لگاؤ کی باتیں کیا کر، اپنی محبت ظاہر کر، بچے یہ سب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔“ ماں کا پڑھایا ہوا سبق پہلے ہی مرحلے پر ناکام ہو گیا۔

”تم گھر کی ڈسٹنگ نہیں کرتی ہو۔ ٹیلی فون کا اسٹینڈ دیکھو کس قدر گندا ہے کہ اس پر ہاتھ رکھنے کا تصور کم از کم میرے نزدیک تو قدرے محال ہے۔“

اب وہ پورے جوش و خروش سے فون کا اسٹینڈ صاف کر رہا تھا۔

”مگر میں نے تو سارے گھر کی صافائی کی ہے، پھر یہ گرد کہاں سے آگئی؟“ وہ حیرت کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا چڑ بھی گئی۔

”تو تمہارا مطلب یہ ہوا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔“ حسب عادت نہایت ہی دھیمی آواز کے ساتھ وہ اسے گھورتا ہوا

بولا۔

”میں نے ایسا کب کہا کہ تم جھوٹ بول رہے ہوں؟“ زینب کی آواز نہ چاہتے ہوئے بھی تیز ہو گئی۔

”تم سے تو کوئی بات کرنا حرام ہے، ہر وقت لڑنے کے لیے تیار کھڑی رہتی ہو، جانے کس بات پر بلاوجہ جھڑپا ہو رہی ہو، میں نے تو ایسا کچھ نہیں کہا جس پر تم میرا سر پھاڑنے پر آمادہ دکھائی دے رہی ہو۔“

”میں آپ سے کب لڑی۔“ وہ قدرے حیران ہوئی۔

”تم ہمیشہ یہ کیوں ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہو کہ میں جھوٹا ہوں۔“ چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت طاری کرتے

ہوئے وہ طنز پر بولا۔

”اور یہ تم کہیں جا رہی ہو جو اس قدر تیار ہو۔“

اسے مکمل طور پر تپانے کے بعد، اس کی توجہ زینب کے سراپے کی جانب مرکوز ہوئی۔

”نہیں ویسے ہی نیا سوٹ سل کرایا تھا۔ اس کی فٹنگ چیک کر رہی تھی۔“

غصہ اور دکھ کی شدت سے اس کی آواز بھری گئی، جس پر فرہاد نے کوئی توجہ نہ دی۔

”اگر سوٹ سل کر ہی آگیا ہے تو ضروری تو نہیں کہ اسے گھر پر مہین کر خراب کیا جائے، اتنا مہنگا سوٹ تم نے پگن کے

کاموں میں ہی برما کر دینا ہے۔“ اس کی گفتگو اب دوسری ہٹڑی پر چڑھ گئی۔

زینب خاموشی سے اندر واش روم میں آگئی، کپڑے تبدیل کر کے اس نے خوب رگڑ رگڑ کر اپنا منہ بھی دھو ڈالا۔ اس تمام عمل میں آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ کر چہرہ بھگوتے رہے۔

○.....❖.....○

”بہار و پھول برساؤ میرا محبوب آیا ہے۔“
بے ڈھنگی آواز کے ساتھ ہی شو کے کابے ہنگم ہتھبہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا مارے خوف کے اس کے قدم خود بخود تیز ہو گئے۔

”ارے کیا ہوا، کیوں اس قدر بھاگی جا رہی ہو۔“
اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوتی ارم نے اسے بازو سے تھام کر روکنا چاہا۔
”کچھ نہیں بس ایسے ہی ڈر گئی تھی۔“
ارم پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ شو کا دور دور تک کہیں نہیں تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار خود بخود مدہم ہو گئی۔
”میرا خیال ہے تم اس خبیث شو کے سے ڈر گئی تھیں۔“

”ہاں.....“

اب چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔
”ارے وہ نموش تو پیچھے اس بک سٹال پر ہی کھڑا تھا، تم جانے کیوں ڈر کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ حد ہے۔“ ارم کی بات سننے ہی وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
”تم اپنی اماں کو شو کے کی حرکتوں کے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں، تاکہ وہ اس کے گھر جا کر اس کی ماں یا باپ سے شکایت کر دیں، ہو سکتا ہے اس طرح ہی وہ سدھر جائے۔ سنا ہے اس کا باپ کافی سخت آدمی ہے اور وہ اس سے ڈرتا بھی ہے۔“

ارم بے خبر تھی کہ اماں ہر بات جانتی ہیں۔ اس نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا، کیونکہ ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہ تھا، اسی لیے خاموشی سے سنتی رہی۔

”مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنے گھر والوں سے ڈرتا ہوگا۔“ کندھے پر ڈھلکتی چادر، اس نے اچھی طرح سر پر جمائی۔

”چلو اعلت بھیجوشو کے پر، یہ بتاؤ امرود کھاؤ گی۔“

سامنے ہی چھابڑی میں امرود سجائے چا چار رمضان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا۔

”ہاں.....“

اثبات میں سر ہلاتے وہ اس کے ساتھ ہی آگئی۔ ہرے ہرے امرود اسے بہت پسند تھے۔ ارم نے ہی پیسے دے کر امرود خریدے، چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی دو تھیلیاں، ایک اس کی جانب بڑھا دی۔ بنا کچھ کہے اس نے خاموشی سے تھیلی تھام لی۔ یہ امرود کی تھیلی اس پر ایک طرح کا قرض تھی۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ارم جب بھی اپنی جیب خرچ سے اسے کچھ لے کر دیتی، بدلے میں وہ بھی اسے کچھ نہ کچھ ضرور دے دیا کرتی، ان کی یہ دوستی اسی طرح قائم و دائم تھی۔

○.....❖.....○

”السلام علیکم پاپا!“

فون کے دوسرے سرے پر یقیناً ایصال تھا۔ جس کی اتنے دنوں بعد سنی جانے والی آواز نے بھی ملک صاحب کے اندر کی مزدگی کو دور نہیں کیا۔ انہوں نے فون اپنے کان سے ذرا سادور کرتے ہوئے ایک ترجمانی نظر کچھ فاصلے پر کھڑی اسی ہستی پر ڈالی جسے انہوں میں لے جانے کی خواہش نے انہیں شاید خود بھی انہوں سے دور کر دیا تھا۔

”علیکم السلام بیٹا۔“

آہستہ سے جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

”پاپا ہم خیریت سے لندن پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے سوچا آپ کو بھی اطلاع کر دوں۔“

دوسری جانب موجود ایصال کا جوش و خروش ان کی سرد آواز نے خاصا کم کر دیا تھا۔

”مما سے میری بات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا آپ آؤٹ آف سٹی ہیں۔ اس لیے سوچا آپ سے بھی بات کر لوں۔ آپ بڑی تو نہیں تھے۔“

ان کی طویل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے ایصال نے سوال کیا۔

”ہاں اس وقت میں ایک ضروری میٹنگ میں ہوں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔“

”اوکے پاپا فیک کیئر اللہ حافظ۔“

ایصال کے فون بند کرتے ہی انہیں اپنی سرد مہری کے احساس نے گھیر لیا۔

”غلطی میری ہی تھی مجھے بنا سوچے سمجھے یہ رشتہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہر شخص خواہ وہ میری اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا حق دار ہے اور یہ حق اسے اللہ کی طرف سے ملا ہے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں کسی سے اس کا یہ حق چھیننے والے، کاش یہ بات مجھے پہلے سمجھ آگئی ہوتی تو اتنی بھاری ذمہ داری اپنے کاندھوں پر نہ لیتا۔“

انہوں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا جہاں آف وائٹ سوٹ میں تیار کھڑی وہ انہیں منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”ایصال کی حد تک تو ٹھیک تھا، مگر اب اس کا کیا ہوگا جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا ہے میں اس معصوم بچی کو کس طرح بتاؤں۔“

”انکل چلیں دس بجنے والے ہیں۔“

ملک صاحب کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اسے نے پکارا۔

”ہاں چلو۔۔۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”سیکنڈ۔۔۔۔۔ سیکنڈ۔۔۔۔۔“

کھڑے ہوتے ہی انہوں نے آواز لگائی۔

”جی صاحب جی۔“ سیکنڈ کچن سے بھاگ کر باہر نکل آئی۔

”اپنا سارا ضروری سامان پیک کر لو، تم سب لوگ میرے ساتھ کراچی چل رہے ہو۔“

ان کے اس چھوٹے سے جملے نے وہاں موجود ہر فرد کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑا دی۔

”شکراً الحمد للہ۔“ سیکنڈ زیر لب بڑبڑائی۔

”ہمیں کب تک جانا ہے؟“

اک ساگر ہے زندگی

جب وہ بولی تو خوشی اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔ اس نے تو پچھلے کئی سالوں سے اپنی زندگی کی ہر خوشی کو اس چھوٹی سی لڑکی کے نام سے منسوب کر لیا تھا۔ جسے اس نے اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔

”جلد ہی..... میرا خیال ہے ایک دوں تک.....“

جواب دیتے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گئے۔

”اپنی اولاد کی خوشیوں کی خاطر مجھے اس بچی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے۔“

دماغ میں در آنے والی اس سوچ نے انہیں یقیناً کسی فیصلے تک پہنچا دیا تھا جس کا اندازہ ان کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

○.....◇.....○

اماں کو رات سے بھر بخار تھا۔ اس لیے آج وہ سکول بھی نہیں گئی، چائے بنا کر بمشکل انہیں ناشتا کروایا اور پھر اپنا مختصر سا ناشتا لیے صحن میں بھی چار پائی پر آ بیٹھی، جب بیرونی دروازہ کھول کر فاطمہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔

”کیسی طبیعت ہے اب تمہاری ماں کی؟“ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے لمحہ بھر کو کہیں۔

”بخار بہت تیز ہے۔“ اس نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“

خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دعا کی اور اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا، کچن میں موجود تمام برتن دھونے کے بعد خود بھی اندر کمرے میں ہی آ گئی، جہاں فاطمہ خالہ اماں کے قریب ہی چار پائی پر بیٹھی تھیں۔ اماں کی طبیعت رات کے مقابلے میں خاصی بہتر نظر آ رہی تھی۔

”میں نے آفتاب سے کہا ہے وہ تمہیں آج شام ہسپتال لے جائے گا۔“ آفتاب ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔

”اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ اس بچی کا خدا کے بعد تم واحد سہارا ہو، سو چو اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو یہ

غریب کہاں جائے گی۔“

خالہ نے اماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ خاموشی سے چار پائی کے نزدیک جا کھڑی ہوئی۔

”نہیں خالہ مجھے ہسپتال نہیں جانا، بس ذرا بخار ہے، دووائی لوں گی تو ان شاء اللہ رات تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔“

”یہ بخار بار بار کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتی ہوں۔“ فاطمہ کے لہجے میں پیار بھری خشکی آ گئی۔

”بیاری کو نظر انداز کرنے سے بیماری ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی کم ہوتی ہے، بلکہ بڑھتی ہے اور اپنی بیماری تم خود بڑھا رہی

ہو، اسے مسلسل نظر انداز کر کے۔“ اماں کو کیا بیماری تھی وہ سمجھ نہ پائی۔

”میری ماں تو اپنے علاج پر توجہ دو، باقی جو سولا بہتر کرے ہوتا تو وہ ہی ہے جو اس سوہنے رب نے مقدر میں لکھ دیا ہے،

مگر انسان کو اپنے حق میں ہمیشہ اچھے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، ہمارے رب کا بھی یہی حکم ہے۔“

”خالہ میرا ایک کام ہے، اگر آپ کر سکیں تو.....“

اماں نے جیسے خالہ کی تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

”ہاں بیٹا بولو.....“

”جاؤ ایک کپ چائے بنا لاؤ۔“

اماں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اسے مخاطب کیا۔ وہ سمجھ گئی اماں اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتیں اس لیے خاموشی سے باہر نکل آئی۔ جب وہ چائے لے کر کمرے میں آئی تو اماں نے اپنے قریب رکھا چھوٹا سا پرائیڈ باکس بند کر کے اس کے حوالے کر دیا۔

”یہ ٹریک میں رکھ دو۔“

وہ اس باکس کو ٹریک میں رکھ کر واپسی پٹی تو خالہ نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا نہایت احتیاط سے اپنے دوپٹے کے پلو سے باندھ لیا۔

”اچھا بیٹا اب میں چلتی ہوں۔“ خالی کپ انہوں نے اس کے حوالے کیا۔

”اگر اس فون نمبر پر میرا رابطہ نہ ہو سکا تو ان شاء اللہ آفتاب کو اس پتے پر ضرور بھیجوں گی، تاکہ وہ وہاں جا کر ان سے خود ملے اور تمہارا حال من و عن بیان کر سکے، مجھے امید ہے اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتری کی صورت نکالے گا۔ بس تم اس سے اچھے کی امید رکھو۔“

انہیں تسلی دے کر وہ باہر نکل گئیں۔



”یا سمین آیا آرہی ہیں۔“

فرہاد نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر اسے اطلاع بہم پہنچائی۔

”اچھا کب.....“

اس کے ہاتھ مریم کا بیگ پیک کرتے کرتے رک گئے۔

”شاید کل شام تک۔“

”خیریت سے آرہی ہیں۔“ ان کی آمد کبھی بھی بلا سبب نہ ہوتی تھی۔

”تم ان کے میاں کو تو جانتی ہو، کس قدر بد ذات آدمی ہے۔ اپنی زندگی میں خود سکون کرتا ہے اور نہ ہی دوسروں کو کرنے دیتا ہے۔ ہماری اتنی اچھی نیک اور سیدھی بہن کے نصیب میں یہ ہی گھنیا شخص رہ گیا تھا۔“

فرہاد ہمیشہ سے بہنوئی کے لیے ایسے ہی الفاظ استعمال کرتا جس کی وہ عادی تھی، مگر پھر بھی یہ اس کے سوال کا جواب نہ

تھا۔

”جب رشتہ لینا تھا تو ہمارے آگے پیچھے پھرتے تھے اور اب ایسی ماتھے پر آنکھیں رکھی ہیں، جیسے جانتے ہی نہیں۔“

”تو کیا آپا کا کوئی جھگڑا ہو گیا ہے؟“ اس تمام تمہید سے اس نے یہ ہی نتیجہ نکالا۔

”نہیں اس خبیث نے اب اپنا کاروبار شروع کرنا ہے، جس کے لیے کچھ رقم درکار ہے۔ وہ لینے آپا کو بھیجا ہے، حالانکہ

اس سے قبل صدمہ انہیں پیسے بھیج چکا ہے۔“

اودہ وہ تو بھول ہی گئی تھی، آپا کی اکثر و بیشتر آمد ایسے ہی کسی مقصد کے لیے ہوتی تھی۔ ”اچھا.....“

اس نے خاموشی سے مریم کا بیگ پیک کر کے رکھا۔ آپا کے شوہر سے تو اس کا زیادہ واسطہ نہ پڑا تھا، مگر آپا کی آمد اس کی

زندگی میں موجود تھوڑے سے سکون کو ضرور درہم برہم کر دیا کرتی تھی اور یقیناً اب ایسا ہی ہونے والا تھا۔



”شاہ زین یہاں آؤ۔“

ممانے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔
”جی ماما۔۔۔۔۔“

وہ خاموشی سے ان کے قریب آن کھڑا ہوا۔
”یہ لڑکی دیکھو کیسی ہے؟“

لیپ ٹاپ کی سکرین پر نظر آنے والی لڑکی اس کے لیے قطعی اجنبی تھی۔
”یہ کون ہے؟“ اس نے حیرت سے ماما کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میری دوست کی بیٹی ہے، بلکہ تمہارے پاپا سے تو ان کی دور کی رشتہ داری بھی ہے۔ ماشا اللہ بہت پیاری بچی ہے۔“
”حیرت ہے، میری تو اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”ملاقات بھی ہو جائے گی، پہلے یہ بتاؤ لڑکی کیسی ہے، بڑی قابل ڈاکٹر ہے۔“ ممانے لیپ ٹاپ کا رخ مکمل طور پر اس کی جانب کر دیا۔
”اچھی ہے۔“

مختصر سا جواب دے کر اس نے ٹیبل پر رکھا اپنا سیل فون اٹھالیا۔
”ہم چاہتے ہیں کہ اب تمہاری شادی کر دی جائے۔“

اس کی طرف سے کیے جانے والے کسی بھی ممکنہ سوال سے ناامید ہونے کے بعد ممانے خود ہی بات آگے بڑھائی۔
”اسی سلسلے میں، میں تمہیں لڑکی دکھا رہی تھی۔ اگر تمہیں پسند ہو تو ہم بات آگے بڑھائیں۔“
بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ وہ ماما کی باندھی جانے والی تمہید کی وجہ شروع میں ہی سمجھ چکا تھا۔ صرف ان کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

”پلیز ماما! آپ اس سلسلے میں کسی کی بیٹی کو کوئی امید مت دلائیں اور نہ ہی مجھ سے پوچھے بغیر کہیں رشتہ دیکھنے جائیں۔
مجھے جب شادی کرنا ہوگی میں خود ہی آپ کو بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، مگر کب تک۔۔۔۔۔“ ممالیپ ٹاپ بند کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”اور اگر تمہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، مگر کوشش کرو جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرو، میں اب گھر کی تنہائی سے
اکٹا گئی ہوں۔“

ماما کی بات ختم ہوتے ہی حبیبہ کا سراپا چہم سے اس کے تصور میں اتر آیا اور اس کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔
”میں کوشش کروں گا ماما! آپ کی یہ خواہش جلد پوری کر سکوں۔“
ماں کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے مکمل یقین دہانی کرائی۔ ایک طرف سے مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اب اسے صرف حبیبہ سے بات کرنی تھی۔ جس کے لیے وہ موقع کا منتظر تھا۔

○.....❖.....○

”تین تین بیٹے دیئے ہیں میں نے اس شخص کو، مگر دیکھ لو قدر نہیں۔“

یاسمین آپا نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا، تین بیٹوں کی ماں ہونے کا مان ان کے لہجہ میں ہمیشہ ہی جھلکتا تھا۔

”جی.....“ وہ صرف اس قدر ہی کہہ سکی۔

”اور ایک میرا بھائی ہے، کبھی نہیں سوچا کہ ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے۔“

ان کا اشارہ یقیناً فرہاد کی جانب تھا۔

”بیٹی یا بیٹا کچھ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، یہ سب دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔“ اسے یاسمین آپا کی بات خاصی بری لگی۔

”دینے والا تو اللہ ہی ہے، مگر لوگ شُب یہ سب سمجھتے ہیں، اب میرے دیور کو ہی دیکھ لو یہاں تیسری بیٹی پیدا ہوئی وہاں دوسری بیوی کر لی۔“

”ہر شخص آپ کے دیور جیسا نہیں ہوتا۔“

اب ان کے پاس مزید بیٹھنا محال تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں بھی خوش نصیب ہو جو فرہاد جیسا شوہر ملا، سیدھا سادہ کسی معاملے میں نہ بولنے والا۔ ایک ہمیں دیکھو ہر وقت کی جج جج.....“

وہ ہمیشہ سے ایسی ہی باتیں کیا کرتیں۔

”قبر کا حال صرف مردہ جانتا ہے۔ آپا باہر والوں کو سب کچھ ٹھیک اور اچھا نظر آتا ہے۔“

آہستہ آواز میں جواب دیتی ہو یکن میں آگئی، تاکہ رات کے کھانے کی تیاری کر سکے۔



اماں گھر آئیں تو خاصی گھبرائی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے دروازے کی کنڈی لگا دی۔

”کیا ہوا اماں، کیوں اتنی پریشان ہو؟“ وہ تیزی سے ماں کی جانب بڑھی۔

”کچھ نہیں، گلی میں پولیس آئی ہے، شوکے، کے دوست ارشد علی کو گرفتار کرنے۔“

ماں نے ہاتھ میں پکڑی دو ایسوں کا لفافہ قرمبی ٹیبل پر دھرتے ہوئے اپنی چادر سے منہ پونچھا۔

”پھر کسی کی جیب کاٹی ہوگی یا سائیکل چوری کی ہوگی۔ ان دونوں کا تو یہ ہی کام ہے، مگر تم کیوں اس قدر پریشان ہو رہی ہو۔ اچھا ہے پولیس لے جائے، جان چھوٹے محلے والوں کی۔“

پانی کے کولر سے سلور کا کنوڑا البالب بھرا اور ماں کے قریب آگئی۔

”نہیں اس بار ایسا کچھ نہیں ہے۔“ ماں نے چار پائی پر بیٹھتے ہوئے پانی کا کنوڑا تھام لیا۔

”اس بار سنا ہے اس نے شوکے، کے ساتھ مل کر کوئی لڑکی اغوا کی تھی اور پھر دونوں نے مل کر اسے مار دیا۔ لڑکی کی لاش

کسی خالی پلاٹ سے ملی ہے۔“

”اوہ.....“

ماں کی دی جانے والی اطلاع نے اسے بھی خوف زدہ کر دیا اور یک دم ہی اس کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔

”اچھا ہے، اب ان دونوں بد معاشوں کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ کم از کم اس طرح محلے والوں کو تو سکون نصیب

ہوگا۔“

”سکون کیسا شوکے، کے باپ کے پاس تھوڑا حرام کا پیسہ ہے، کھمکا کر کے بیٹے کو چھڑوا لے گا۔“

یہ بات بھی سچ تھی، وہ خاموش ہو گئی۔ مارے خوف کے اس کا دل اب بھی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔
”آج کتنے ہی دن ہو گئے خالہ فاطمہ کو فون نمبر دیئے ہوئے، مگر انہوں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“ کچھ سوچتے ہوئے اماں
زیر لب بڑبڑائیں۔

”کس کا فون نمبر اماں۔“

وہ چارپائی پران کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔

”ہے میرے ایک قریبی عزیز کا۔“

آج پہلی بار اماں کے منہ سے قریبی عزیز کا لفظ سنا تھا۔ اسے قدرے حیرت ہوئی۔

”سوچ رہی ہوں نکڑ والے پی سی او جا کر انہیں خود ہی فون کر لوں، میرا باکس تو نکال کر لانا، وہ جو لوہے کے ٹرک میں
رکھا ہے۔“

وہ یہ باکس کئی بار وہاں سے نکال کر لائی تھی۔ مگر پھر بھی اماں ہر بار اسے جگہ کی یاد دہانی ضرور کرتی تھی، اس نے خاموشی
سے باکس لا کر ان کے قریب رکھ دیا۔ اماں نے کھول کر اندر سے ایک کارڈ نکالا اور مٹھی میں دباتے ہوئے پھر سے اٹھ کھڑی
ہوئیں۔

”یہ واپس اپنی جگہ رکھ آؤ میں ابھی آتی ہوں۔“

”رکو اماں مجھے بھی ساتھ لے کر جانا، میں نے اکیلے گھر میں نہیں رہنا۔“

کچھ دیر قبل والی خبر کا خوف ابھی بھی پوری طرح اس کے اندر پنچے گاڑے بیٹھا تھا۔ اسے خالی گھر میں ہر طرف شو کے کا
ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ اماں نے رک کر ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

”اچھا آ جا، مگر اپنی چادر لے کر آنا۔“

اسے ہدایت دیتیں وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ تیزی سے باکس اپنی جگہ واپس رکھ کر اماں کے پیچھے لپکی، دروازے
کو باہر سے کنڈی لگائے وہ دونوں ماں بیٹیاں صغیر پی سی او آ گئیں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار وہ اس پی سی او آئی تھی اور شاید
زندگی میں پہلی بار اس کی ماں کسی کو فون کرنے آئی تھی۔ ورنہ آج تک وہ یہ ہی سمجھتی رہی کہ ان کا اس دنیا میں کوئی ایسا عزیز نہیں
ہے جسے فون کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے۔ پی سی او پر رش تھا پردہ لگا کر عورتوں کا حصہ علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ وہ اندر والے
حصے میں جا بیٹھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ گلی میں کرکٹ کھیلتے بچوں کا شور اندر تک سنائی دے رہا تھا۔

”لائیں نمبر دیں۔“

ان سے پہلی والی عورت کے فارغ ہوتے ہی فون کے قریب بیٹھے شخص نے آواز لگائی، ماں نے جلدی سے ہاتھ میں
پکڑی پرچی اسے تھادی۔ دکان والے نے نمبر ملانے کے بعد فون ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ بددلی سے باہر کھیلتے بچوں کو
دیکھنے لگی۔ ماں کی طرف سے اس کی توجہ بالکل ہٹ گئی۔ جب اچانک ماں کی نسبتاً تیز آواز اس کے کانوں سے مگرائی۔

”آپ کو کچھ علم ہے، وہ کب تک واپس آئیں گے۔“

ماں کے لہجے میں مایوسی تھی، دوسری طرف سے کیا کہا گیا اسے آواز نہ آئی ماں کس سے بات کرنا چاہتی تھی اپنی بے
دھیانی میں وہ سن ہی نہ پائی اسے بے حد افسوس ہوا۔

”اچھا میرا کوئی فون نمبر تو نہیں ہے مگر وہ جب بھی آئیں ان سے کہنا میرا فون تھا۔“ اماں اتنا کہہ کر رک گئیں۔

”اس نے تو کہا تھا تم زندگی میں جب بھی مجھے پکارو گی میں تمہیں اپنا منتظر ملوں گا۔“ ماں کی بڑبڑاہٹ اس کے کانوں سے نکرائی۔

”میرا نام.....“ اماں زیر لب بڑبڑائیں۔

فون کی دوسری جانب موجود شخصیت نے یقیناً ماں کا نام پوچھا تھا وہ ہمہ تن گوش ہو گئی اسی پل کسی نے دکان کے سامنے موجود آم کے درخت پر پتھر مارا بہت ساری چڑیوں کا تیز شور اس کی سماعتوں سے نکرایا۔ ”نام میں کیا رکھا ہے۔ ان سے کہنا میں ہفتہ بھر میں پھر سے فون کروں گی ایک ہفتہ تک واپس تو آجائیں گے نا۔“

وہ جاننا چاہتی تھی کہ ماں کس کو فون کر رہی ہے مگر باوجود کوشش کے اسے ناکامی ہوئی ماں نے اپنی مطلوبہ شخصیت کا دوبارہ نام بھی نہ لیا۔ ”میرا نام تو شاید اب انہیں یاد بھی نہ ہوگا اس لیے بتانے کا کیا فائدہ۔“

”چلو پھر ایک ماہ بعد کروں گی فون اللہ حافظ۔“

فون بند کرتے ہی انہوں نے مٹھی میں دبے روپے دکان والے کے حوالے کیے، باقی رقم واپس دوپٹے کے پلو میں لپیٹی اور اسے ساتھ لیے دکان سے باہر نکل آئیں گھر سے پی سی او جاتے سے ماں کے قدموں میں جو تیزی تھی وہ اب قدرے کم ہو چکی تھی تیز دھوپ میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ماں کی سنگت میں اس نے اپنے گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھ دیئے۔



گاڑی کے سنگل پر رکتے ہی اس کی نگاہ دائیں جانب سڑک کے کنارے کھڑے اس لڑکے پر پڑی جس کے ہاتھوں میں پکڑے سرخ تازہ گلاب کے پھول دیکھنے والوں کی نگاہوں کو ایک تراوٹ بخش رہے تھے۔

”سر آپ کو کیسے پتا چلا مجھے سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔“

کانوں میں جیبہ کی آواز آتے ہی وہ چونکہ اٹھا، فوراً اشارے سے اس لڑکے کو اپنے قریب بلایا۔

”یہ سارے پھول پیچھے سیٹ پر رکھ دو۔“

پرس نکال کر بن مانگے ہی کچھ نوٹ اس لڑکے کو تھما دیئے جنہیں دیکھتے ہی اس کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر یک دم خوشی کی لہری دوڑ گئی۔

”تمہیک پوسر!“ خوشی سے اس نے شاہ زین کو سلوٹ مارا۔

سبز بتی روشن ہو گئی اس نے تیزی سے گاڑی آگے کی سمت بڑھائی وہ جلد از جلد آفس پہنچ کر یہ سارے پھول جیبہ کو دینا چاہتا تھا۔ تیز رفتاری کے باعث وہ پندرہ منٹ کے لگ بھگ آفس کی پارکنگ میں موجود تھا گاڑی پارکنگ میں چھوڑ کر وہ دودو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر پہنچا اسے کسی بہانے جیبہ کو نیچے گاڑی تک لانا تھا وہ آفس میں سب کے سامنے یہ پھول دے کر اس کا کوئی تماشہ بنا نا نہیں چاہتا تھا اسے ہمیشہ خدشہ رہتا کہیں وہ کسی چھوٹی سی بات کو لے کر ناراض نہ ہو جائے کیونکہ وہ ایسی ہی تھی، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ آفس ہال کے بڑے سے داخلی دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا قریب لگے آئینہ میں اپنا اچھی طرح جائزہ لے کر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی، حیرتیز چلتی سانسوں کو بحال کیا۔

”السلام علیکم صاحب۔“ دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی کرم دین اسے دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

”وعلیکم السلام۔“

سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیتا وہ اندر داخل ہوا سامنے ٹیبل پر کرن اپنے کمپیوٹر میں مصروف تھی اس سے چند قدم دور

حبیبہ کی ٹیبل اس کے وجود سے یکسر خالی تھی ٹیبل کے نیچے موجود کرسی اس بات کی علامت تھی کہ اسے باہر ہی نہیں نکالا گیا۔

”حبیبہ کہاں ہے؟“ صاف لگ رہا تھا وہ آج نہیں آئی پھر بھی وہ کرن سے تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

”وہ تو آج نہیں آئی سر۔“

”اوہ.....!“ کچھ دیر قبل والی اس کی ساراش خوشی یک دم کا فور ہو گئی۔

”خیریت.....“

اس کا اشارہ حبیبہ کی غیر حاضری کی سمت تھا۔

”جی سر اس کے مڈ ٹرم ختم ہوئے ہیں جس کے بعد اس کی یونیورسٹی تقریباً دس دن کے لیے بند ہوتی ہے لہذا یہ دس دن وہ اپنے چاچا کے ساتھ گزارتی ہے۔“

اسے حیرت ہوئی حبیبہ نے اسے کل کیوں نہیں بتایا کہ وہ ایک ہفتہ کی چھٹیوں پر جا رہی ہے، شاہ زین نے اپنے آپس میں قدم رکھتے ہی موبائل نکال کر اس کا نمبر ملایا حبیبہ کا سیل آف تھا اس کا خوشگوار موڈ یک دم ہی خراب ہو گیا، جب رات گھر واپس آیا تو سرخ گلابوں کی مہک پوری گاڑی میں پھیلی ہوئی تھی اس کا دل نہ چاہا ان پھولوں کو نکال کر پھینک دے جو خریدنے سے قبل حبیبہ کے نام منسوب کر چکا تھا، گھر آتے ہی اس نے تمام پھول نکال کر اپنے روم فریج میں رکھ دیئے۔



ہر انسان کی زندگی میں ایک ٹرنک پوائنٹ ضرور آتا ہے جس کے بعد اس کی زندگی مکمل طور پر تبدیل ہو جاتی ہے مگر اس کی زندگی میں یہ پوائنٹ دوسری بار آ گیا تھا۔ پہلی بار جب وہ اپنی ماں، گھر بار، سکس ساتھیوں اور محن میں لگے ہسپتال کے بڑے سے بیڑ سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ملک صاحب کی سنگت میں چاچا فضل اور آنٹی سکیڈ کے ہمراہ اسی گھر میں آئی تھی جہاں آنے کے بعد اس کی زندگی یکسر طور پر تبدیل ہو گئی تھی۔ اب ایک بار پھر وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کسی دوسری راہ پر گامزن ہونے چلی تھی۔ نہیں جانتی تھی اب اس کی منزل کہاں ہے مگر شاید منزل تو اسے ابھی تک ملی ہی نہیں تھی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے پورے گھر پر ایک نظر دوڑائی، سکیڈ نے اس کا ضروری سامان سب پیک کر دیا تھا یک دم ہی اس کے دل میں ایک ہوکا سا اٹھا۔

”چاچا..... چاچا.....“ وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا ہوا بیٹا کیا بات ہے؟“ چاچا فضل دین بھاگا ہوا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”مجھے اماں کی قبر پر جانا ہے۔“

آج کتنے سالوں بعد ماں کی قبر پر جانے کی خواہش دل میں کروٹ لے کر بیدار ہو گئی۔

”اس وقت.....“ چاچا نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔

”ابھی تو بیٹا مغرب ہونے والی ہے۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”رات کو اس طرح قبرستان میں نہیں جانا چاہیے۔“ پینلنگ کا کام چھوڑ کر سکیڈ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کچھ نہیں ہوتا آنٹی وہاں قبروں میں موجود لوگ تو خود اتنے بے بس ہوتے ہیں کہ باہر نکل کر اپنے پیاروں کے آنسو

صاف کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے پھر وہ بیچارے ہمیں کیا نقصان پہنچائیں گے۔“

ماں کی یاد میں اس کا دل دھاڑیں مار کر رونے کو چاہا۔
 ”اور پھر میں کراچی جانے سے قبل ایک بار اپنا گھر بھی دیکھنا چاہتی ہوں وہ گھر جہاں میری ایک عمر اپنی ماں کے ساتھ گزری مجھے فاطمہ خالدہ اور ارم سے بھی ملنا ہے مجھے وہ گلیاں دیکھنی ہیں آئی جہاں میرا بچپن مدفون ہے۔“
 یاسیت اس کے لہجہ میں کھلی ہوئی تھی۔
 ”اچھا میں ملک صاحب سے اجازت لے لوں پھر آپ کو لے چلتا ہوں۔“
 فضل دین نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور وہ مطمئن ہو گئی مگر رات انکل کی واپسی کے ساتھ ہی اس کا یہ اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔

”فی الحال تو تمہاری یہ خواہش پوری کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔“
 انہوں نے اک نگاہ اس کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی۔
 ”کیوں کہ ہمیں کل گیارہ بجے ایئر پورٹ پہنچنا ہے اس سے قبل بہت سارے ایسے کام ہیں جو فضل دین نے پٹانے ہیں بہر حال زندگی رہی تو میں بہت جلد تمہیں واپس لا کر ان تمام باتوں سے ضرور ملوانے لے جاؤں گا ابھی تو پرسوں تمہارا ٹیسٹ ہے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے۔“
 آئی سکی نے چونک کر ملک صاحب کی طرف دیکھا۔
 ”البتہ صبح سویرے سکی نے ساتھ قبرستان ضرور چلی جانا کیونکہ یہ ایک ایسی خواہش ہے جس کے لیے میں تمہیں منع نہیں کر سکتا۔“

”جی.....“
 وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔
 مطلب کہ منزل ابھی بھی کہیں دور کھڑی تھی اسے یہاں سے جا کر پھر یونیورسٹی میں داخلہ لینا تھا اور جانے ابھی بھی ایصال اسے شرفِ ملاقات بخشا یا نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی جانا چاہتی تھی یہ ہی سوچ کر اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا شاید اسی میں اس کی بہتری تھی۔



”فرہاد.....“
 ”ہاں بولو.....“
 فرہاد نے اپنے سامنے پھیلے اخبار سے ایک ذرا سی نظر ہٹا کر اس کے چہرے کی جانب ہٹکا جہاں واضح طور پر ایک الجھن سی دکھائی دے رہی تھی۔ ”کیا بات ہے زینب؟“
 فرہاد اب مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھا۔
 ”آپا کا فون آیا تھا۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
 ”کیوں..... خیریت۔“

فرہاد کے چہرے پر حسبِ توقع ایک ناگواری سی پھیل گئی، جانے کیوں وہ شروع سے ہی اس کی آپا اور ان کے شوہر سے جڑا تھا، پہلے پہلے تو زینب کو یہ محض وہم لگتا مگر گزرتے وقت اور حالات نے اس کے اس وہم کی تصدیق کر دی اس کی وجہ کیا

تھایہ وہ آج اتنے سالوں بعد بھی نہ جان پائی۔

”اتوار والے دن احد کی سالگرہ ہے وہ چاہتی ہیں ہم سب اس میں شریک ہوں۔“ بالآخر اس نے اپنا مدعا بیان کر ہی دیا۔

”ہاں تو چلی جانا احسان سے کہنا وہ تمہیں اور بچوں کو لے جائے گا۔“

”اور آپ.....“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے کہنا پڑا۔

”میں نہیں جاسکتا ایک تو میں اتوار والے دن کچھ مصروف ہوں ایک دو کام نپٹانے ہیں دوسرا تمہارا وہ بہنوئی کیا نام ہے اس کا.....“

فرہاد نے ذرا سا رک کر اپنے ذہن پر زور ڈالا۔

”ہاں ثناء اللہ، سچی بات یہ ہے کہ مجھے وہ شخص رنجی بھر پسند نہیں پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے بڑا کوئی عالم فاضل بنتا ہے۔“ فرہاد شروع ہو گیا، نینب گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی جانتی تھی ایسا ہی ہوگا، اب فرہاد کی کسی بھی بات کا جواب دینے سے بہتر تھا۔ خاموشی اختیار کر لی جائے، وہ ویسے بھی اس کی فیملی کی کسی بھی تقریب میں کم ہی شریک ہوا کرتا تھا اب تو وہ ان سب کی عادی ہو چکی تھی۔

”فرہاد.....“

اس کے خاموش ہوتے ہی نینب نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

”اب کیا بات ہے؟“

اخبار کا صفحہ پلٹتے ہوئے اس نے نینب پر نظر ڈالی۔

”مجھے کچھ رقم چاہیے۔“

بہت سوچ کر وہ قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

”خیریت..... یہ آدھی رات کو تمہیں رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی۔“

”دراصل مجھے احد کے لیے کوئی تحفہ لینا ہے۔“ یہ جملہ اس نے نہایت شرمندگی کے عالم میں ادا کیا۔

”اچھا لے لینا ابھی تو سنڈے کا کافی دور ہے۔“

وہ خطر تھی شاید فرہاد مزید کوئی بات کرے، مگر نہیں نینب کو جواب دے کر وہ ایک بار پھر سے اخبار میں مصروف ہو گیا، وہ خاموشی سے کمرے میں پھیلا سامان سمیٹنے لگی۔

”ویسے ایک بات کہوں برا مت ماننا۔“

اب اس نے اخبار لپیٹ کر ایک سائیز پر رکھ دیا۔

”تمہاری بہن کا یہ طریقہ اچھا ہے ہر سال کسی ایک بچے کی سالگرہ منا کر لوگوں سے تحفے بٹورنے کا۔“

فرہاد نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔

”وہ اتنا خرچہ تحفے لینے کے لیے نہیں کرتیں۔“ نینب دروازے سے باہر نکلتے نکلتے رک گئی۔

”یہ ان کے بچوں کی خوشی ہے جسے وہ اہتمام سے منانا پسند کرتی ہیں اور ہر شخص اپنی پسند اور خوشی کے اظہار کے لیے آزاد ہے۔“

”انہیں تو تمہارے گھر والے بھی خوب تحفے دیتے ہیں اور یہاں جب بھی آتے ہیں بالکل خالی ہاتھ.....“

ایک بار پھر وہ ہی پرانا ردنا۔

”اتنے سالوں میں آج تک میں نے کبھی اپنے بچوں کی کوئی ایسی تقریب منعقد نہیں کی جس میں کسی کو بلایا جائے اور وہ خالی ہاتھ آئیں۔“ نذیب نے تڑخ کر جواب دیا۔

”ہاں بیٹا ہوتا تو ضرور میں بھی ایسی خوشی مناتا۔“

جانے اس کے لہجہ میں ایسا کیا تھا کہ نذیب بالکل خاموش ہو گئی، اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے، آنکھوں میں نمی بھرے وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

”بلا وجہ ہی تحفہ کے لیے رقم مانگی۔“ باہر نکلتے ہی وہ بری طرح پچھتائی۔

”نازیہ اور سالار کے دیئے ہوئے کچھ تحائف ابھی بھی الماری میں رکھے تھے، فضا بھابی کے دیئے سے لائے ہوئے تحائف بھی وہیں پڑے ہیں ان میں سے ہی کچھ دے دیتی کیا ضرورت تھی بلا ضرورت اس شخص سے انٹھنے کی۔“

اسے جی بھر کر افسوس ہوا، مگر اب کوئی فائدہ نہ تھا جانتی تھی کہ اب اگلے کئی دنوں تک فرہاد کا موڈ اتنا ہی خراب رہنا ہے ایک چھوٹی سی بات نے دونوں کے دلوں میں فاصلہ پہلے سے بھی بڑھا دیا۔



ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے دور تک ایک نظر دوڑائی اسے کوئی بھی اپنا منتظر دکھائی نہ دیا۔ وہ تو سارے راستے اسی خوش فہمی میں رہی کہ باہر نکلتے ہی ایصال اور آنٹی دونوں اس کے والہانہ استقبال کے لیے موجود ہوں گے مگر اس کی یہ خوش فہمی دیگر تمام باتوں کی طرح پہلے ہی مرحلے پر غلط ثابت ہو گئی، سیکینہ نے ایک نظر اس معصوم کے مایوس چہرے پر ڈالی اور سامان کی ٹرائی دکھیلنے آگے کی جانب بڑھ گئی۔ یہاں آنے سے قبل وہ بھی ایسی بہت ساری خوش فہمیوں کا شکار تھی آج یقیناً وہ بھی اتنی ہی شاکدہوتی جتنی چھوٹی بی بی۔ مگر بھلا ہو فضل دین کا جس نے رات ہی اسے اچھی طرح ہر بات سمجھا دی تھی۔

”دیکھ سیکینہ ایک بات اپنی گرہ سے باندھ لے۔“

اسے خوشی خوشی کپڑے استری کرتا دیکھ کر فضل دین اس کے قریب آن کھڑا ہوا۔

”جو دکھائی دیتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے حقیقت تو کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ جو بندہ جان بھی نہیں پاتا۔“ وہ تمہید باندھتے ہوئے بولا۔

”میں تیری بات بھی نہیں فضل دین۔“ سیکینہ کچھ الجھ سی گئی۔

”چھوٹی بی بی کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرنا جو اسے کسی خوش گمانی میں مبتلا کر دے۔“

فضل دین آہستہ آواز میں بولا۔

”ان کے سامنے ایصال صاحب کے حوالے سے کوئی بات نہ کرنا۔ دیکھ سیکینہ جو تو سمجھ رہی ہے نا دیکھا کچھ نہیں ہے بس یہ سمجھ لے کہ جیسے بی بی جی یہاں پڑھتی تھیں بس ویسے ہی وہاں پڑھنے جاری ہیں اور سچ تو یہ ہے ملک صاحب کے گھر میں بھی

شاید کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ بی بی جی کو کراچی لے کر آ رہے ہیں۔“

”ہیں یہ کیوں.....“ مارے حیرت سیکینہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ہر کیوں..... کا جواب نہیں ہوتا۔“

فضل دین یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا اور سیکینہ ایسی خاموش ہوئی کہ رات سے اب تک بالکل ہی خاموش تھی۔
 ”سیکینہ تم بی بی کو لے کر ڈرائیور کے ساتھ جاؤ میں ملک صاحب کے ساتھ جا رہا ہوں کچھ کام بنانا کر ان شاء اللہ شام تک آ جاؤں گا..... اچھا۔“

”کیا اور کیوں“ جیسے سوالات کا گلا اس نے رات ہی گھونٹ دیا تھا وہ خاموشی سے چلتی اس جانب آگئی جہاں ڈرائیور گاڑی لیے ان کا منتظر تھا، وہ ٹرائی کا سامان ڈیگی میں رکھنے لگا سیکینہ دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی، ان سے آگے والی گاڑی کے باہر ملک صاحب کھڑے چھوٹی بی بی سے کوئی بات کر رہے تھے جسے وہ خاموشی سے سنے جا رہی تھی ملک صاحب نے اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔

ملک صاحب نے کیا کہا اب سیکینہ کو کوئی دلچسپی نہ تھی وہ منتظر تھی کب بی بی گاڑی میں آکر بیٹھے اور ان دونوں کا ایک نیا سفر شروع ہو جس کی منزل کے بارے میں اسے کوئی آگہی نہ تھی، ابھی مزید کتنا سفر باقی تھا وہ یہ بھی نہ جانتی تھی۔ چھوٹی بی بی کے گاڑی میں بیٹھے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی سیکینہ نے ایک اچھتی نگاہ اپنے ساتھ والی کے چہرے پر ڈالی جہاں ایک سکوت طاری تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی آنکھیں موندے سیٹ پر نیم دراز تھی سیکینہ بھی خاموشی سے کھڑکی کے شیشے کے پار بھانگی دوڑتی ٹریفک کے نظارے دیکھنے میں منہمک ہو گئی۔



دور تک پھیلی برف، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دھرتی نے سفید چادر اوڑھ لی ہو یہ منظر اس قدر حسین تھا کہ ایصال اپنی جگہ مبہوت کھڑا ہو گیا اسے شروع سے ہی اس طرح ہر طرف پھیلی برف بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ جانے کتنی دیر تک اسی طرح ساکت کھڑا قدرت کے اس حسین نظارے میں گم رہتا کہ اچانک برف کی اس چادر پر ایک رنگین نقطہ نمودار ہوا، ریڈ فر کوٹ میں وہ یقیناً اریشہ تھی، ایصال نے اپنی ریست واپس پر نظر ڈالی چار بجنے والے تھے، اریشہ روزانہ اسی وقت گھر آتی۔ آج کل وہ جیولری ڈیزائننگ کی کلاسز لے رہی تھی، سفید برف اس کے کوٹ اور بالوں میں بھی بکھری ہوئی تھی، اس نے کھڑکی میں کھڑے ایصال کو دیکھتے ہی جوش و خروش سے اپنا ہاتھ ہلایا وہ کھڑکی چھوڑ کر دروازے کی سمت بڑھا تا کہ اریشہ کا استقبال پورے دل و جان سے کر سکے۔

دروازے کی جانب بڑھنے سے قبل روزمرہ کی طرح وہ اپنے بازو پر چکی بھرنا نہ بھولا وہ دن میں جانے کتنی بار یہ عمل دہرا کے خود کو یقین دلاتا کہ اریشہ کا ساتھ کوئی خواب یا فریب نہیں ہے بلکہ وہ حقیقت میں اسے حاصل کر چکا ہے، اس حصول میں اس نے کیا کیا کھویا اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی۔

آج جانے کتنے ماہ ہو گئے تھے پاپا نے اس سے بات نہ کی تھی البتہ مماسے وہ تقریباً روزی بات کرتا، اسے یقین تھا جس طرح قدرت نے ہر معاملے میں اس کے لیے آسانی پیدا کی تھی بالکل اسی طرح ایک دن پاپا بھی اس سے ضرور بات کریں گے اور یہ امید اس کے دل میں ہمیشہ پوری جزئیات کے ساتھ برقرار تھی جسے وہ کسی بھی حالت میں توڑنا نہ چاہتا تھا۔



فرہاد کے گھر سے نکلتے ہی وہ جلدی جلدی کام بنانے لگی کیونکہ احسان نے اسے لینے تقریباً چھ بجے تک آ جانا تھا۔ ابھی اس نے برتن دھو کر کچن ہی صاف کیا تھا کہ کسی نے اطلاعی کھٹی بجا دی۔
 ”یہ کون آگیا؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”اماں! پھوپھو آئی ہیں۔“

اس سے قبل کہ وہ کچن سے باہر نکلتی مریم بھاگتی ہوئی آئی اور اسے اطلاع بہم پہنچا کر اگلے پاؤں واپس پلٹ گئی۔

”یہ آج کیسے آگئیں ابھی کل تو انہیں فرہاد نے فضلہ بھابی کے گھر چھوڑا تھا۔“ زینب نے سوچا ضرور کہا نہیں۔

”یہ فرہاد کہاں گیا؟“ زینب پر نظر پڑتے ہی انہوں نے سوال کیا۔

”پتا نہیں ابھی کچھ دیر قبل ہی باہر نکلے ہیں۔“

”اچھا مجھے تو اس نے کہا تھا کہ وہ گھر ہی ہوگا۔“

وہ آہستہ سے بڑبڑائیں، زینب خاموش رہی۔

”دکان پر فون کر کے بتاؤ میں آگئی ہوں۔ مجھے بازار جانا ہے پھر دیر ہو جائے گی۔“

”اوہ تو شاید یہ مصروفیت تھی فرہاد کی جس کے سبب اس نے آج میرے ساتھ جانے سے انکار کیا۔“

پہلی سوچ زینب کے دماغ میں یہ ہی آئی۔

”آپ کھانا کھائیں گی؟“

”ظاہر ہے ایک بچ گیا ہے اب تو کھانا کھا کر ہی نکلیں گے۔“

زینب کچن میں آگئی تاکہ جلدی جلدی ان کے لیے کھانا تیار کر سکے ورنہ آج اس کا کھانا بنانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کے سالن کے ساتھ ہی روٹی بنا کر فرہاد کے لیے رکھ دے گی مگر اب کھانا پکانا ضروری تھا۔

آلو قیمہ تیار کر کے اس نے سلاد کے لیے پیاز کاٹی تھی کہ فرہاد گھر آ گیا، بہن کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ہزار واٹ کا

بلب روشن ہو گیا وہ روشنی جو شاید آج تک زینب نے اس کے چہرے پر کبھی نہ دیکھی تھی سوائے اس وقت کے جب وہ اپنی بہن

کے مقابل ہوتا، فرہاد کے چہرے پر نکھری روشنی نے زینب کو سگسا دیا۔

”کھانا ذرا جلدی لگا دو ہمیں جانا ہے۔“

فرہاد کی آواز نے اسے اپنے خیالوں سے باہر نکالا کھانا ٹیبل پر رکھ کر وہ پانی لینے کے لیے پلٹی۔

”راسخہ بنا لیتیں۔“

”دعی نہیں تھا۔“ وہ آہستہ سے کہتی کچن میں آگئی، ابھی پانی کا جگ بھرا ہی تھا کہ فرہاد کچن کے دروازے پر نمودار ہوا۔

”یہ لودھی اور ہر ادھنیہ جلدی سے راسخہ بنا لاؤ آپا کبھی بھی قیمہ بنا دہی کے نہیں کھاتیں۔“

اسے ہدایت دیتا وہ وہیں سے واپس پلٹ گیا، زینب نے حیرت سے فرہاد کی پشت کو ٹکا عام دنوں میں وہ کبھی کسی سخت

ضرورت کے وقت بھی اپنا کھانا چھوڑ کر باہر نہ گیا تھا اور آج بہن کی خاطر صرف پانچ منٹ میں ہی دعی لے کر آ گیا، کھانا

کھاتے ہی دونوں بازار جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، زینب نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا ورنہ اسے پریشانی تھی کہ

یاسمین آپا کو چھوڑ کر وہ کس طرح احد کی سالگرہ میں جائے گی جبکہ یاسمین آپا نے اس کے ساتھ جانا بھی نہیں تھا۔

”رات کھانے میں بریانی بنا لینا آپا آج یہیں رہیں گی۔“

دروازے سے نکلتے نکلتے فرہاد نے فرمائش کی وہ شاید بھول گیا تھا کہ رات زینب نے اپنے گھر جانا ہے، وہ بھی خاموش

رہی ڈرتا کہیں اس وقت آپا کے گھر جانے سے فرہاد سے منع نہ کر دے اور پھر اپنی تیاری میں اتنا تاؤم لگا کہ وہ بریانی بنانا بالکل

بھول گئی ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ وہ دونوں کے لیے کھانا تیار کر کے ہی نکلے گی مگر احسان اتنی ہڑبونگ میں ساڑھے پانچ بجے ہی

اک ساگر ہے زندگی

آگیا کہ وہ اپنے اور بچوں کے کپڑے جلدی جلدی شاپر میں ڈال کر اس کے ہمراہ چل دی بنا یہ سوچے کے گھر واپسی پر اسے
فرہاد کی جانب سے ایک کڑی تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔

○.....❖.....○

شاپ سے باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ سیڑھیوں کی جانب بڑھتی جیبہ پر پڑی اور تیزی سے اس کی طرف لپکا۔
”السلام علیکم جیبہ۔“

قریب پہنچتے ہی اس نے، زوردار آواز میں سلام بھارتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔
”علیکم السلام۔“ جیبہ اسے دیکھتے ہی مسکرا دی۔

خیریت ہے آج کل تم آفس نہیں آ رہی۔“

کئی دنوں بعد جیبہ کو اپنے سامنے موجود پا کر وہ کھل اٹھا تھا۔

”میں چھٹیوں پر ہوں۔“ وہ ہنس دی۔

”ان سے ملیں یہ میری آئی ہیں۔“ اچانک ہی جیبہ نے اپنے ساتھ کھڑی خاتون سے اسے متعارف کروایا ج تو یہ تھا

اتنی دیر سے شاہ زین کو جیبہ کے آس پاس کوئی دکھائی ہی نہ دیا تھا وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

السلام علیکم آئی۔“

”آئی یہ شاہ زین ہیں۔“

شاید آئی اس سے واقف تھیں اس لیے انہوں نے مزید کوئی سوال نہ کیا۔

”جیتے رہو بیٹا۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

”آئی کئی ماہ بعد کراچی آئی ہیں اسی سبب میں چھٹیاں لے کر انہیں تھوڑا سا گھما پھرا رہی ہوں۔“

جیبہ نے آئی کے تعارف کے ساتھ ساتھ اپنی چھٹیوں کی بھی وضاحت کر دی وہ مسکرا دیا۔

”آفس کب سے جوائن کر رہی ہو۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھتا اوپر آ گیا۔

”ان شاء اللہ دو دن بعد۔“

”او کے میں تمہارا انتظار کروں گا فیک کیسے ایچڈ اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“

جیبہ جواب دے کر آگے کی جانب بڑھ گئی، شاہ زین کچھ دیر تک وہیں کھڑا اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ

سامنے والی شاپ میں داخل ہو کر اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

○.....❖.....○

”تمہاری ماں کہاں ہے۔“

اس کے دروازے کھولتے فاطمہ خالہ نے جلدی جلدی سوال کیا۔

”اندر کمرے میں ہیں۔“ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”کون ہے دروازے پر۔“

ماں نے کمرے کے دروازے سے باہر جھانکا۔
 ”بیٹا جلدی آؤ تمہاری لیے کراچی سے فون آیا ہے۔“
 فاطمہ خالہ نے پھولی پھولی سانسوں کے درمیان میں کہا وہ بہت زیادہ ایکسائٹڈ تھیں جس کا اندازہ ان کے چہرے پر پھیلی سرخی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔
 ”کراچی سے فون.....“

دروازے کی تاب پر رکھا ماں کا ہاتھ کپکپا اٹھا۔
 ”ہاں ہاں جلدی آؤ شاید وہ ہی شخص ہے جسے آفتاب نے فون کیا تھا؟“
 اماں نے تار پر پھیلا دوپٹا اتار کر اوڑھ چل میں پاؤں پھنسائے۔
 ”آپ نے نام نہیں پوچھا تھا۔“
 ”فون آفتاب نے اٹھایا تھا بیٹا میں پوچھنا بھول گئی کہ کون ہے؟“
 خالہ نے خفت زدہ ہوتے ہوئے وضاحت کی۔

”دروازے کی کنڈی لگاؤ میں ابھی آتی ہوں۔“ اماں نے باہر نکلتے نکلتے اسے ہدایت کی۔
 اماں کے چہرے پر پھیلی خوشی دیکھ کر اسے اندازہ ہوا شاید کچھ بدلنے والا ہے، جانے کیوں اسے یقین تھا اماں کسی ایسے شخص کے رابطہ کی منتظر ہیں جو آتے ہی انہیں اس ٹوٹے ہوئے گھر سے نکال لے جائے گا۔ ماں کے ساتھ ساتھ وہ بھی کسی انجانے شخص کی اس گھر میں آمد کی ہمیشہ سے ہی منتظر تھی جانتی نہ تھی کہ وہ کون تھا اور ماں کا اس سے کیا رشتہ تھا مگر جو بھی تھا ماں کو اس پر یقین بہت تھا یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی اب وہ شدت سے منتظر تھی کہ کب ماں واپس آئے اور اسے پتا چلے کہ کیا ہونے والا ہے۔



”بیٹا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
 اس نے چونکہ کر ملک صاحب کی طرف دیکھا، وہ کچھ الجھے الجھے سے تھے پریشانی ان کے چہرے سے ہو رہی تھی۔ وہ پچھلے آدمے گھٹنے سے اسی طرح کمرے میں نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے یہ تو وہ شروع سے ہی جان چکی تھی مگر کیا یہ اسے ابھی تک پتا نہیں چلا تھا۔

”جی انکل بولیں.....“ وہ مکمل طور پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”سیکنڈ۔“ انہوں نے ہلکا سا کھٹکھٹاتے ہوئے سیکنڈ کو پکارا۔

”جی صاحب جی.....“

”اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو میرے لیے کافی بنا دو۔“

دوا لگیوں سے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے وہ خامے پریشان دکھائی دیئے۔

”اس میں زحمت والی کیا بات ہے صاحب جی ابھی بنا لاتی ہوں۔“

سیکنڈ جان چکی تھی وہ کمرے میں مکمل تنہائی چاہتے تھے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

”بیٹا میں تمہارا گناہ گار ہوں ہو سکتے تو مجھے معاف کر دینا۔“

اک ساگر ہے زندگی

سیکنہ کے باہر نکلتے ہی ملک صاحب اس کے قریب آ بیٹھے ان کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آئے۔

”انکل آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“ انہیں پریشان دیکھ کر وہ بھی گھبرا اٹھی۔

”بیٹا پہلے مجھ سے وعدہ کرو تم مجھے معاف کر دو گی۔“

انہوں نے یک دم ہی اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں بیٹا، میں چاہ کر بھی تمہیں تمہارا حق نہ دلا سکا۔“ وہ روہانے سے ہو گئے۔

”میں نے بہت کوشش کی مگر ایصال.....“

وہ سانس لینے کے لیے لمحہ بھر کو روکے، وہ بے چین سی ہو گئی حالانکہ یہ سب تو شاید وہ شروع سے ہی جانتی تھی مگر ملک

صاحب اپنے بیٹے کے سامنے یوں ہار مان جائیں گے اسے یہ امید بالکل نہیں تھی۔

”میرے بہت سمجھانے پر بھی وہ تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت دینے کو تیار نہیں۔“ شرمندگی ان کے لہجہ سے عیاں تھی۔

”وہ ایشہ سے شادی کرنا چاہتا تھا ایشہ اس کے ماموں کی بیٹی ہے۔“

ملک صاحب بولتے گئے وہ خاموشی سے سنتی گئی اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

”میں سمجھ گیا تھا بیٹا کہ یہ رشتے زبردستی کے نہیں ہوتے، زبردستی ان رشتوں کی خوب صورتی کو ختم کر دیتی ہے اور میں

نہیں چاہتا تھا کہ تم ہمیشہ کے لیے ایک بد صورت زندگی کا حصہ بن جاؤ۔ میں نے ایصال کی بات صرف تمہارے لیے مان لی

اسے اس زبردستی کے بندھن سے آزاد کر دیا۔“

وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

”میری طرف سے تم بھی آزاد ہو بیٹا جب چاہو ایصال سے خلع لے کر اپنی پسند اور مرضی سے شادی کر لو تمہیں پورا حق

ہے اپنی زندگی جینے کا۔“

”مجھے خلع نہیں چاہیے انکل میں اسی طرح خوش ہوں۔“

اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

”پاکل ہو تم اس طرح تنہا ساری زندگی کس طرح گزارو گی۔“

”گزار لوں گی انکل میں تنہا زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی ہوں۔“

تھکن اس کے لہجہ میں اتر آئی۔

”میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے میری ماں کے حوالے سے بدنام کرے، کوئی یہ کہے کہ جیسی ماں ویسی بیٹی، حالانکہ میں

اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری ماں کوئی ایسی عورت نہیں تھی وہ تو شاید اس کے دل میں پیدا ہونے والا غصہ تھا جسے وقت نے

لاوا بنادیا ایسا لاوا جس میں سب کچھ بہہ گیا۔“ وہ رو دی۔

”جو بھی ہے بیٹا میں نے فیصلہ کر لیا ہے ایصال کے پاکستان آتے ہی تمہیں خلع دلوا کر تمہاری اچھی جگہ شادی کر دوں گا

کیونکہ یہ بھی ہمارے اللہ کا حکم ہے جو ان بچیاں اس طرح تنہا زندگی نہیں گزارتیں اس کی اجازت ہمیں ہمارا دین نہیں دیتا۔

”سیکنہ.....“

اپنی بات درمیان میں روک کر انہوں نے سیکنہ کو پکارا۔

”جی صاحب جی۔“ وہ بھاگتی ہوئی آئی۔

”میں تمہاری کافی کا منتظر ہوں۔“

”ابھی لائی جی۔“ سیکندالے پاؤں واپس پلٹ گئی۔

”دیکھو بیٹا ہمیشہ یاد رکھو زندگی میں ہمیں وہ ہی ملتا ہے جو ہمارے نصیب میں لکھ دیا جاتا ہے البتہ کئی دفعہ ہمارا یہ نصیب کسی دوسرے راستے سے گھوم کر ہم تک پہنچتا ہے مگر ہم تک آنا ضرور ہے اس لیے دعا کیا کرو کہ تم تک آنے والا تمہارا نصیب اچھا ہو اور تم ہمیشہ خوش رہو۔“

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

”آمین۔“

دل ہی دل میں کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، ایصال کا ساتھ اب شاید مزید اس کے نصیب میں نہ تھا بنا دیکھے بنا ملے، بنا جانے جوڑا جانے والا رشتہ بالکل ویسے ہی اپنے اختتام کو پہنچ گیا جیسے وہ شروع ہوا تھا شاید یہ ہی زندگی ہے۔

○.....❖.....○

”میرا خیال ہے آپ آج رات یہاں ہی رک جائیں صبح چھوڑ آؤں گا۔“

احسان کے منہ سے کوئی تیسری بار یہ جملہ سن کر وہ جھنجھلا اٹھی۔

”تمہیں کتنی بار بتاؤں یا سمین آپا رہنے آئی ہیں ایسے میں اگر میں آج رات یہاں رک گئی تو انہیں بہت برا لگے گا اور ویسے بھی اچھا نہیں لگتا مگر آئے مہمان کو اکیلا چھوڑ دیا جائے۔“

”انہیں کہنی دینے کے لیے فرہاد بھائی ہیں تو سہی اور ویسے بھی جب وہ آپ کے میکے والوں سے مل کر خوش نہیں ہوتے تو آپ ان کے بہن بھائیوں کی اتنی فکر کیوں کرتی ہیں۔“

بالآخر احسان کے دل کی بات لیوں تک آئی گئی۔

”بری بات ہے احسان، ایسی بدگمانی والی باتیں نہیں کرتے جن سے دوسروں کے دل خراب ہوں۔“

اماں بی نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے احسان کو گھر کا۔

”آپ تو جانتی ہیں اماں جی میں سچی بات کیے بنا رہ نہیں سکتا سوری آپا اگر میں نے آپ کا دل دکھایا ہو۔“

جگنو کو گود میں اٹھاتے ہوئے اس نے ننب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اسے ویسے بھی اپنی یہ بہن قابل ترس لگتی، اسی سبب فرہاد پر آئے ہوئے غصہ کا اظہار وہ اسی طرح کر دیا کرتا، شاید اس طرح اس کے دل کی بھڑاس کم ہو جایا کرتی تھی۔

”کوئی بات نہیں۔“ ننب دیر سے مسکرا دی۔

”چلیں آجائیں میں آپ کو چھوڑ آؤں۔“

جگنو کو گود میں لیے ہوئے وہ باہر کی جانب بڑھ گیا، ننب جلدی جلدی سامان سمیٹ کر مریم کو لیے گاڑی میں آن بیٹھی، وہ سارے راستہ دعا کرتی آئی کہ فرہاد کا موڈ ٹھیک ہو کہیں وہ یا سمین آپا کے سامنے بریانی کا ایٹو بنا کر بگڑ نہ جائے۔ اسی سوچ میں گم تھی کہ پتا ہی نہ چلا کب گھر آ گیا، احسان کے گاڑی روکتے ہی وہ چونک اٹھی۔

”ابدر تک چھوڑ دوں۔“

اسے سامان اٹھاتا دیکھ کر احسان نے سوال کیا۔

”نہیں رہنے دو میں چلی جاؤں گی، تم جاؤ۔“

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت احسان کا سامنا فرہاد سے ہو۔

”آپ کھنٹی بجائیں دروازہ کھل جائے تو چلا جاؤں گا۔“

”اچھا.....“

اور پھر جانے کتنی بار زنب نے گھر کی اطلاعی کھنٹی بجائی مگر اندر مکمل طور پر خاموشی طاری تھی بظاہر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے فرہاد سو گیا ہو۔

”واپس آجائیں مجھے لگ رہا ہے فرہاد بھائی سو گئے ہیں۔“

احسان کی بات منہ میں ہی رہ گئی ایک دم گیٹ کھول کر فرہاد سامنے آ گیا، مگر بنا کچھ کہے وہ گیٹ سے ہی واپس پلٹ گیا، زنب اس کے پیچھے ہی جلدی سے اندر داخل ہو گئی، احسان باہر سے ہی واپس چلا گیا۔

اس نے پہلے کچن میں جا کر کھانا رکھا جو وہ فرہاد کے لیے آپا کے گھر سے لائی تھی اور پھر سوئی ہوئی جگنو کو کندھے سے لگائے اندر کمرے میں آ گئی تاکہ بستر پر لٹا سکے مگر اندر داخل ہوئے ہی اسے ایک جھٹکا سا گایا سمین آپائیڈ سے ٹک لگائے بیٹھی فرہاد سے باتیں کر رہی تھیں۔

”مطلب یہ دونوں جاگ رہے تھے پھر بھی دروازہ کھولنے میں اتنی دیر۔“ اسے افسوس کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا، قریب ہی ٹیبل پر کھانے کے برتن رکھے تھے جو غالباً بازار سے آیا تھا۔

”ارے میں تو آپ کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔“

بات شروع کرنے کی خاطر وہ جلدی سے بول اٹھی۔

”کیا ضرورت تھی کھانا لانے کی ہم تو کھا چکے۔“ فرہاد کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ جانے سے پہلے بریانی بنا جانا مگر تمہارے نزدیک تو شاید میری کسی بات کی اہمیت ہی نہیں

ہے۔“

انداز تلخ، ماتھے پر تیوری مگر لہجہ بالکل دھیمّا اسے جیسے کوئی نارمل بات کر رہا ہو کبھی کبھی تو زنب کو حیرت ہوتی اتنے غصہ میں بھی فرہاد کا لہجہ اونچا نہ ہوتا، فرہاد کو تو شاید کوئی اندازہ بھی نہ لگا سکتا ہوگا کہ اسے لڑنا جھگڑنا بھی آتا ہوگا۔

”بس قسمت کی بات ہے ہم جیسوں کو دیکھو گھر میں کوئی سسرالی عزیز آ جائے تو کیا محال ہے جو گھر چھوڑ کر کہیں جائیں۔ پانچ پانچ نندیں بھگتاتی ہوں کبھی مل کر دیکھنا سب بھابی بھابی کی گردان کرتی ملیں گی۔ جب آتی ہیں ایسی آؤ بھگت اور چاہت کرتی ہوں کہ انہیں اپنی ماں کی یاد بھی نہیں آتی پھر بھی دیکھ لو کوئی قدر نہیں۔“

آپا نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”میں نے تو آج تک کبھی اس سے کوئی فرمائش نہیں کی جو ملا صبر شکر کر کے کھالیا، بس آج غلطی سے بریانی کا کہہ دیا اگر

جانتا تو وہ بھی نہ کہتا۔“

وہ کٹہرے میں کھڑی تھی۔ دونوں فریقین اپنی اپنی بولے جا رہے تھے اس کا دل نہ چاہا کسی بھی بات کا جواب دے۔ جگنو کو بستر پر لٹا کر مریم کے کپڑے تبدیل کر دیے، آپا وہیں بستر پر بیٹھی کینو چھیل چھیل کر کھا رہی تھیں، زنب نے خاموشی سے کپڑے تبدیل کیے اور باہر رکھے صوفہ پر جا کر لیٹ گئی۔

”وقت انسان کو ایک موقع ضرور دیتا ہے اپنی تقدیر بدلنے کا۔“

ہاں یہ سالار ہی کی آواز تھی، وہ چونک اٹھی چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا اس نے آنکھیں موند لیں، سالارا اپنے پورے وجود سمیت اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کتنّا کہا تھا زینب اس بے فیض شخص کو چھوڑ دو یہ کبھی تمہاری قدر نہیں کر سکتا مگر تم نے میری بات نہ مانی۔“ وہ ابھی بھی ناراض تھا۔ زینب بے چین ہواٹھی جھٹ سے آنکھیں کھول دیں، آنکھیں کھولتے ہی سالارا اس سے دور ہو گیا وہ اٹھ بیٹھی دل چاہا زور زور سے روئے اپنی اس خواہش کو اس نے بمشکل قابو کیا۔

”جانے نازیہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟“

سالارا کا خیال آتے ہی اسے نازیہ بھی یاد آئی پچھلے کئی ماہ سے اس کی کوئی خبر نہ ملتی تھی۔

”فہمہ بھائی کو ضرور پتا ہوگا۔ اب جس دن ملی ان سے ضرور پوچھوں گی۔“ اپنے دماغ کو دوسری سمت لگاتے ہی خاصی ریلیکس ہو گئی۔

کچھ دیر قبل والی ڈننی کو فٹ خود بخود کم ہو گئی، وہ دوبارہ سے صوفے پر لیٹ گئی اسے بہت نیند آرہی تھی مریم نے بھی صبح سکول جانا تھا اسی لیے وہ وہیں لیٹے لیٹے سو گئی یہ جانے بنا کہ کب یاسمین انھیں اور دوسرے کمرے میں جا کر سونیں فرہاد نے بھی اسے نہ جگایا صبح چھ بجے الارم کی آواز سے اس کی جواکھ کھلی تو خود کو صوفے پر پا کر ایک دم رات والی ساری بات یاد آگئی جس کے ساتھ ہی اس کا دل فرہاد کے خلاف بھر گیا۔



وہ کب سے فون کے سامنے بیٹھی اسے ہی گھورے جارہی تھیں جو ایسے خاموش ہوا تھا جیسے دوبارہ کبھی بولے گا ہی نہیں، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ان کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی جانتی تھیں سوائے ایک شخص کے اس نمبر پر کسی کا فون نہیں آ سکتا پھر بھی یہ سوچ سوچ کر پریشان تھیں کہ جانے کون تھا؟ انہیں مسلسل بے چینی کے عالم میں انگلیاں جھٹاتے دیکھ کر شبانہ سے نہ رہا گیا۔

”آپ اتنا پریشان مت ہوں ان شاء اللہ ابھی فون آجائے گا۔“

”تم ایک دفعہ چیک تو کرو کہیں یہ فون ہی خراب نہ ہو گیا ہو اور میں ویسے ہی انتظار کرتی رہ جاؤں۔“

”نہیں فون تو بالکل ٹھیک ہے۔“

شبانہ نے ریسپورکان سے لگا کر چیک کرتے ہوئے اطلاع دی۔

”تم نے نام پوچھا تھا کون تھا؟“ دل تصدیق چاہ رہا تھا۔

”آفتاب سے بات ہوئی تھی آپ یہ چائے لیں میں ابھی ان سے پوچھ کر آپ کو بتاتی ہوں۔“

شبانہ اندر کمرے کی جانب چل دی، خالہ تسبیح ہاتھ میں لیے وہیں کمرے میں بچے تخت پر آن بیٹھیں، جب آفتاب کمرے سے باہر آیا۔

”میں نے نام تو نہیں پوچھا البتہ اتنا پتا ہے دوسری طرف کوئی خاتون تھیں جو آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔“

”خاتون.....؟“ انہوں نے بے یقینی کے عالم میں دہرایا۔

آفتاب کی طرف سے دی جانے والی یہ اطلاع ان کے لیے خاصی غیر متوقع تھی۔

”تم نے صحیح طرح سنا تھا کہ انہوں نے میرا ہی نام لیا تھا۔“

ضرور فون کسی اور کے لیے تھا، پہلی سوچ ان کے دماغ میں یہ ہی آئی۔
”جی آپا انہوں نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ ”آپ سے بات کروادی جائے اور یہ بھی کہ میں کراچی سے بات کر رہی ہوں۔“

”اچھا.....“

کسی خیال میں گم انہوں نے چائے کا ٹھنڈا کپ لبوں سے لگا لیا اور ساری چائے ایک ہی سانس میں پی گئیں۔
”اچھا میں چلتی ہوں اب فون آئے تو نام ضرور پوچھ لینا۔“ کپ واپس ٹرے میں رکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
”جی اب تو میں نام پوچھ کر ہی آپ کو بلواؤں گی۔“

شبانہ نے انہیں یقین دہانی کرائی اور وہ بیرونی دروازے کا پردہ ہٹا کر اپنے گھر جانے والے رستے پر چل دیں، یہاں آتے ہوئے ان کے قدموں میں جو روانی اور چستی تھی وہ کہیں کھو گئی اب تو صرف ایک تھکن تھی جس نے ان کے پورے وجود کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔



وہ آئی اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ حبیبہ کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا وہ شاہ زین کے حواسوں پر بری طرح سوار ہو چکی تھی کئی بار تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اگر اس کی زندگی سے حبیبہ کو نکال دیا جائے تو شاید کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ ان کے آفس میں جاب کرتی ہے شاید وہ بہترین انٹیریئر ڈیزائنر ہونے کے ساتھ ساتھ بچلر ان بزنس کی ڈگری بھی رکھتی تھی۔ خوب صورت، بُر وقار اور با اعتماد لڑکی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی قابل، فرض شناس اور ذمہ دار ورکر بن گئی۔ مگر یہ وہ تمام خوبیاں نہیں تھیں جن کے سہارے زندگی کے اتنے بڑے فیصلے ہو سکتے ان فیصلوں کے لیے تو اس کا فیملی بیک گراؤنڈ اہمیت رکھتا تھا۔

وہ کون تھی یا کس کی بیٹی تھی؟ یہ وہ سوال تھے جن کا جواب جانے بٹا وہ اپنی ماما سے کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی اپر کلاس فیملی سے تعلق رکھتی تھی یا لوئر کلاس گھرانے سے اس کا تعلق تھا، شاہ زین کو اس سے کوئی فرض نہیں پڑتا تھا۔ صرف اپنے ماما، پاپا کو حبیبہ کے گھر والوں سے ملوانا ضروری اور رکھی تھا جس کے لیے پہلے حبیبہ سے بات کرنی لازمی تھی اور آج اتنے ماہ گزر جانے کے بعد بھی وہ خود میں اتنی اہمیت نہ پا رہا تھا کہ حبیبہ سے یہ سب پوچھ سکتا۔ بہر حال اب جو بھی تھا اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا، اسے جلد ہی حبیبہ سے بات کرنی تھی مبادا کہیں کوئی اور درمیان میں آکر اس معاملے کو خراب نہ کرے۔
یہ سب سوچتے ہوئے شاہ زین نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ کو آن کر دیا جس کی سکرین پر بالکل سامنے حبیبہ کی بڑی سی تصویر جگمگا رہی تھی، وہ خود بخود مسکرا دیا، لیپ ٹاپ اپنے قریب کرتا ہوا وہ اس کے حسن میں اتنا محو ہوا کہ آس پاس سب کچھ فراموش کر دیا۔



”ارے تو کیا سالار نے تمہیں اتنے ماہ میں ایک بار بھی فون نہیں کیا؟ مطلب یہ کہ اس نے تمہیں نازیہ کے آپریشن کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔“

فضہ بھابی نے حیرت سے اس کا بھرپور جائزہ لیا، جوا ہوا وہ خاموش رہی اس بات کا وہ کیا جواب دیتی۔
”بہر حال اب تو وہ خاصی بہتر ہے اور مباحث بتا رہی تھی کہ شاید ایک دو ماہ میں سالار یہاں آئے گا اپنی تمام پراپرٹی

بیچنے وہ دعویٰ شفٹ ہو رہا ہے۔“ انہوں نے ایک نیا انکشاف کیا۔
”اچھا.....“

اس سے زیادہ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا، نضہ بھابی نے ایک نظر اس کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی۔
”کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“
”جی ٹھیک ہوں آپ کے پاس اگر نازیہ کا کوئی نمبر ضرور ہو تو دے دیں میں فون کر کے اسے صحت یابی کی مبارک باد ہی دے دوں۔“
”میرے پاس تو نہیں البتہ اسفند کے پاس سالار کا نمبر ضرور ہوگا اگر مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ تم ایسا کرنا صباحت سے کہنا وہ دے دے گی۔“

”جی ٹھیک ہے میں صباحت بھابی سے ہی لے لوں گی۔“
پچھتاوے نے اسے ایک بار پھر گھیر لیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اب وہ کبھی سالار کو نہ دیکھ سکے گی وہ اس سے کبھی نہیں ملے گا، کاش اس نے سالار کی بات مان لی ہوتی۔
”اماں مجھے کھانا دو۔“

جگنو نے اس کا دو پٹا کھینچ کر اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ یک دم چونک اٹھی، بیٹی کے چہرے پر پڑنے والی نظر نے اسے اندر تک آسودہ کر دیا ہلکا سا پچھتاوا جو دل میں جگہ بنانے چلا تھا یک دم ہی اڑن چھو ہو گیا۔
”آپ بیٹھیں بھابی میں اسے کھانے کے لیے کچھ دوں۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”جیس بس میں بھی اب چلوں گی پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔“
اپنا ہینڈ بیگ سنبھالتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اللہ حافظ میری صباحت سے بات ہوئی تو تمہیں نازیہ کا نمبر لے دوں گی۔“
زیب سے ملنے کے بعد وہ گھر کی دہلیز پار کر گئیں اور وہ جلدی سے کچن میں آگئی تاکہ جگنو کے لیے کچھ ایسا تیار کرے جسے کھا کر وہ خوش ہو جائے۔ اس سے اس کے دل میں سوائے جگنو کی محبت کے کوئی دوسرا خیال باقی نہیں رہا تھا۔



وہ اپنی آنکھ کے آنسوؤں کا قطرہ قطرہ بہا دینا چاہتی تھی اسے جتنا رونا تھا بس آج ہی رو لینا تھا آج کے بعد کبھی نہیں۔
ایشال کے تصور کے ساتھ اس کی کوئی یاد وابستہ نہ تھی ماسوائے اس رشتے کے جو ان دو اجنبی اور انجان لوگوں کے درمیان چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس نے اتنے سالوں میں کبھی ایشال کی کوئی تصویر بھی نہ دیکھی تھی صرف ایشال کا ہلکا سا وہ سراپا جو اس شام کے حوالے سے اس کے ذہن میں موجود تھا آج وہ بھی کھرج کر نکال دیا۔

وہ ایشال نامی شخص کو بھول جانا چاہتی تھی جس نے اس کی کوئی قدر نہیں کی، کاش وہ ایک کزن ہونے کے ناطے ہی زندگی میں ایک بار اس سے آکر ملتا تو سہی۔ اسے اپنی اور ایشال کی محبت سے آگاہ کرتا تو وہ یقیناً اس کا ضرور ساتھ دیتی خود ملک انکل سے اس کی سفارش کرتی۔ مگر اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جسے ایشال کے نزدیک وہ ایک کم تر درجے کی حیثیت رکھتی تھی۔ شاید اپنی ماں کی طرح وہ بھی اس سے صرف اس لیے نفرت کرتا تھا کہ ان کے نزدیک اس کی ماں ایک بدکردار عورت تھی وقت نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ۔

”عورت ایک حسین شے کا مجسمہ ہوتی ہے جس پر پڑنے والے پتھر سے آنے والی معمولی سی دراڑ اسے وہ بد صورتی عطا کر دیتی ہے جو تا عمر ختم نہیں ہوتی حتیٰ کہ وہ عورت ختم ہو جاتی ہے۔“

اسے اپنے آپ کو بہت سنبھال کر چلنا تھا تا کہ دنیا کو بتا سکے کہ اس کی تربیت کرنے والی عورت دنیا کی عظیم ترین عورتوں میں سے ایک تھی۔ ہاں اسے اپنی ماں پر فخر تھا وہ ساری زندگی ایٹال کے نام پر صرف اس لیے گزار دینا چاہتی تھی کہ اپنی ماں کے دامن پر لگا ماضی کا داغ دھو سکے۔ اسے امید تھی کہ وہ اس عمل میں ضرور کامیاب ہوگی اور جلد ہی دنیا پر ثابت کر دے گی کہ اس کی ماں اتنی گناہ گار نہ تھی جتنا لوگوں نے اسے بدنام کر دیا۔

○.....❖.....○

”ارے ارے دیکھ کر گر جاؤ گی۔“

اس سے قبل کہ وہ میز میوں سے پھسل جاتی، شاہ زین نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

”جن کے ساتھ تمہارے جیسے مخلص دوست ہوں وہ لوگ کبھی پھسل کر نہیں گرتے۔“

”تھینک گاؤ تم نے مجھے اپنا دوست تو مانا۔“ وہ شرارنا ہنس دی۔

شاہ زین نے اس کا بازو اپنی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لیا۔

”دوست مانتی ہوں اسی لیے تو آج تم نے مجھے گرنے سے بچانے کی ہمت کی ورنہ ایک انجان لڑکی کو اس طرح

سنبھالنے سے قبل کتنی بار سوچنا پڑتا کہ کہیں اگلی بندی غلط ہی نہ سمجھ لے۔“ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھی۔

”ہاں یہ بھی درست ہے۔“ وہ فوراً ہی مان گیا۔

”ویسے تم اس وقت جا کہاں رہی ہو؟“

شاہ زین اپنی رسٹ وایج پر نظر ڈالتے ہوئے اس کے ساتھ ہی چلنے لگا۔

”یونیورسٹی، دراصل آج میری کلاس دو بجے تھی اس لیے میں نے سر سے کل ہی ہاف لیو لے لی تھی۔“

”میں اسی طرف جا رہا ہوں، آجاؤ تمہیں بھی چھوڑ دوں۔“ شاہ زین کی آفر بری نہ تھی۔

”شیوہ اگر زحمت نہ ہو تو۔“

اپنے سبکی بالوں کو اس نے اک ادا سے پیچھے کرتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارے کسی کام سے مجھے زحمت کبھی نہیں ہو سکتی۔“

شاہ زین نے رک کر اس کے خوب صورت چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

”بلکہ مجھے تو اس وقت بہت اچھا لگتا ہے جب میں تمہارا کوئی کام کروں۔“

”اچھا پھر تو مجھے اپنے سارے کام تم سے ہی کروانے چاہئیں۔“

جیبہ ہنس دی، مدھر گھٹنیوں کی آواز، جن کا سحر ہمیشہ سے شاہ زین کو اپنی گرفت میں لے لیا کرتا تھا، وہ بتا جواب دیئے

چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ دیگر باتوں کی طرح اسے ہمیشہ جیبہ کی سنگت بھی بہت اچھی لگتی تھی۔

○.....❖.....○

سالار جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، چاروں طرف پھیلی خاموشی سے یک دم ہی ہول اٹھا جلدی سے آگے بڑھا، ناب گھما

کراپے بیڈروم کا دروازہ کھولا، چاروں طرف گھپ اندھیرا طاری تھا، دروازے کے پیچھے ہاتھ ڈال کر لائٹ آن کی، سفید

روشنی ہر طرف پھیل گئی۔

”نازیہ.....نازیہ۔“

آگے بڑھ کر اس نے نازیہ کے منہ سے کبل ہٹایا۔

”ارے آپ کب آئے۔“

گہری نیند سے بیدار ہونے کے باوجود اسے اپنے سامنے دیکھ کر نازیہ کے چہرے پر ایک سکون سا چھا گیا۔ وہ کہیاں بیڈ سے نکلا کراٹھ بیٹھی۔

”ابھی ابھی آیا ہوں۔“ سالار نے اس کے پیچھے رکھا تکیہ درست کیا۔

”مالتی کہاں ہے؟“

مالتی نازیہ کی زس کا نام تھا۔

”آج اس کے بچے کی طبیعت خراب تھی بس ابھی کچھ دیر قبل ہی ٹکلی ہے گھر جانے کے لیے، میں نے خود اسے چھٹی دی ہے۔“

”میرے آنے کے بعد چھٹی دے دیتیں، جانتی ہوں ابھی جب میں گھر آیا تو ہر طرف پھیلے سناٹے سے میرا دل ہول اٹھا تھا اتنی خاموشی جیسے گھر نہیں کوئی قبرستان ہو، کم از کم ٹی دی ہی چلا کر رکھا کر اس کی آواز سے بھی گھر میں زندگی محسوس ہونے لگتی ہے۔“

نازیہ خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتی گئی۔ جہاں ایک عیب سا تاثر پھیلا ہوا تھا بے بسی اور تنہائی کی کیفیت نے سالار کو اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا یا شاید نازیہ کو ایسا محسوس ہوا۔

”تم نے مالتی سے کہا تھا کل جب آئے اپنے بچے کو بھی ساتھ ہی لے آئے، یہاں کون ہے جس نے اسے تنگ کرنا ہے۔“

سالار نے ریوٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا الماری سے اپنے کپڑے نکالے، ہاتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ نازیہ نے آواز دے کر روک لیا۔

”سالار مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“

سالار جواب دے کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جو کہہ رہا تھا سب سچ تھا، گھر میں پھیلی خاموشی اب نازیہ کو بھی ڈسنے لگی تھی۔ پاکستان میں کم از کم یہ سہولت تو تھی کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی آیا رہتا مگر یہاں تو سوائے ویک اینڈ کے کبھی کوئی نہ آتا تھا۔ نازیہ کی والدہ ایک ہفتہ ان کے گھر رہ کر واپس گئی تھیں، ان کا گھر نازیہ کے پارٹمنٹ سے تقریباً ایک گھنٹہ کی مسافت پر تھا لہذا اب اگلے ہفتہ سے قبل ان کا آنا ناممکن تھا۔ ایسے میں سارا دن گھر میں اکیلے رہنا نازیہ کو بھی مزید بیمار کر رہا تھا وہ پاکستان واپس جانا چاہتی تھی جو فی الحال ناممکن تھا، کیونکہ ابھی اس کا علاج جاری تھا۔

”کیا کہہ رہی تھیں تم۔“ سالار نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنائے اور نازیہ کے قریب آن بیٹھا جو جانے کن خیالوں میں گم تھی۔

”نازیہ.....“

اس نے نازیہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”آں ہاں!“ وہ بری طرح چوکی۔

”تم مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”ایک بات کہوں سالار ناراض مت ہوتا۔“

”ہاں بولو کیا کہنا ہے۔“

”سالار تم جانتے ہو نا مجھے شروع سے بچے بہت اچھے لگتے ہیں، میں نے جب بھی تم سے یہ بات کی تم نے ہمیشہ مجھ

جھٹلا دیا اور کہا تمہیں کبھی یہ کی محسوس نہیں ہوئی میں صبح کہہ رہی ہوں نا سالار۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکی، سالار خاموشی سے سب سن رہا تھا۔

”ہاں.....“ وہ دھیرے سے بولا۔

”لیکن سالار اب مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے تم بھی گھر کی اس تنہائی سے تھک گئے ہو۔“

سالار ابھی بھی خاموش رہا جانے کیوں وہ آج نازیہ کی کسی بھی بات کو جھٹلانا نہ چاہتا تھا۔

”اس لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ دوسری شادی کرلو۔“ وہ بے بسی سے بولی، نئی اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔

”تمہارے سوا کسی دوسری عورت کا ساتھ میرا مقدر نہیں۔“

دل و دماغ پر چھائے لعین کے تصور کو جھٹکتے ہوئے اس نے نازیہ کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

”میں اس گھر کی تنہائی میں تمہارے ساتھ خوش ہوں۔“ چاہ کر بھی وہ اپنے لہجہ میں سچائی پیدا نہ کر سکا۔

”لیکن میں خوش نہیں ہوئی سالار۔“ نازیہ رو ہانسی ہو گئی۔

”مجھے ایک بچہ لا دو سالار کسی سے بھی مانگ کر“

”مانگ کر.....“

نازیہ کے الفاظ سالار کو حیران کر گئے۔

”ہاں سالار مجھے بچہ چاہیے مجھے ایک بچہ ایڈاپٹ کرنا ہے، بس سالار اب میں اس طرح زندگی نہیں گزار سکتی دنیا میں کئی

لوگ ہمارے جیسے ہیں جن کی اپنی اولاد نہیں ہوتی مگر وہ دوسروں کے بچوں کو اپنا کر اپنی زندگی کو نکلیں بنا لیتے ہیں تم میری بات

سمجھ رہے ہونا۔“

سالار کی خاموشی محسوس کر کے وہ ذرا سارک گئی۔

”اس لیے بہتر ہے سالار ہم بھی ایک بچہ ایڈاپٹ کر لیں اور پھر اپنی زندگی اس کے سہارے گزار دیں یقیناً جانو بچہ کسی

کا بھی ہوا اپنا سمجھ کر پالو تو اپنا ہی ہو جاتا ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہمیں یہاں اس پردیس میں کون اپنا بچہ دے گا ہمارے تمام بہن بھائیوں کے بچے تو اچھے

خاصے ہوش مند ہیں ہر کوشش کے باوجود وہ ہمیں کبھی اپنے ماں باپ کا درجہ نہیں دے سکیں گے۔“

سالار نے اسے سمجھایا تا کہ وہ اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل سکے، جس میں کچھ دیر قبل تک سالار بھی کھویا ہوا تھا۔

”دیے بھی لے پا لک بچوں کی ولدیت کو تبدیل کرنا قرآن کی رُو سے ناجائز ہے ایسے میں ہم کس طرح کوئی بچہ پال

سکتے ہیں۔“

”ایک بات کہوں سالار۔“ وہ سالار کی بات کو ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں کہو یا راب کیا کہنا ہے۔“

”تم پاکستان جا رہے ہو نا۔“

”ارادہ تو ہے تاکہ کاروبار دینی شفٹ کر سکوں۔“

”تو بس پھر ٹھیک ہے تم وہاں جانے سے قبل میری زینب سے بات کروادو۔“

”کیوں خیریت، آج تمہیں زینب کیسے یاد آگئی۔“

”میں اسے کہوں گی وہ ہمیں اپنی جگہ دے دے اور وہ مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے۔“ سالار اس کی ہچکناہ بات سن کر ہنس

دیا۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہارے کہنے پر وہ تمہیں اپنی بیٹی دے دے گی ان بچیوں کے لیے تو وہ فرہاد جیسے شخص کے

ساتھ اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے ورنہ جانے کب کا اسے چھوڑ چکی ہوتی۔“

”مجھے یقین ہے وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گی۔“ نازیہ بھند ہوگئی۔

”پہلی بات تو یہ کہ بچی صرف زینب کی نہیں ہے اور فرہاد کبھی بھی اپنی بیٹی اس طرح ہمیں نہیں دے گا بالفرض اگر اس

نے دے بھی دی تو سوچو دو تین، چار سالہ بچی جو ایک پل کے لیے بھی اپنی ماں کو خود سے دور نہیں ہونے دیتی یہاں آ کر کس

طرح رہ پائے گی۔“

اس نے نازیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔

وہ خاموش ہوگئی۔

”چلو تھوڑی سی ہمت کرو آج کھانا باہر کھاتے ہیں۔“

سالار قریب رکھی وہیل چیئر تھسیٹ لایا، فی الحال نازیہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتی تھی۔ ان کے اپارٹمنٹ سے کچھ دور

میں روڈ پر ایک پاکستانی ریستورنٹ تھا جہاں وہ دونوں اکثر کھانا کھانے جایا کرتے، ریستورنٹ چونکہ واکنگ ڈسٹینس پر تھا لہذا

سالار نازیہ کو وہیل چیئر پر ہی اپنے ساتھ لے جایا کرتا۔

”تم وہیل چیئر ہٹا دو میں آج پیدل ہی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔“ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جب تک ڈاکٹر تمہیں واک کرنے کی اجازت نہیں دیتے تمہیں اس وہیل چیئر پر ہی سفر کرنا ہوگا لہذا بیٹھ جاؤ۔“

سالار نے اس کا پیدل چلنے والا آئیڈیا قطعی رد کر دیا۔ نازیہ نے خاموشی سے کھڑے ہو کر شیشے میں اپنا مکمل جائزہ لیا،

سر کے بال درست کیے اور سالار کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

”چلو تم وہیل چیئر لے لو جتنا میں چل سکی بنا تمہکے چل لوں گی جب تمک گئی تو میرا بوجھ اٹھالینا۔“

اوکے۔

سالار مان گیا، دونوں آہستہ آہستہ چلتے لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔



”تمہیں ایک بات بتاؤں۔“

ارم سکول میں اس کے ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے نہایت ہی راز دارانہ انداز میں بولی اس کی آواز و لہجہ دونوں ہی اس قدر

مدھم تھے کہ سوائے اس کے کوئی دوسرا نہ سن سکتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔
 ”خیریت تو ہے کیا ہو گیا۔“ ارم کے انداز گفتگو نے اسے تھوڑا سا پریشان کر دیا۔
 ”پہلے وعدہ کرو تم کسی کو بتاؤ گی نہیں۔“
 ”جلدی بتاؤ ارم کیا ہو گیا کیوں اس قدر سسپنس پھیلا رہی ہو۔“
 وہ جلد از جلد جاننا چاہتی تھی کہ ایسا کیا ہو گیا جو ارم اس قدر پریشان ہے۔
 ارم نے یہاں وہاں دیکھا کہیں کوئی ان کی طرف متوجہ تو نہیں۔
 ”بی سیکشن کی روما کو جانتی ہونا روا وحید صائمہ آنٹی کی بیٹی۔“ اس نے ارم کی جانب دیکھا۔
 ”ارے وہ ہی صائمہ آنٹی جن کے کپڑے تمہاری امی سیتی ہیں۔“
 ”ہاں ہاں میں روما کو جانتی ہوں تم آگے بتاؤ ایسا کیا ہو گیا جو تم اتنی دیر سے مسلسل سسپنس پھیلا رہی ہو۔“ وہ جھنجھلا اٹھی۔

”یار وہ کل شام سے غائب ہے۔“ ارم مزید اس کے قریب ہو گئی۔
 ”غائب ہے.....“ اس نے حیرت سے دہرایا۔
 ”میں تمہاری بات نہیں سمجھی تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔“
 ”یار روما کل چار بجے ٹیوشن پڑھنے گئی اور پھر واپس نہیں آئی، آنٹی آٹھ بجے کے قریب مجھ سے پوچھنے آئی تھیں کیونکہ وہ میری ہی اکیڈمی آتی ہے ٹیوشن پڑھنے۔“
 ”اچھا پھر.....“

”پھر یہ کہ میں نے تو اسے کل دیکھا ہی نہیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ کل اکیڈمی آئی ہی نہیں۔“
 ”پھر کہاں گئی؟“ ارم کی وضاحت نے اسے حیران کر دیا۔
 ”یہ ہی تو نہیں بتا آنٹی اور انکل اس قدر پریشان ہیں کہ کیا بتاؤں، رات میں امی کے ساتھ گئی تھی تو انکل نے منع کیا کہ فی الحال ہم روما کی گم شدگی سے متعلق محلے میں کسی سے ذکر نہ کریں۔“
 ”ہو سکتا ہے وہ کسی بات پر ناراض ہو کر اپنے کسی رشتہ دار کے گھر چلی گئی ہو تا کہ اس طرح اپنی ماں کو پریشان کر سکے۔“
 ”نہیں، اگر ایسا ہوتا تو اس کے گھر والے اتنے پریشان نہ ہوتے ویسے بھی انہوں نے رات تک اپنے تمام رشتہ داروں کے گھر تو یقیناً دیکھ ہی لیا ہوگا۔“

ارم کی بات خاصی حد تک درست تھی۔
 ”تو پھر تمہارے خیال میں وہ کہاں گئی۔“
 روما کی اس طرح گم شدگی نے اسے بھی تشویش میں مبتلا کر دیا۔
 ”تم شو کے کے دوست رضا کو جانتی ہو۔“
 ”نہیں میں سوائے اس منحوس انسان کے اور کسی کو نہیں جانتی۔“
 ”تم نے اسے دیکھا ضرور ہوگا، سوکھا لمبا سا، اکثر ہی شو کے کے ساتھ ہوتا ہے۔“
 ”ہاں نہیں میں نے دھیان نہیں دیا۔“

”اس کی روما سے دوستی تھی وہ ہماری اکیڈمی میں نیوٹن پڑھنے بھی آتا تھا میں نے وہاں بھی ایک دوبارہ دیکھا روما کو اس سے بات کرتے ہوئے تو مجھے خاصی حیرت ہوئی۔ پھر میں نے روما کو ڈھکے چھپے لفظوں میں منع بھی کیا کہ وہ اس لڑکے سے دور رہے تو اچھا ہوگا مگر میری یہ بات اس نے سن کر اڑادی۔“

دیکر باتوں کی طرح یہ بھی اس کے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔

”اور جب میں نے اگلے دن ان دونوں کو پھر اکٹھے دیکھا تو خاموش ہو گئی اور دوبارہ روما سے اس ٹاپک پر بات نہیں کی۔“

”اوہ تو تمہارے خیال میں.....“ اپنی بات اس نے جان بوجھ کر ادھوری چھوڑ دی۔

”ہاں یقیناً روما کی کم شدگی میں اسی خبیث کا ہاتھ ہے۔“

”تو یہ بات تم صائمہ آئی کو بتا دو۔“

”نہیں مجھے امی نے سختی سے منع کیا ہے۔ تم تو شوکے اور اس کے دوستوں کی بد معاشی سے واقف ہو۔“ ارم یک دم خوف زدہ ہو گئی۔

”ایسا نہ ہو کہ بلا وجہ مجھے نقصان پہنچائیں۔“

”چلو اللہ کرے وہ خیر خیریت سے اپنے گھر آجائے۔“

دونوں نے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا کی جس کی قبولیت کی گھڑی شاید گزر چکی تھی۔ اسی شام دو گلیاں آگے موجود ایک باڑے سے ملنے والی کسی لڑکی کی تشدد زدہ لاش نے پورے محلے میں تہلکہ مچا دیا۔ بنا جانے ہی اسے یہ محسوس ہوا کہ لاش یقیناً روما کی ہے جو کل شام سے غائب تھی۔ رات تک اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی روما کی اس طرح کی موت نے پورے محلے میں ایک کہرام برپا کر دیا۔ اس واقعہ کے خوف نے پورے محلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جانے کیوں اسے اور ارم کو ایسا لگتا جیسے روما کے ہولناک قتل میں شوکا اور اس کا دوست رضا ملوث ہیں مگر یہ ایک ایسی بات تھی جو وہ کبھی کسی سے کہہ نہ سکتی تھیں۔ ارم تو ذہنی طور پر اس قدر آپ سیٹ ہوئی کہ اگلے کئی دنوں تک سکول بھی نہ آئی، کبھی کبھی اس کا دل چاہتا وہ آئی صائمہ کو روما اور رضا کی دوستی سے آگاہ کر دے مگر وہ خود شوکے سے اتنا ڈرتی تھی کہ شاید مرتے دم تک یہ بات منہ سے نہ نکال پاتی۔

کبھی کبھی اسے ایسا بھی لگتا جیسے ارم اور اس کے علاوہ اماں کو کبھی شوکے پر شک ہے۔ اس نے کئی بار اپنی ماں کی آنکھوں میں جھانکتی خوف کی پرچھائیاں صاف محسوس کیں۔ ماں اسے سکول خود چھوڑنے جانے لگی تھیں اور جب وہ سکول سے واپس آتی تو ماں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ملتیں اسے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو ماں گلی کی نکل تک آ جاتیں۔ یہ تمام باتیں اتنا سمجھانے کے لیے کافی تھیں کہ اماں شوکت اور اس کے دوستوں سے ڈر گئی ہیں اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا یہ خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا جس کا اندازہ اسے بخوبی ہو چکا تھا۔



”یہ جتنو کتنے سال کی ہو گئی ہے۔“

یاسمین آپا نے چائے کا سپ لیتے ہوئے اک نظر جتنو پر ڈالی جو قریب ہی بیٹھی اپنے کھیل میں مگن تھی بظاہر ان کا انداز خاصا سرسری سا تھا۔

”اگلے ماہ کی پندرہ کو پورے چار سال کی ہو جائے گی سوچ رہی ہوں اسے بھی سکول داخل کروادوں۔“ نمنب نے

بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”تو تم کیا کوئی دوائی وغیرہ لے رہی ہو یا کوئی اور مسئلہ ہے۔“

”کس بات کی دوا۔“ زینب ان کی بات کی گہرائی تک نہ پہنچ پائی۔

”بیٹی والی ماں کو تو بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جلد ہی بیٹے کی نعمت سے بھی نوازے۔“

وہ تمہید باندھتے ہوئے بولیں۔

”مگر تم تو شاید دو بیٹیوں پر ہی قناعت کیے بیٹھی ہو ورنہ اب تک تو ایک بیٹا ہو جانا چاہیے تھا۔“ اب وہ کھل کر اپنے مدعا

کی جانب آگئیں۔

”بیٹی ہو یا بیٹا یہ تو اللہ کی جانب سے ہے ضروری نہیں کہ تیسری دفعہ مجھے بیٹا ہی ہو۔“

اپنی ذاتیات میں آپا کی اس قدر دخل اندازی اسے ذرا نہ بھائی۔

”ویسے بھی یہ قطعی طور پر میرا اپنا ذاتی مسئلہ ہے اور مجھے نہیں اچھا لگتا کوئی بلا وجہ اس مسئلے کی ٹوہ لے۔“ ہلکا سا غصہ اس

کے لہجہ میں در آیا۔

”ایک تو تم ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتی ہو اور پھر یہ بھی بھول جاتی ہو کہ بات کس سے کر رہی ہو۔“ آپا کا زینب کا

جواب دینا بالکل پسند نہ آیا۔

”اب صباحت ہی کو لے لو پہلے بھی ماشاء اللہ دو بیٹے ہیں اور پھر سے اگلے ماہ وہ ایک بار پھر ماں کے عہدے پر فائز

ہونے والی ہے۔“

”ضروری تو نہیں جو کام وہ کریں وہ مجھ پر بھی فرض ہو جائے۔“ وہ تلخ ہو گئی۔

کچھ دن قبل والا غصہ شاید ابھی بھی زینب کے دل میں کہیں موجود تھا ورنہ عام طور پر وہ کبھی اس طرح بات نہ کیا کرتی

تھی۔

”میں نے تو ایسے ہی سرسری سا ذکر کیا تھا تم نہ جانے کیوں اتنا غصے میں آ گئی۔ بس ایک دلی خواہش تھی کہ جیسے دوسرے

دونوں بھائیوں کو اللہ تعالیٰ نے بیٹے دیے ہیں فرہاد کو بھی اس نعمت سے نوازے اور اس میں کوئی ایسی برائی والی بات نہ تھی کہ تم

مجھے اسے قدر لٹاؤ نہ لگو۔“

وہ برا مناتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”میں سامان پیک کر رہی ہوں تم بھابی کو فون کر دو وہ ڈرائیور بھیج دیں مجھے ان کے گھر واپس جانا ہے۔ چار دن نند کو

برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔“ ان کی شکل دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ کس قدر غصے میں ہیں، زینب کو

تاسف نے آ گھیرا۔

”کیا ضرورت تھی بلا وجہ اس سے اتنی بحث کرنے کی اب پتا نہیں اس ساری گفتگو کو فرہاد کے سامنے کس طرح پیش

کریں۔ چلو اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

دل ہی دل میں یہ سب سوچتی وہ فون کی جانب بڑھی۔



اب کی بار جو اماں کی طبیعت خراب ہوئی تو سنبھلنے میں ہی نہ آئی بخار کی شدت کم ضرور ہوتی مگر ختم نہ ہوتا، کبھی کبھی تو

اسے لگتا جیسے ماں کے اندر کوئی ایسا روگ پل رہا ہے جو اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے۔ جو بھی تھا اس کے لیے ماں کی زندگی بہت اہمیت رکھتی تھی۔ یہ ہی تو اس کا ایک واحد سہارا تھا جس نے اسے تحفظ کا احساس دے رکھا تھا خدا نا خواستہ یہ سہارا اس سے چھین جاتا تو وہ کہیں کی نہ رہتی۔

ماں کی لمحہ لمحہ بڑھتی بیماری اسے تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔ کراچی سے آنے والے فون کے بعد وہ بہت پر امید تھی، اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کی پریشانیوں کے دن ختم ہونے والے ہیں، مگر اس کی یہ امید بھی گزرتے وقت کے ساتھ دم توڑ گئی، اس فون کے بعد دوبارہ نہ تو کوئی فون آیا اور نہ ہی اماں نے خود کسی کو فون کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

اکثر اس کا دل چاہتا وہ ماں سے پوچھے کہ وہ کون سے حالات تھے جن کے تحت تنہائی کی زندگی اس کا مقدر بن گئی۔ اسے لگتا ماں اس سے بہت کچھ چھپا رہی ہے وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا ماضی کیا ہے وقت اور حالات نے اسے بہت سمجھ دار بنا دیا تھا، وہ سمجھ چکی تھی کہ اپنے بارے میں ہر بات جاننا اب اس کے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے، اسے انتظار تھا کہ اماں کی طبیعت جیسے ہی کچھ سنبھلے وہ اماں سے پوچھے کہ ٹرک میں رکھے اس چھوٹے سے باکس میں ایسا کیا ہے جو ماں اسے ہمیشہ تالا لگا کر رکھتی ہے۔ شاید اس بات میں کوئی ایسا راز تھا جو اماں کے ماضی سے جڑا تھا، اب یہ راز اس کے لیے جاننا اشد ضروری تھا، اماں سے بات کس طرح شروع کی جائے۔ وہ اسی ادھیڑ سن میں مبتلا تھی، جب فاطمہ خالہ اماں کو ہسپتال سے دوا دلا کر گھر واپس لائیں۔

”بیٹا اپنی ماں کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ پھر میں اسے دوائی پلاؤں۔“ اسے ہدایت دے کر وہ واپس اندر کمرے میں چلی گئیں، اس نے اماں کے لیے تیار کیا ہوا دلیہ پیالی میں نکالا اور اندر آگئی۔

”بیٹا آفتاب کراچی جا رہا ہے میں نے اسے نمبر دے دیا ہے۔ وہ ان شاء اللہ وہاں جا کر انہیں ضرور ڈھونڈ لے گا اور مجھے امید ہے تمہارا حال سن کر وہ ضرور اپنا حصہ بھول کر تم سے ملنے آئیں گے۔“ خالہ نے اماں کا ہاتھ پیار سے تھپتھپایا۔

”ویسے تو آفتاب تمہارے بھائی کے ایک دوست کو بھی جانتا ہے میں نے کہا تھا کہ وہاں جا کر تمہارے بھائی کی معلومات لے اگر کوئی اتہ پتا ہے تو اسے بھی ایک خط لکھ دے۔“

”نہیں خالہ میں ان لوگوں کو اپنی بیماری کی اطلاع نہیں دینا چاہتی۔“ اماں..... نے خالہ کو فوراً سے پیشتر منع کر دیا۔

”میرے بہن بھائیوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ ہمیشہ سے جانتے تھے کہ میں کہاں اور کس حال میں ہوں مگر اللہ بھلا کرے ان لوگوں کا، ایسا تعلق ختم کیا کہ کبھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ میں کن حالوں میں زندہ ہوں۔ ان کا مجھ پر یہ بھی احسان بہت ہے جو اس مکان میں کسی نے اپنا حصہ نہ جتایا اگر جو وہ اس کے حصے بخرے کرنے آجاتے تو شاید میرے سر پر یہ چھت بھی نہ ہوتی۔“

بولتے بولتے اماں کے گلے میں پھندا سا لگ گیا، شاید وہ رو رہی تھیں۔

”مکان کا ایک حصہ کرایہ پر دے کر جانے میری کتنی مشکلیں حل ہوئیں، ان کے اس احسان کو دل سے مانتے ہوئے میں نے ہمیشہ انہیں دعائیں دیں۔ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے مگر خالہ میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ مجھے آج یہاں آ کر اس حال میں دیکھیں۔ میں اپنا بھرم ختم نہیں کرنا چاہتی میری تو صرف اتنی سی خواہش ہے کہ میری بیٹی اپنوں میں واپس چلی جائے جس کی

خاطر میں اتنی کوشش کر رہی ہوں ورنہ کسی سے ملنے کی کوئی خوشی میرے دل میں نہیں ہے۔“
”اچھا بیٹا تم اب رومت تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی، صبح سے بھوک ہو یہ دلیہ کھا لو اللہ تعالیٰ تمہیں صحت و تندرستی دے تمہارا سایہ اس بچی کے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔“

خالہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر کی طرف چل دیں جب اس نے بھاگ کر انہیں پیچھے سے جالیا۔
”خالہ ایک منٹ مجھے آپ سے کام ہے۔“ خالہ دروازہ کھولتے کھولتے رک گئیں۔
”خالہ، اماں کو آخر ایسی کون سی بیماری ہے جو ان کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے، اماں کا بخار ٹھیک کیوں نہیں ہو رہا، انہیں کیا بیماری ہے آپ مجھے سب کچھ صاف صاف بتادیں۔“ وہ خالہ کا بازو پکڑے کھڑی تھی۔
”کیا بتاؤں بیٹا۔“ انہوں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

”تمہاری ماں کو ٹی بی ہے جو اس کی ہڈیوں میں پھیل گئی ہے۔“
خالہ کی بات سنتے ہی اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔
”اس کے پیچھے دے بھی خراب ہو چکے ہیں سمجھ نہیں آتا وہ ابھی تک زندہ کیسے ہے۔“
خالہ کی بات ختم ہوتے ہی وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر بلک بلک کر رونے لگی، خالہ نے کچھ دیر اسے اسی طرح رونے دیا جانتی تھیں کہ یہ خبر ہی ایسی ہے جس نے اس معصوم بچی کا دل ہلا دیا ہے۔

”دیکھو بیٹا میں شاید تمہیں تمہاری ماں کی بیماری کا کبھی نہ بتاتی مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ تمہیں سب کچھ بتا دوں۔
جانے حالات کیا پلٹا کھائیں کم از کم تمہیں آنے والے وقت کے لیے خود کو تیار تو رکھنا چاہیے۔ اب اپنے آپ کو مضبوط کر دو یہ وہ وقت ہے جب تمہاری ماں کو تمہاری ضرورت ہے، اس کی خدمت کرو اس پر ظاہر نہ ہونے دو کہ تمہیں کچھ پتا ہے۔ آفتاب کراچی جا کر تمہارے تایا کو ڈھونڈے کی کوشش کرے گا ایک دفعہ ان سے رابطہ ہو جائے تو تمہاری ماں کا علاج بھی ہو جائے گا اور تمہیں بھی یقیناً سہارا مل جائے گا۔ سمجھ لو ان کا ملنا تمہاری تمام پریشانیوں کا حل ہے۔“

خالہ نے ہر بات کی مکمل وضاحت کر دی اس کے لیے اس وقت سوائے اپنی ماں کی بیماری کے ہر بات غیر ضروری تھی۔
”اٹھو بیٹا وضو کر کے نماز پڑھو اور اپنی ماں کے حق میں دعا کرو۔“

خالہ نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا انہیں اس وقت وہ انتہائی قابل ترس لگی انہوں نے اسے اپنے گلے سے لگا کر خاموش کر دیا۔

”فکر نہ کرو اللہ بڑا کارساز ہے کوئی نہ کوئی سبیل ضرور پیدا کرے گا۔“
”ان شاء اللہ“ اس نے پورے یقین کے ساتھ ”آمین“ کہا اور وضو کرنے چل دی۔



”تم نے یا سمین آپا سے کیا کہا ہے۔“
فرہاد گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس کا لہجہ اس کے غصے کی گواہی دے رہا تھا۔
”کچھ بھی نہیں کیوں کیا ہوا؟“ زینب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔
”جھوٹ مت بولو زینب، ان کا مجھے کچھ دیر قبل فون آیا تھا اور جب میں نے پوچھا تو بتایا کہ تم نے بے عزتی کی۔
بلاوج کی باتیں سنائیں اور وہ فتنہ بھابی کے گھر واپس چلی گئیں۔“

”اک ذرا سی بات کا انہوں نے اتنا جھگڑا بنایا کہ آپ کو فون کر کے میری چٹلی لگا دی، خوب کیا بات ہے۔“
 یاسمین آپا کی اس حرکت نے زینب کو تپا دیا آخر وہ بھی انسان تھی کب تک یہ سب کچھ برداشت کرتی۔
 ”انہوں نے کوئی چٹلی نہیں کی، انہیں تو مجھ سے کام تھا جس کے لیے فون کیا مجھے ان کی آواز بھاری محسوس ہوئی تو میں نے پوچھ لیا، وہ بے چاری تو کچھ بتا ہی نہ رہی تھیں میرے بار بار اصرار کرنے پر صرف اتنا بتایا کہ تم نے بدتمیزی کی ہے اور ساتھ ہی سختی سے منع بھی کیا کہ گھر جا کر تم سے ایسی کوئی بات نہ کروں جس سے گھر میں لڑائی ہو۔“
 ”وہ ہر کام کرنے کے بعد اسی طرح جی سادتری بننے کی کوشش کرتی ہیں۔“
 ”یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو جانتی ہو یا سبین آپا ہماری بڑی بہن ہیں جن کے سامنے کبھی ہم بھائیوں نے بھی اونچی آواز میں بات نہیں کی اور ایک تم ہو جو ان سے بدتمیزی کرنے کے بعد بھی پشیمان نہیں ہو اور ابھی بھی مسلسل ان کے بارے میں غلط سلط باتیں کر رہی ہو۔“

”میں نے کون سی غلط بات کی ہے، جو سچ ہے وہ بتا رہی ہوں، ہماری بھی اپنی بھابی سے اونچ نیچ ہو ہی جاتی ہے مگر ہم نے تو کبھی اپنے بھائیوں کے پاس بیٹھ کر ایسی باتیں نہیں کیں جن سے دونوں میاں بیوی کے دلوں میں فرق آئے۔“
 ”جو بھی ہے مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا کہ تمہاری کی ہوئی کسی بات سے آپا کو تکلیف پہنچے انہوں نے تم سے کوئی غلط بات نہیں کی تھی لہذا آئندہ خیال رکھنا ایسا دوبارہ نہ ہو۔“
 فرہاد کے لہجہ میں چھپی دھمکی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

”ویسے بھی ضروری نہیں کہ جو کچھ تمہارے گھر میں ہوتا ہو وہ روایت ہمارے ہاں بھی پروان چڑھ جائے۔ ہمارا تعلق ایسے گھرانے سے ہے جہاں آج بھی اپنے سے بڑوں کی عزت کی جاتی ہے لہذا دوبارہ میرے سامنے اپنے گھر کی مثال نہ دینا۔“

”مجھے ضرورت بھی نہیں ہے دوبارہ ان سے کوئی بات کرنے کی۔“
 ”وہ یہاں آئیں گی تو بات کرو گی مجھے اپنی بہن کا بتا ہے جہاں اس کی عزت نہ ہو۔ وہاں وہ دوبارہ کبھی پلٹ کر نہیں جائیں۔“

”خود جب دل چاہے کسی کی بھی بے عزتی کر دیں عزت صرف ان کی ہے باقی سب تو بے عزت ہیں۔“ اس کی حیرت آواز سے مریم ذرا سا کسمائی۔

”آہستہ بولو پیچھے اٹھ جائیں گے تم سے جب بھی کوئی بات کرو اسی طرح چیخ چیخ کر جواب دیتی ہو۔“
 فرہاد کی آواز حسب دستور خاصی دھیمی تھی۔ زینب کو مکمل طور پر تپانے کے بعد وہ نہایت مطمئن انداز میں ریموٹ ہاتھ میں لیے چیمبل سرچ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ زینب کے نزدیک اب مزید کچھ کہنا سوائے بے وقوفی کے کچھ نہ تھا وہ جگنو کو گود میں لیے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔



”یہ عمیر لغاری یہاں کیوں آیا تھا۔“
 شاہ زین اس کے سر پر کھڑا جواب طلب کر رہا تھا، حبیبہ نے نظریں اٹھا کر حیرت زدہ انداز میں اسے دیکھا، شاہ زین کے ماتھے پر پڑی تیوریاں اس کی ناگواری کو ظاہر کر رہی تھیں۔

”شاید میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ میرا یونیورسٹی فیلو ہے اور ویسے بھی مجھے کسی سے ملنے کے لیے یقیناً آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں یہ بات میں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں۔“

ٹیمبل پر رکھا فولڈر ہاتھ میں لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی ساتھ ہی اس نے چور نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا کہیں کسی نے شاہ زین کو اس طرح بات کرتے ہوئے دیکھ تو نہیں لیا مگر شاید لچ ٹائم کے باعث اس وقت وہاں کوئی موجود نہ تھا اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

”تم نے کہا تھا، مجھے یاد ہے مگر جانے کیوں مجھے اچھا نہیں لگتا جب تم اس طرح کسی سے ہنس کر بات کرتی ہو خاص طور پر عیر لغاری جو مجھے بالکل پسند نہیں۔“

”یہاں ایک لسٹ لگا دیں تاکہ مجھے علم رہے کہ آپ کو کون پسند ہے اور کون ناپسند۔“

وہ اس کے سامنے تن کر کھڑی تھی، غصہ اس کے چہرے پر سرفخی بن کر چھلک رہا تھا۔

”کوئی بھی ایسا مرد جو تم سے ہنس کر بات کرے مجھے ناپسند ہے۔“

اپنے سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آتا اگر میں کسی سے بات کروں یا کوئی مجھ سے ہنس کر بات کرے تو اس میں آپ کو کیا پر اہم ہے۔“

حبیبہ حیرت کے عالم میں تھی وہ سمجھ نہ پائی کہ آج شاہ زین کو کیا ہو گیا ہے آج سے پہلے تو اس نے کبھی اس طرح بات نہ کی تھی شاہ زین کا عجیب و غریب رویہ حبیبہ کے لیے حیران کن تھا۔

”پتا نہیں حبیبہ تم سمجھ کیوں نہیں رہیں کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں یا شاید میں تمہیں سمجھا نہیں پا رہا۔“

اک بے بسی سی اس کے لہجہ میں در آئی۔

”نی الحال تو میرے سامنے سے نہیں مجھے یہ فائل سر کو دے کر آئی ہے۔“

شاہ زین کی نظروں میں ضرور ایسا کچھ تھا۔ حبیبہ تھوڑا سا گھبرا گئی، اب شاہ زین مزید کچھ کہے بنا سامنے سے ہٹ گیا۔ حبیبہ اس کے نہایت قریب سے گزرتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”یہ آج شاہ زین کو کیا ہوا تھا؟“

شاہ زین کا بدلا رویہ اسے سارا دن پریشان کرتا رہا۔ شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے شاہ زین کی اس گفتگو کا ذکر کرن سے بھی نہ کیا، جانے اس کی نظروں میں ایسا کیا تھا کہ اس رات ایک پہلی حبیبہ کی آنکھ نہ لگی۔ وہ جب بھی سونے کی کوشش کرتی شاہ زین اپنے پورے استحقاق کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا۔ ایسے میں سوتے جاگتے صبح ہو گئی رات جاگنے کے باعث اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اس نے صبح اٹھ کر اچھی طرح ناشتا کر کے سر درد کی ٹیبلٹ لی اور جا کر لیٹ گئی آج اس کا ارادہ آفس جانے کا بالکل نہ تھا۔

”میرا شاید دماغ خراب ہو گیا تھا جو ساری رات ایک فضول سی بات کو لے کر ضائع کر دی۔ کیا ضرورت تھی مجھے شاہ زین کی کسی بھی بات کی اتنی ٹینشن لینے کی۔“ اب اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

”ایک نارمل سی بات کو خواہ مخواہ اتنی اہمیت دے کر اپنے سر پر سوار کر لیا اب مجھے سکون کی نیند لینی چاہیے اور یہ بھول جانا چاہیے کہ کل کیا ہوا۔“

اس سوچ کے ساتھ بھی وہ مطمئن ہو گئی۔ قریبی رکھا اپنا سیل فون اٹھایا، آف کر کے بجکے کے نیچے رکھا اور بالکل سیدھی

لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہی اپنے ذہن کو تمام سوچوں سے آزاد کر دیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔



صبحات بھائی کا بیٹا پیدا ہوا تھا جو غالباً پیدائش کے ایک گھنٹہ بعد ہی فوت ہو گیا، سنا تھا ان کی اپنی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہ تھی مگر وہ اتنی دور تھیں کہ عیادت کے لیے جانا کم از کم اس کے لیے ممکن نہ تھا، سوائے اس کے کہ وہ فون پر ان کی خیریت دریافت کرے، مگر فی الحال وہ فون پر بھی بات کرنے کے قابل نہ تھیں۔

یاسمین آپا دو دن قبل ہی واپس اپنے گھر گئی تھیں۔ اب ان کی پوری کوشش تھی کہ کسی بھی طرح صد بھائی انہیں ملٹ بھیجیں اور وہ دینی روانہ ہوں بقول ان کے اس حالت میں صباحت کو کسی اپنے قریبی رشتہ دار کی ضرورت تھی جبکہ صباحت کی امی پہلے ہی وہاں ان کے پاس موجود تھیں۔ وہ دن میں کئی کئی بار فرہاد کو فون کرتیں اس وقت بھی فرہاد ان ہی سے فون پر بڑی تھا، نینب وہیں بیٹھی مریم کو ہوم ورک کروا رہی تھی، جب اچانک ہی بالکل اتفاقی طور پر سنے گئے جنے نے اس کے کان کھڑے کر دیئے۔

”بس اللہ کی مرضی ہے آپا وہ جسے جو چاہے عنایت کر دے خواہش تو ظاہر ہے میری بھی بہت ہے مگر کیا کروں اللہ تعالیٰ سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔“

”ہاں ہاں آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں میں ابھی صد بھائی کو فون کر کے کہتا ہوں کہ آپ کے لیے ملٹ کا جتنی جلدی ہو سکے ارنج کر دیں۔“

وہ صرف ایک طرفہ گفتگو سن رہی تھی جس کے باعث اندازہ لگانا مشکل تھا کہ دوسری طرف کیا کہا گیا۔ ہے مگر فون بند کرتے ہی فرہاد کی بات نے اس پر سب کچھ واضح کر دیا۔

”آپا نے مجھے ایک اچھی لیڈی ڈاکٹر بتائی ہے میرا خیال ہے تم کل تیار رہنا ہم ان کے پاس چلیں گے تاکہ بتا لگے تمہارے اندر کوئی بیماری تو نہیں پیدا ہو گئی اور اگر ایسا ہے تو علاج کر دیا جاسکے۔ ہو سکتا ہے اس دفعہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی بیٹے سے نواز دے۔“

وہ کیا کہنا چاہتا تھا گفتگو کے آخر میں نینب کی سمجھ میں آ گیا مگر اسے یہ سمجھ نہ آیا کہ آخر آپا اسی ایک بات کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔

”فرہاد آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جتنو شروع سے ہی بہت کمزور رہی ہے اس لیے میں چاہتی تھی کہ کم از کم وہ اس قابل ہو جائے کہ اپنے پاؤں پر چل سکے اور یہ بات آپ کو اچھی طرح پتا ہے اور میرا خیال ہے بجائے میری کسی وضاحت کے آپ کو خود آپا کو یہ سب بتا دینا چاہیے تھا۔“

اسے برا تو لگا مگر وہ برداشت کر گئی اور کوشش کی کہ نہ اس کی آواز بلند ہو اور نہ ہی چہرے پر ایسے تاثرات آئیں جن سے اس کی فحشگی کا اندازہ لگایا جاسکے۔

فرہاد نے شاید اس کی کوئی وضاحت سنی ہی نہیں کیونکہ وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے فون پر ایک بار پھر سے مصروف ہو گیا۔ اس دفعہ اس نے دینی کال ملائی تھی اور دوسری طرف اس کا رابطہ بحال ہو گیا تھا۔ نینب اٹھ کھڑی ہوئی اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ صد بھائی سے کیا بات کر رہا ہے وہ جتنو کو اٹھائے اندر آگئی تاکہ اسے نہلا کر اس کے کپڑے تبدیل کر سکے۔



اک ساگر ہے زندگی

189

”تم نے اکیڑی کیوں چھوڑ دی جبکہ تمہارا حساب بہت خراب ہے اور امتحان بھی قریب ہیں۔“ ارم کی بات سن کر وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”وہاں دو تین بار پولیس آئی تھی۔ وہ روما کی تمام دوستوں سے پوچھ گچھ کر رہی ہے اور ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا کہیں غلطی سے بھی میرے منہ سے رضا کا نام نہ نکل جائے بس اسی خوف کے سبب میں نے اکیڑی چھوڑ دی۔“

”تو کیا انہیں وہاں سے رضا کے متعلق کچھ پتا نہیں چلا۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتی مگر جس دن سے روما کا قتل ہوا ہے رضا تو غائب ہے ہی سنا ہے شوکا بھی اپنے گھر نہیں ہے مجھے تو لگتا ہے اس واردات میں رضا اکیلا نہیں تھا ضرور شوکا بھی اس کا شریک جرم رہا ہوگا۔“ وہ نہایت رازداری سے بولی۔

”جو بھی ہے کم از کم ان دنوں اس منحوس سے میری جان چھوٹی ہوئی ہے آج کل کہیں راستے میں سے بھی نہیں ہوتا۔“

”وہ شاید یہاں ہے ہی نہیں پولیس کے خوف سے کہیں چھپا بیٹھا ہے بے غیرت۔“

”بہر حال جو بھی ہے اللہ تعالیٰ روما کے قاتلوں کو ضرور کیفر کردار تک پہنچائے، پتا نہیں کیسے ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس طرح ہنسی کھاتی لڑکیوں سے زندگی چھین لیتے ہیں۔“

ارم کے الفاظ سنتے ہی اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی، اسے لگا کر خدا نا خواستہ روما کی جگہ وہ ہوتی تو اس تصور سے ہی وہ گھبرا اٹھی۔

”اور تم بتاؤ آنتی کی طبیعت کیسی ہے اب۔“ ارم اس کی حالت پر توجہ دینے بنا بولی

”ویسی ہی ہے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔“

”اللہ تعالیٰ انہیں صحت عطا فرمائے۔“ ارم نے خلوص دل سے دعا دی۔

”آمین.....“

اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں، اس کی زندگی میں ماں سے زیادہ کچھ اہم نہ تھا ماں کی اہمیت کا اندازہ ہر گز رتا دن اسے دے رہا تھا۔

○.....❖.....○

وہ کسی کام سے باہر نکلے تو اپنی جگہ ٹھہر گئے، حبیبہ کے قریب کھڑا شاہ زین..... انہیں یہ منظر اچھا لگا، بے شک حبیبہ کے چہرے کے تاثرات کچھ بہتر نہ تھے مگر شاہ زین کے چہرے پر بھی کی نرم سی محبت انہیں اتنی دور سے بھی واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

حبیبہ انہیں شروع دن سے ہی بے حد پسند تھی۔ شاہ زین اور اس کا ساتھ ان کی دلی خواہش تھی مگر وہ کسی سے اس کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ انہیں خطرہ تھا کہیں شاہ زین منع نہ کر دے، وہ حبیبہ کا ساتھ رو نہ کر دے، مگر آج انہیں لگا کہ ایسا نہیں ہوگا شاہ زین کی طرف سے وہ مطمئن ہو کر دروازے سے ہی واپس اپنے کمرے میں پلٹ گئے۔ اب انہیں خدشہ تھا تو صرف حبیبہ کا جس سے اس موضوع پر بات کرنا شدید مشکل تھا۔ بہر حال جو بھی تھا اب اگر شاہ زین اس رشتہ پر تیار ہو جائے تو باقی تمام مسئلے بھی حل ہو جائیں گے۔

یہ سوچ کر دل ہی دل میں مطمئن ہوتے ہوئے انہوں نے کرسی کی پشت سے سر لگاتے ہوئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

○.....❖.....○

”میں شاید یاسمین آپا کے ساتھ دینی چلا جاؤں کچھ دنوں کے لیے، صمد بلا رہا ہے۔“
فرہاد کی طرف سے دی جانے والی یہ اطلاع اتنی غیر متوقع تھی کہ نینب کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔
”کیوں کیا آپ کا نکٹ بھی صمد بھائی بھیج رہے ہیں۔“
پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا، پائی پائی پر جان دینے والا فرہاد جیسا شخص ایک دم ہی اتنا پیسہ کیسے خرچ کر سکتا تھا اسے حیرت ہوئی۔

”نہیں میرا کیوں بھیجے گا یاسمین آپا تو بہن ہیں انہیں وہ اس لیے نکٹ بھیج رہا ہے۔“ نینب کی کم عقلی پر وہ ہلکا سا ہنس دیا۔
”میں اب اتنا بھی غریب نہیں ہوں کہ بھائی سے ملنے جانے کے لیے اس سے پیسہ مانگوں، کرایہ دار کا ایڈوانس جوں کا توں رکھا ہے اسے استعمال میں لے آؤں گا۔“

”اور اتنے دنوں تک دکان کیسے چھوڑیں گے۔“ وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔
”وہ شیردل سنبھال لے گا اب اسے کافی سمجھ آگئی ہے کاروبار کس طرح کرتے ہیں وہ جان چکا ہے۔“
شیردل تو شروع سے ان کی دکان پر ملازم تھا، مگر شاید آج کچھ ایسا خاص ہو گیا تھا کہ وہ ایک دم سمجھدار قرار دے دیا گیا۔
سچ ہے ہر انسان اپنے فیصلے اپنی ضرورت کے حساب سے کرتا ہے کہاں تو فرہاد کا دکان سے چند گھنٹے غائب رہنا لاکھوں کے نقصان کے مترادف، کہاں اب ایک ماہ دکان چھوڑنے پر کوئی پریشانی نہیں واہ میرے مولا۔
وہ صرف سوچ سکی مگر بولی نہیں۔

”مزے کی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے کبھی بنوایا ہی نہیں کیونکہ ضرورت نہیں پڑی اب پہلی فرصت میں وہ بنوا لوں گا۔“

دینی جانے کی خوشی اس کے چہرے سے اٹھ رہی تھی۔ ”صباحت بھابی کی طبیعت کیسی ہے اب۔“
فرہاد اکثر ہی صمد بھائی کو فون کرتا اسی لیے وہ اس سے ہی صباحت بھابی کی طبیعت پوچھ لیا کرتی۔
”اب تو کافی بہتر ہیں صمد بتا رہا تھا گھر شفٹ ہو گئی ہیں۔“
”چلیں شکر ہے۔“

فرہاد کے اس طرح دینی جانے کا سن کر اس کی دل آزاری ضرور ہوئی مگر وہ یہ سب فرہاد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اسی لیے خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اچانک کسی نے باہر کا دروازہ بجایا۔
”نینب دیکھنا ذرا کون آیا ہے۔“

نینب اس کے کہنے سے قبل ہی باہر کی طرف چل دی، اتنی دیر میں اطلاعی گھنٹی بج اٹھی، یقیناً مریم ہوگی اس وقت وہ ساتھ والی خالہ سے سپارہ پڑھ کر آیا کرتی تھی یہ ہی سبب تھا جو اس نے بنا پوچھے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔
باہر مریم نہ تھی بلکہ ایک اجنبی شخص کھڑا تھا، کالی شلوار قمیص میں ملبوس گورا چٹا اونچا لمبا مرد۔ ایک دم نینب کو اپنے سامنے دیکھ کر فوراً دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا نینب اپنی اس لا پرواہی پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوتے ہوئے دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

”السلام علیکم جی، میں آپ کی کرایہ دار کا بھائی ہوں، وہ ہی جو آپ کے گھر کے اوپر رہتی ہیں۔“
”جی بولیں کیا بات ہے؟“ نینب دروازے کے پیچھے سے ہی بولی۔

اک ساگر ہے زندگی

”میری بہن کے داخلی دروازے کی چابی نہیں مل رہی اسے میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جانا ہے اگر مزید دیر ہوئی تو ڈاکٹر کا کلینک بند ہو جائے گا۔“ وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

”تو پلیز آپ ذرا سیڑھیوں کی طرف سے کھننے والے اپنے اندرونی دروازے کا لاک کھول دیں تاکہ وہ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جاسکے، واپس آ کر میں اسے چابی بنوا دیتا ہوں۔“

اس شخص نے ہر بات تفصیل سے بیان کر دی، ننب بنا جواب دیئے کچن میں آگئی جس کی شیف کی دراز میں چابیوں کا ایک گچھا پڑا ہوا تھا، ننب جلدی جلدی ڈھونڈ کر مطلوبہ چابی نکال کر دروازے پر آگئی۔

”یہ چابی لے لیں اوپر والے گھر کی ہی ہے میرے پاس غلطی سے رہ گئی تھی کئی بار سوچا فائزہ کو دے دوں مگر ہر بار بھول جاتی تھی۔“

اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر ننب سے چابی تھام لی۔

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“

ننب نے کوئی جواب نہ دیا دروازہ بند کر کے واپس اندر کمرے میں آگئی جہاں فرہاد الماری کے دونوں پٹ کھولے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

”کون تھا باہر۔“ ننب کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا۔

”فائزہ کا بھائی تھا اس کے داخلی دروازے کی چابی گم ہو گئی ہے، چاہ رہا تھا کہ میں میٹرھیوں کی سائیڈ کا دروازہ کھول دوں۔“

”پھر.....“ فرہاد اپنی تلاش کا کام اچھوڑ کر اس کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”اوپر والے گھر کی ایک ایکسٹرا چابی کچن میں رکھی تھی میں نے اسے وہ دے دی۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“

فرہاد کا سوال خاصا غیر متوقع تھا، وہ نا سمجھی والے انداز میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

”تم نے کنفرم کیا تھا کہ وہ فائزہ کا بھائی ہے؟“

واقعی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا، اب فرہاد نے جو پوچھا تو یک دم گڑبڑا سی گئی۔

”نہیں مجھے کنفرم تو نہیں ہے مگر اس نے کہا تھا کہ آپ اندر سے دروازہ کھول دیں فائزہ نے باہر جانا ہے تو یقیناً اس کا

بھائی ہی ہو گا نا۔“ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”کوئی بھی تم سے آکر کہہ دے گا کہ میں فائزہ کا بھائی ہوں تو دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیتا ہے شک وہ کوئی ڈاکو ہی

کیوں نہ ہو، جانے کیسی کم عقل عورت ہو تم، پتا نہیں کسے گھر کی چابی تھما دی، اب اگر اوپر کوئی واردات ہو گئی تو تم بھگتنا ہیہ قوف عورت.....“

اپنے نرم انداز میں اسے باتیں سنا تا چل پہن کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا، ننب نے دیکھا مریم دروازے کے صین درمیان کھڑی اسے حیرت سے تنک رہی تھی، وہ خاموشی سے اٹھی اور ہاتھ روم کی سمت بڑھ گئی تاکہ اس کی آنکھ سے گرنے والا کوئی آنسو مریم نہ دیکھ سکے۔



”دیکھو شاہ زین کسی سے شادی کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون ہے؟ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ اور تم حبیبہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے سوائے اس کے کہ وہ تمہارے آفس میں جاب کرتی ہے اور ایک اچھی لڑکی ہے؟ تم تو اس کے گھر اور گھر والوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے، صحیح کہہ رہی ہوں نا میں۔“ فون کے دوسرے طرف موجود جاذبہ نے اس سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”جی بالکل درست فرمایا آپ نے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر یہ سچ ہے کہ اس کا تعلق ضرور کسی اچھے خاندان سے ہوگا جس کا اندازہ اسے دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔“ اس نے حبیبہ کی وکالت کی۔

”اگر تم دلی طور پر مطمئن ہو تو پھر حبیبہ سے بات کرو اسے بتاؤ کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور اس سے شادی کرنا چاہتے ہو نیز یہ کہ تمہیں اس کے گھر والوں سے ملنا ہے، بات ختم اور جب وہ تمہارا پر پوزل قبول کر لے تو پھر پاپا سے بات کرو مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں منع نہیں کریں گے۔“

”آپلی آپ جو کہہ رہی ہیں وہ سب ٹھیک ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں یہ سب کچھ حبیبہ سے کہنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا وہ بہت موڈی لڑکی ہے اگر بلاوجہ ناراض ہوگئی تو مجھے امید ہے کہ دوبارہ کبھی مان کر نہ دے گی۔“

یہ ہی وہ سبب تھا جس کے تحت وہ حبیبہ سے بات کرتے ہوئے تھوڑا سا گھبرا جاتا تھا۔

”ویسے مجھے یقین ہے کہ پاپا اس کے بارے میں ضرور جانتے ہوں گے کیوں کہ مجھے نیچر صاحب نے بتایا تھا کہ حبیبہ پاپا کے کسی قریبی دوست کی بیٹی ہے جس کی فیملی کسی دور دراز گاؤں میں رہتی ہے اور وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آئی ہے۔“

یہ سب باتیں وہ تمہیں جو اس نے کافی عرصہ قبل حبیبہ کے بارے میں سنی تھیں۔

”چلو ٹھیک ہے اب تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

جاذبہ نے اس کی پوری بات سننے کے بعد سوال کیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد از جلد پاکستان آئیں اور آکر حبیبہ سے ملیں اسے اوکے کر دیں اور پھر ماما سے میری سفارش کریں۔“

”ان شاء اللہ میں دو ماہ تک پاکستان آرہی ہوں کیونکہ تمہارے بھائی کو چند دن کی چھٹی مل رہی ہے تو میرا ارادہ ہے ہم پاکستان کا ایک چکر لگالیں۔“

”ارے واہ! یہ تو آپ نے بڑی اچھی خبر سنائی۔ بس تو پھر مجھے صرف آپ کی آمد کا انتظار ہے امید ہے اس کے بعد میرے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”تمہارا تو فی الحال ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے حبیبہ۔“ جاذبہ بھی ہنس کر بولی۔

”اور میں ان شاء اللہ اس مسئلہ کو ضرور حل کر دوں گی اب میں فون بند کرتی ہوں تم ماما کو میرا سلام دے دینا۔“

”اللہ حافظ۔“

جاذبہ کے فون بند کرتے ہی وہ حبیبہ کے خوب صورت تصور میں کھو گیا۔



زینب کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب تھی عجیب متلی سی محسوس ہوتی اور کچھ بھی کھانے کو جی نہ کرتا، سارا دن بڈھال پڑی رہتی، غالباً بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔ گھریلو نوٹکوں سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو سوچا شام کو ساویہ کے ساتھ ڈاکٹر کی طرف جائے گی،

ابھی بھی وہ مریم کے سکول سے لے کر گھر واپس آئی تو شدید چکر محسوس ہوئے چنانچہ بنا کچھ پکائے تب سے ایسے ہی پڑی تھی۔
مریم بھاگ کر سادیہ کو بلا لائی۔

”خیریت ہے تم ایسے کیوں پڑی ہو۔“ سادیہ بھی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔
”میں فرہاد بھائی کو بلاتی ہوں آکر تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔“ اسے سیدھا کر کے سادیہ نے ماتھا چھوتے ہوئے کہا۔

”فرہاد کو چھوڑو میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں گلی کے کونے پر جو لیڈی ڈاکٹر ہے اسے ہی دکھا آتی ہوں۔“ فرہاد کا نام سنتے ہی وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”چلو اگر ہمت ہے تو آ جاؤ۔“
سادیہ نے چپل اٹھا کر اس کے نزدیک کی، اس سے قبل کہ وہ اٹھ کر کھڑی ہوتی بیرونی دروازہ کھول کر فرہاد اندر داخل ہوا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ فرہاد حیرت سے بولا۔ وہ چادر اوڑھے باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔
”طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سادیہ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ بمشکل بول پائی۔
”اچھا ایسا کرو جلدی سے کھانا دے دو مجھے کھا کر واپس دکان جانا ہے۔“

زینب کی بات کو قطعی نظر انداز کرتا، اپنا حکم نامہ جاری کر کے وہ واش روم کی جانب بڑھ گیا، سادیہ نے ایک خاموش نظر فرہاد اور دوسری بالکل ساکت کھڑی زینب پر ڈالی اسے پہلی بار اندازہ ہوا کوئی مرد اتنا بے حس بھی ہو سکتا ہے اس کا شوہر جیسا بھی تھا کم از کم اتنا بے حس نہ تھا اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔
”تم لیٹ جاؤ میں کھانا گرم کر کے لے آتی ہوں۔“

زینب کو اپنی جگہ کھڑا چھوڑ کر وہ بھاگ کر کچن کی طرف گئی۔
جلدی جلدی دو روٹیاں بنائیں اور رات کا سالن گرم کر کے ٹرے میں رکھے واپس آ گئی، فرہاد خاموشی سے ٹرے آگے رکھے کھانے میں مصروف ہو گیا یہ بھی نہ پوچھا کہ تمہارے پاس پیسے ہیں یا نہیں۔ سادیہ کے سامنے پیسوں کا تقاضا کرنا زینب کو بالکل اچھا نہ لگا اسی لیے خاموشی سے سادیہ کے ساتھ چلتی ڈاکٹر کے کلینک تک آ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کا اچھی طرح چیک آپ کیا اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے۔

”خیریت ہے ڈاکٹر صاحبہ کیا ہوا ہے اسے۔“ جیسے ہی اس نے ٹیسٹ سلپ تھامی سادیہ بول اٹھی۔
”ہاں بالکل خیریت ہے۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر زینب کے تھکے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی جو کسی بھی احساس سے عاری تھا۔
”میرا خیال ہے یہ پریگنٹ ہیں اسی لیے ٹیسٹ لکھ دیئے ہیں تاکہ تصدیق ہو سکے۔“
ڈاکٹر نے سادیہ کو مخاطب کیا جبکہ ڈاکٹر کی یہ بات سن کر زینب بری طرح چونک اٹھی۔
”اوہ گڈ یہ تو بہت اچھی نیوز ہے۔“

فرہاد کی بیٹے والی خواہش زینب کے ذریعہ سادیہ تک پہنچ چکی تھی۔ اسی لیے اس نے خوشی کا اظہار کیا۔
”نیوز تو اچھی ہے بس ذرا یہ کمزور ہیں خون کی کمی بھی ہے اسی لیے کچھ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں ساتھ ہی دس انجکشن

کا ایک کورس بھی لکھ دیا ہے وہ بھی جلدی لگوا لینا اور ان کے ہر مینڈ سے کہنا ان کا پوری طرح خیال رکھے یہ کافی کمزور ہیں۔“
ڈاکٹر کی تمام ہدایت نہایت خاموشی سے سنتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی فیس دی اور باہر نکل آئی۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ یہ خبر فرہاد کو کس طرح سنائے اور اگر تیسری بار بھی بیٹی ہو گئی تو.....

”کیسی عورت ہو جو بیٹیوں پر ہی قناعت کیے بیٹھی ہو۔“

یاسمین آپا کی آواز اس کے کانوں سے نکرائی اس نے گھبرا کر یہاں وہاں دیکھا۔

”پریشان مت ہو ان شاء اللہ تعالیٰ اس دفعہ تمہارا بیٹا ہی ہوگا۔“ سادی نے اس کا ہاتھ تمام کر دے۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ ٹیسٹ کی پرچیاں تھامے وہ بوجھل قدموں سے سادی کے ساتھ گھر کی سمت چل دی۔



اسے کروٹیں بدلتے کتنا ہی ٹائم گزر گیا، مگر نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور، رات کے اندھیرے میں طاری سناٹا ایک عجیب سا ماحول پیدا کر رہا تھا۔ سردیوں کی کالی اندھیری راتیں اسے ہمیشہ اسی طرح خوف زدہ کرتی تھیں اور پھر وہ ماں کی رضائی میں اس کے ساتھ چپک کر سویا کرتی، مگر اب تو جانے کتنے سال گزر گئے یہ راتیں تنہائی میں کاٹتے ہوئے۔

سیکنہ اس کے کمرے میں ضرور سوتی تھی، مگر وہ ماں نہ تھی اور اب تو آج تین دن سے سیکنہ بھی یہاں نہ تھی وہ گاؤں اپنی بیٹی کے پاس گئی ہوئی تھی۔ اس کے نواسے کی طبیعت بہت خراب تھی جب تک وہ لاہور میں تھی سیکنہ کبھی گاؤں جا کر رات نہ رکی تھی، مگر اب اتنی دور سے اس کا اتنی جلدی واپس آنا ناممکن تھا۔ اب تو جو کچھ تھا اس کے لیے صرف سیکنہ اور چاچا فضل دین ہی تھے جن کے سہارے وہ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

”اور اگر خدا ناخواستہ سیکنہ کو کچھ ہو گیا تو.....“ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ اٹھ بیٹھی۔

”کیا یہ تنہائی ہمیشہ کے لیے میرے مقدر میں لکھ دی گئی ہے۔“

اس نے پاس رکھا موبائل اٹھایا، ٹائم دیکھا ابھی تو صرف دو بجے تھے، یا خدا اتنی لمبی رات کس طرح گزرے گی اور یہ نیند منحوس جانے کہاں غائب ہو گئی ہے جو آکر ہی نہیں دے رہی۔ اپنا غصہ سوائے نیند کے وہ کسی پر نہ اتار سکتی تھی۔
”ملک انکل آپ کو میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ تکیہ سیدھا کر کے دوبارہ لیٹنے سے قبل اس کے دل میں ایک ہلکا سا شکوہ ابھرا۔

مگر اس میں ان کا کیا قصور، انہوں نے تو ہمیشہ میرے اچھے کے لیے ہی سوچا اور جو کچھ کیا میری بہتری کو مد نظر رکھ کر کیا، سارا قصور میرے مقدر کا ہے یہ سب تو میرے نصیب کی خرابی ہے۔“
ملک صاحب کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے اس نے اپنے مقدر کو کوسا۔

”اس سے تو اچھا تھا کہ انکل میرا نکاح نہ کرتے اور مجھے اسی طرح ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتے۔ آنٹی وہاں مجھ سے جیسا بھی سلوک کرتیں ہوتے تو سب میرے اپنے ہی نا۔ ایصال کے ساتھ نکاح نے تو خود مجھے بھی اپنی نظروں میں بھی ذلیل کر دیا۔ اس نے مجھے اس قابل بھی نہ جانا کہ کبھی اتنے سالوں میں ایک دفعہ مجھ سے فون پر ہی بات کر لیتا۔ منکوحہ نہ سہی ایک کزن ہی سمجھ کر، مگر شاید میری حیثیت اس کے نزدیک ایک پتھر سے زیادہ نہ تھی جسے ٹھوکر مار کر اپنے راستے سے ہٹانا اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا اور اس نے مجھے راستے کے پتھر ہی کی طرح اپنی زندگی سے دور پھینک دیا۔“
یہ سب سوچتے اس کا دل بھر آیا۔ چہرہ گیلا ہو گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔

اک ساگر ہے زندگی

195

”میرے پروردگار شاید میں بہت گناہ گار رہی، مگر تیری ایک ادنیٰ بندی ہوں۔ میرے مولا زندگی میں ایک بار ایصال کو میرے سامنے ضرور لانا، مگر اس حال میں کہ اس کے دل میں مجھے کھونے کا دکھ اور بچھتاؤ ضرور ہو اور اس لمحہ مجھے اس کے سامنے مضبوط رکھنا، مجھے کمزور نہ پڑنے دینا۔ شاید زندگی میں، میں نے تجھ سے کچھ نہیں مانگا سوائے اس چھوٹی سی خواہش کے، میرے مالک میری یہ خواہش ضرور پوری کرنا۔“

اپنی دعا کے اختتام پر دل میں ہی ”آمین“ پڑھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور اپنے دماغ کو بالکل خالی چھوڑ دیا اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔



وہ تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی جب باہر کا دروازہ کھول کر فاطمہ خالہ اندر داخل ہوئیں۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

وہ آج کئی دنوں بعد ایک بار پھر اسے پُر جوشی دکھائی دیں شاید ان کے پاس آج پھر کوئی نئی خبر تھی۔

”کچن میں آجائیں خالہ روٹی بنا رہی ہوں۔“

اس کے جواب دینے سے قبل ہی ماں کچن سے پکاری۔

”آفتاب کراچی سے واپس آگیا ہے ٹو جلدی سے فارغ ہو کر کمرے میں آتے تھے ضروری بات بتاتی ہے۔“

خالہ ہدایت دیتیں اندر چلی گئیں، اس نے جلدی جلدی باقی کپڑے بھی تار پر پھیلائے اور بالائی ہاتھ روم میں رکھی، ہاتھ منہ دھو کر اندر کمرے میں ہی آگئی خالہ۔ ماں کے پاس ہی چار پائی پرنٹھی تھیں ماں کی گود میں رکھے نیلے نیلے نوٹ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

”دیکھو بیٹا یہ رقم انہوں نے خود تیرے لیے بھیجی ہے۔“

”مگر خالہ مجھے اب ان روپوں کی ضرورت نہیں رہی، ماضی بن گئی ایسی خواہشیں جو کبھی ہوا کرتی تھیں، اب تو صرف زندگی کے چند بچے کچھ دن ہیں جو اس آس پر گزار رہی ہوں کہ میری بیٹی اپنوں تک پہنچ جائے۔“

آخری جملہ ماں نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ادا کیا۔

”ان شاء اللہ پہنچ جائے گی، آفتاب کی بات ہوئی ہے وہ خود تو پاکستان میں نہیں تھا، مگر دفتر والوں نے فون پر بات کروا دی تھی۔ آفتاب نے صرف تیری بیماری کا بتایا، سن کر بہت دکھی ہوا وعدہ کیا پاکستان آتے ہی تجھ سے ملنے آئے گا۔ دفتر والوں نے اس کی ہدایت کے مطابق یہ رقم آفتاب کو دے دی وہ خود ہوتا تو شاید آفتاب بھی نہ لیتا، مگر بیٹا تجھے اپنے علاج کے لیے تو ان پیسوں کی ضرورت تھی نا تو میری ماں رکھ لے، ان سے اپنا علاج کروا۔“

خالہ نے ماں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے سمجھایا۔ ماں کی آنکھوں سے بہنے آنسوؤں نے اسے بے چین کر دیا وہ ان کے قدموں کے قریب جا بیٹھی۔

”پیسہ بہت بری چیز ہے خالہ، ہر رشتہ چھین لیتا ہے پتا نہیں میں غلط تھی یا اس کا باپ، مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں کو ہی پیسے سے محبت تھی۔“

”نہیں بیٹا، تو شاید اپنی ضرورت کے ہاتھوں مجبور تھی تصور تو اس کا تھا جس نے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تجھے کبھی تیرا حق نہ دیا وہ بھی ذمہ دار ہے تیری اس تباہی و بربادی کا۔ میں تو تجھے بہت اچھے سے جانتی ہوں تو، تو بڑی صابر سی بچی تھی اس

نے تیری قدر ہی نہ کی اور جب اپنا مرد ہی قدر نہ کرے تو نا سمجھ عورت شاید بہک ہی جاتی ہے۔ اسی لیے تو ہمارے مذہب نے مرد پر بڑی بھاری ذمہ داری عائد کی ہے۔ اس رقم کو بہترین قرار دیا ہے جو اپنے اہل و عیال پر خرچ کی جائے، مگر افسوس نا سمجھ لوگ نہیں سمجھ پاتے اور اپنے ہاتھوں سے ہی سب کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں بس میری تو صرف اتنی ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت کرے اور تیرے لیے بھی زندگی کو آسان بنائے۔“

خالہ نے روتی ماں کو ساتھ لگاتے ہوئے خلوص دل سے دعا دی۔

”بیٹا یہ فون نمبر بھی رکھ لے تیرا تو کوئی نمبر تھا نہیں جو آفتاب دیتا، اپنے گھر کا دے آیا ہے اور اس نے اپنا موبائل نمبر دیا ہے جو پاکستان آکر وہ استعمال کرتا ہے شاید دس، پندرہ دنوں تک واپس آجائے۔“ خالہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”یہ رقم سنبھال لے تیرے کام آئے گی۔“ ماں کو ہدایت کرتی وہ باہر نکل گئیں۔

”اماں.....“

خالہ کے باہر نکلتے ہی وہ ماں کے قریب ہوئی۔

”یہ اتنے روپے کس نے بھیجے ہیں؟“

ماں خاموشی سے اپنی گود میں دھرے ہاتھوں کو پکیتی گئی۔

”بتاؤ تاہاں کون ہے وہ، جس کے انتظار میں تم جی رہی ہو؟ وہ میرا باپ نہیں ہے یہ تو میں جانتی ہوں کیونکہ ابا تو شاید اس دنیا میں نہیں ہے اس لیے خالہ نے اس کے لیے مغفرت کی دعا کی تو پھر وہ کون ہے ماں جس نے بنا کچھ کہے تمہارے لیے اتنی رقم بھیج دی کون دیتا ہے کسی کو اتنا پیسہ۔“

ماں آج مجھ سب کچھ بتا دو۔ میں کون ہوں؟ اور ہم یہاں تنہا سب سے کٹ کر کیوں زندگی گزار رہے ہیں؟ ایسا کیا کیا تھا تم نے ماں جو سب نے تمہیں چھوڑ دیا۔ پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ تم جی رہی ہو یا مر گئیں بتاؤ تاہاں۔“

روتے روتے اس نے ماں کو جھنجھوڑ دیا۔

”میرے ٹریک سے وہ چھوٹا باکس نکال کر لاؤ۔“

اماں کی مدد آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”میں آج تمہیں سب کچھ بتا دوں گی وہ سب کچھ جو اندر ہی اندر مجھے گھن کی طرح کھا گیا، میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں کون ہوں؟ اور وہ کون سے حالات تھے جو مجھے یہاں لے کر آئے تمہیں سب کچھ بتاؤں گی تم وہ باکس نکال لاؤ۔“

وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اگلے ہی سیکنڈ ٹریک سے باکس نکال کر ماں کے پاس آ بیٹھی جو آنکھیں موندے بالکل خاموشی سے چپ لیٹی تھیں۔ وہ منتظر تھی کہ ماں کب اپنی بات شروع کرے، مگر وہ تو شاید بھول گئی تھیں کہ اسے کچھ بتانا ہے وہ بنا کچھ کہے وہیں ماں کے پاس بیٹھی رہی۔ کیوں کہ آج وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی چاہے ماں کے جاگنے کے انتظار میں اسے رات وہیں بیٹھنا پڑتا۔



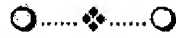
وہ چپ لیٹا چھت کو گھورے جارہا تھا، جسمانی طور پر وہ اپنے کمرے میں تھا، مگر اس کا ذہن کئی سال قبل مغل پورہ کی ان گلیوں میں بھٹک رہا تھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ گلیوں میں کرکٹ کھیلتے بچوں کا شور جن کا بیٹ لکڑی کا ایک ڈنڈا ہوا کرتا تھا، پرچوں کی دکان میں چلنے والا شیپ ریکارڈ جو ہمارے سارا دن بچے جاتا۔

گلی کے کونے پر لگا بڑا سا آم کا درخت جس کے سائے تلے وہ اور اس کے دوست ساری دوپہر گلی ڈنڈا اکیلے اور ذرا نہ تھکتے، ایسے میں سکول سے گھر واپس آتی استانی جی کی بیٹی، جو ایک قریبی سرکاری سکول کی طالبہ تھی، یونیفارم کی نیلی قمیص اور سفید دوپٹے میں ملبوس وہ آج تک وجاہت کے ذہن میں نقش تھی۔ جانے اس میں ایسا کیا تھا جو اس کے بعد اسے کبھی کوئی لڑکی نہ بھائی یہاں تک کہ وہ خود کو کبھی شادی کے لیے بھی دلی طور پر آمادہ نہ کر سکا حالانکہ ان دونوں کے درمیان کچھ بھی نہ تھا یہاں تک کہ وہ تو شاید وجاہت کو جانتی بھی نہیں تھی۔

ایسی انجان لڑکی سے وجاہت کو کب اور کس طرح محبت ہوئی پتا ہی نہ چلا اور جب پتا چلا تب تک وہ اس کی زندگی سے کہیں دور جا چکی تھی، وہ اس کے تصور کو بڑی مشکل سے اپنے ذہن سے نکال پایا تھا، مگر آج بھی جہاں کہیں وہ کسی خوب صورت عورت کو دیکھتا، ایک بار پھر ماضی میں اسی طرح کھو جایا کرتا۔ اسے ہر خوب صورت عورت میں وہ ہی دکھائی دیتی جب کہ وہ اس کی شکل بھی تقریباً بھول چکا تھا۔ جانتا تھا اتنے سالوں میں وہ کافی تبدیل بھی ہو چکی ہوگی۔

مگر پھر بھی وجاہت کو یقین تھا کہ اگر وہ اسے کہیں نظر آئی تو وہ ضرور پہچان جائے گا۔ اس پہچان کا اب کوئی فائدہ نہ ہونے کے باوجود وہ اسی کوشش میں خاموشی سے مصروف تھا جس میں پتا نہیں وہ کبھی کامیاب بھی ہو پاتا یا نہیں، وہ یہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جانا چاہتا تھا۔

وہ تو صرف غیر ارادی اور لاشعوری طور پر اسے یاد رکھے ہوئے تھا، اس یک طرفہ محبت کی آگ نے ہمیشہ ہی وجاہت کو جلائے رکھا۔ مگر اسے محبت کی اس آگ میں سلگنا اچھا لگتا تھا۔ وہ جو اس کی زندگی میں کبھی تھی ہی نہیں، جو ماضی کی ایک حسین یاد سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس سب کے باوجود آج بھی وجاہت کے دل میں زندہ تھی اور دلوں میں بسنے والے لوگ آسانی سے بھلائے نہیں جاتے۔



”یہ لو.....“

کمرے میں داخل ہوتے ہی فرہاد نے ہاتھ میں پکڑا الفافہ اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”آپا نے فون پر ایک حکیم کا ایڈریس دیا تھا جس کی دوا کھانے سے اللہ تعالیٰ نے بہت سے لوگوں کو بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ سوچا میں بھی لے لوں شاید اسی بہانے اللہ تعالیٰ ہم پر بھی مہربان ہو جائے۔ ایک لمبی لائن میں لگ کر یہ دوا لی ہے پورے یقین اور عقیدے کے ساتھ کھانا، آپا کا کہنا ہے کہ.....“

”آپ کو کنفرم ہے یہ دوا کھانے سے یقینی طور پر بیٹا ہوگا۔“

اس نے فرہاد کی بات کا منہ ہوئے تیزی سے سوال کیا۔

”ظاہر ہے یقین تھا تو اپنا ٹائم اور پیسہ برباد کر کے آیا ہوں۔“

شاید اسے لہجہ کا سوال پسند نہیں آیا تھا جس کا اندازہ اس کے ماتھے پر ابھرنے والی تیوریوں سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”اور اگر نہ ہوا تو.....“

اس نے فرہاد کے ماتھے پر ابھرنے والی تیوریوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے ایک اور سوال کیا۔

”کبھی زندگی میں اچھی بات نہیں کرنا ہمیشہ ایسی بات کرنے کی کوشش کرنا جو دوسروں کو آگ لگا دے۔“
 فرہاد تپ گیا، نرنب جانتی تھی کہ آپا کا فرمان پتھر پر لکیر کی مانند ہے اگر انہوں نے یہ کہہ دیا تو اسے یہ دوا ہر حال میں
 کھانی ہوگی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر الماری کی دراز میں ڈال دیا۔
 ”اب یہ یہاں ہی نہ پڑا رہ جائے پورے ڈھائی سو روپے کی دوا ہے۔“
 باہر نکلتے نکلتے فرہاد کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، مگر اس نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور خاموشی سے باہر نکل
 آئی۔



”نازیہ کا بیٹا.....“
 نرنب کو لگا شاید اس نے غلط سنا ہے۔
 ”ہاں اب تو ماشاء اللہ ایک ماہ کا ہو گیا۔“
 صباحت بھابی کے چہرے پر نظر آنے والی خوشی ان کے سچ کی غماز تھی جبکہ نرنب کے چہرے پر چھائی حیرت کسی طور کم
 نہ ہوئی۔
 ”مگر بھابی اسے تو شاید ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“ اسے کسی طور پر یقین نہیں آرہا تھا۔
 ”ہاں، مگر اللہ سے بڑی کوئی طاقت ہے۔ وہ جسے جب چاہے اپنی رحمت سے نواز دے، سچ تو یہ ہے نرنب کہ اس سے
 بڑا کوئی ڈاکٹر نہیں۔ ویسے اس نے وہاں لندن میں کسی اچھی گائناکولوجسٹ سے اپنا علاج بھی کروایا تھا اور میں تو سمجھی کہ تمہیں
 علم ہوگا، شاید اس نے کوئی فون وغیرہ کیا ہو، مگر سچ تو یہ ہے کہ بیماری کی حالت میں ڈیوری کا ہونا اور پھر اتنے سال بعد بچے کی
 ذمہ داری سنبھالنا کافی مشکل امر ہے اس لیے شاید اسے ٹائم ہی نہیں ملا ہوگا۔ اب تو خیر سے وہ میرے پاس دینی شفٹ ہوگئی
 ہے۔ سالار نے تمہارے بھائی کے ساتھ پارٹنرشپ شروع کر دی ہے۔“
 اسے ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی سوائے اس کے کہ نازیہ ماں بن گئی، ساتھ ہی اسے دل ہی دل میں افسوس
 بھی ہوا کہ سالار اور نازیہ میں سے کسی نے بھی اسے اس قابل نہ سمجھا کہ اس سے اپنی خوشی شیر کرتے۔
 ”اگر تمہیں نازیہ سے بات کرنی ہو تو میں کروادیتی ہوں۔“
 صباحت نے ہینڈ بیگ سے اپنا موبائل نکالتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔
 ”نہیں بھابی اس وقت تو نہیں، میں کھانا بنانے جا رہی ہوں فارغ ہوں گی تو پھر ضرور کروں گی۔“
 اس نے کہہ تو دیا، مگر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا، اسے تو رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد اتنے
 عرصے میں ایک بار بھی سالار یا نازیہ نے اس سے رابطہ نہ کیا جبکہ ایک بار اس نے بڑی کوشش کر کے نازیہ کو فون بھی کیا تھا
 تاکہ اس کی طبیعت پوچھ سکے اس دن صرف تین منٹ کی کال میں اس کی بڑی مختصر سی بات ہوئی تھی۔
 اپنی حیثیت سے بڑھ کر پیسہ خرچ کرنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ نازیہ وہ پہلے والی نازیہ نہیں رہی تھی یا شاید اپنی
 طبیعت کی خرابی کے باعث اس کا رویہ کچھ سرد سا تھا، مگر جو بھی تھا نرنب کو اس دن نازیہ سے بات کر کے کچھ اچھا نہیں لگا تھا یہ
 ہی وجہ تھی کہ جو اس نے آج صباحت بھابی کو ٹال دیا۔



فون کب سے بج رہا تھا، بڑی مشکل سے اس نے اپنی سوندھی ہوئی آنکھیں کھولتے ہوئے سکرین پر ایک نظر ڈالی جہاں ”شاہ زین کالنگ“ جگمگا رہا تھا۔

یس کا بٹن دہاتے اس نے سامنے لگی ہوئی گھڑی پر ایک نظر ڈالی، جو شام کے پانچ بج رہی تھی۔

”کب سے فون کر رہا ہوں کہاں تھیں تم.....“

دوسری طرف شاہ زین کے لہجہ میں چھلکتی بے چینی صاف محسوس کی جاسکتی تھی جو حیبہ کے لیے باعث حیرت تھی۔
”میں سو رہی تھی خیریت؟“

اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔

”سوری یار میں تمہیں ڈسٹرب کیا۔“

شاید حیبہ کے سر دلچہ نے اسے شرمندہ کر دیا تھا۔

”اٹس اوکے، ویسے بھی پانچ بج گئے میں اٹھنے ہی والی تھی۔“

حیبہ نے اپنے لہجہ کو حتی الامکان..... خوشگوار بنانے کی کوشش کی جبکہ اپنی نیند اس طرح خراب ہونے پر اس کا موڈ خاصا آف ہوا تھا۔ کیوں کہ نیند کے معاملے میں وہ خاصی کانشس تھی۔

”تم آج رات کہیں بڑی تو نہیں۔“

آج سڑے تھا اس کی یونیورسٹی بھی آف تھی اور یہ بات شاہ زین اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ عموماً اتوار کا دن ہاسٹل میں رہ کر ہی گزارا کرتی تھی۔

”میں.....“

اس نے ایک ہل سوچا۔

”میری ایک یونیورسٹی فیلو کی برتھ ڈے ہے وہاں انوائٹ ہوں ویسے تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”اصل میں آج ہمارے گھر ایک فیملی ڈنر ہے تو ممانے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں بھی انوائٹ کر لوں اسی لیے فون کیا تھا بہر حال اگر تم بڑی ہو تو کوئی مسئلہ نہیں پھر کبھی سہی۔“

حیبہ کے جواب نے شاہ زین کو مایوس کر دیا۔

”سوری شاہ زین اگر میرا پہلے سے پروگرام نہ ہوتا تو میں ضرور آتی۔“ اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں اصل میں آپا آئی ہوئی تھیں میں چاہ رہا تھا تم ان سے بھی مل لیتیں۔“

شاید وہ چاہ رہا تھا کہ حیبہ اپنا پہلا پروگرام کنسل کر دے۔

”پھر کبھی مل لوں گی۔ اللہ حافظ میں فون بند کر رہی ہوں کیوں کہ مجھے تیار ہونا ہے۔“

شاہ زین کا جواب سنے بنا ہی اس نے فون بند کر دیا۔

”شکر ہے میں نے بروقت جھوٹ بول دیا۔“

شاہ زین کے سوال کرنے کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانا چاہتا ہے جبکہ آج اس کا موڈ کہیں بھی جانے کا نہیں تھا۔ خاص طور پر شاہ زین کے گھر تو وہ فی الحال بالکل بھی جانا نہیں چاہتی تھی کیوں کہ اسے پسند نہیں تھا بلاوجہ کسی کے گھر اس طرح منہ اٹھا کر چلے جانا۔

اک ساگر ہے زندگی

جب تک شاہ زین کی ماما سے خود انوائٹ نہ کرتیں، اگر یہ بات وہ شاہ زین سے کہتی تو شاید اسے اچھا نہیں لگتا اسی لیے حبیب کا بولا گیا بے ضرر سا جھوٹ اسے بلاوجہ کی ٹینشن سے آزاد رکھنے کا سبب بن گیا جس پر اس نے اللہ تعالیٰ کا ایک بار پھر سے شکر ادا کیا۔

جانے کیوں اسے ہمیشہ سے ہی چڑ رہی کسی کے سامنے جا کر بلاوجہ کی فارمیٹرز بھانا، اسے کبھی پسند نہ آیا، نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کی ہر بات پر مسکرا مسکرا اس کی تائید کرنا اس کے لیے خاصا نا پسندیدہ عمل تھا جس سے وہ ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتی، یہ ہی وجہ تھی جو اس نے شاہ زین کی بات سمجھنے ہی فوراً جھوٹ کا سہارا لیا اور ان تمام باتوں سے بچ گئی جو اسے نا پسند تھیں۔



صباحت بھابی صرف پندرہ دن پاکستان رہ کر واپسی چلی گئیں۔ انہوں نے کراچی کے کسی پوش ایریا میں ایک پلاٹ خریدا تھا اب اس پر کنسٹرکشن کا کام شروع تھا۔ وہاں اپنی مرضی اور پسند سے گھر تعمیر کروا رہی تھیں جس کے لیے انہوں نے پاکستان کا یہ مختصر سا چکر لگایا۔ ایک ہفتہ وہ کراچی کے کسی ہوٹل میں ٹھہریں اپنی پسند کی کسی کمپنی کو گھر کا ٹھیکہ دیا ہر چیز خود پسند کی۔

ان کے ساتھ تو صمد بھائی بھی تھے مگر سب کرتا دھرتا صباحت بھابی تھیں اور یہ عمل کسی اور کے لیے نہ سہی مگر زینب کے لیے خاصا حیران کن تھا۔ دونوں بھائیوں میں کتنا فرق تھا وہ جیسے جیسے سوچتی حیران ہوتی کہاں فرہاد اور کہاں صمد بھائی۔ فرہاد نے تو ساری زندگی اس سے کسی بھی بات میں مشورہ لینا ضروری نہیں سمجھا، جبکہ صمد بھائی اپنا کوئی کام بھابی کی مرضی کے بغیر کرنے کا تصور بھی شاید نہ کرتے تھے۔ اس میں یقیناً سارا عمل دخل قسمت کا تھا ایک ہی گھر میں بیاہی جانے والی دو عورتوں کی الگ الگ قسمت جس کے آگے کسی کا کوئی زور نہیں۔



پاؤں کے نیچے گرم تپتی ریت اور اوپر کھلا آسمان، اس نے چاروں طرف نظر ڈالی کوئی بھی نہ تھا اس ویران ریگستان میں وہ تنہا کھڑی تھی۔ یہ احساس ہوتے ہی وہ گھبرا اٹھی، مارے خوف کے اس کے حلق میں کانٹے سے اُگ آئے، وہ بھاگنا چاہتی تھی مگر قدم تھے کہ من من بھاری ہو گئے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا عالم اور رات کا اندھیرا، یک دم اس کے حلق سے حیرت جیج نکلی۔

”کیا ہوا بیٹا کیوں اس طرح جیج رہی ہو۔“

کانوں میں پڑنے والی یہ آواز یقیناً آنٹی سیکندہ کی تھی اس نے فوراً سے پیشتر آنکھیں کھول دیں، وہ اپنے بستر پر تھی، شاید لائٹ چلی گئی تھی، کمرے میں پھیلے جس سے اس کی سانس بند ہو رہی تھی۔

”کچھ نہیں آنٹی عجیب ڈراؤنا سا خواب دیکھ لیا تھا بس اسی لیے ڈر گئی۔“

دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس نے سیکندہ کو جواب دیا۔

”فجر کی اذان ہونے والی ہے اٹھ کر وضو کر لو، نماز پڑھ کر قرآن کی تلاوت کرو، بہت دن ہو گئے تم نے اپنی ماں کو کوئی تحفہ نہیں بھیجا۔ پڑھو اور پڑھ کر اسے بخشو، اس کی مغفرت کی دعا کرنے والا اس دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔“

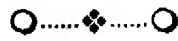
اک ساگر ہے زندگی

آنٹی سیکنہ کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، آنٹی نے کمرے میں رکھی ایمر جنسی لائٹ اٹھا کر ہاتھ روم میں رکھ دی تاکہ وہ اطمینان سے وضو کر سکے۔

”شکر یہ آنٹی آپ میرا بہت خیال رکھتی ہیں سچ تو یہ ہے کہ ماں کی جگہ بے شک کوئی نہیں لے سکتا مگر اس کی کمی کو ضرور پورا کیا جاسکتا ہے اور یہ کہ آپ نے ہمیشہ پوری کی آپ میرے لیے اپنوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔“

بے اختیار ہی اس نے آنٹی سیکنہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
”کوئی ماں اپنی اولاد پر احسان نہیں کرتی، اس لیے میرا تم پر کوئی احسان نہیں ہے۔“ سیکنہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”جاؤ وضو کرو اور پھر باہر لاؤنج میں آ جاؤ وہیں نماز پڑھیں گے۔“ خاموشی سے سر ہلاتی وہ ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔



”تم فرہاد کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں تاکہ وہ تمہارا اچھی طرح چیک آپ کر کے تمہیں کوئی دوا دے، ہو سکتا ہے اس سے تمہیں متلی ہونا بند ہو جائے۔“

سادہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”فرہاد کے ساتھ۔“ زینب نے آہستہ سے دوہرایا۔

”اس کے پاس کہاں ٹائم ہوتا ہے رات گیارہ بجے تو وہ دکان بند کر کے گھر آتا ہے۔“

”ہاں تو کیا ہوا اس کی دکان پر اور ملازمین بھی تو ہیں ان میں سے کسی کو بھی بٹھا کر تمہیں لے کر جائے، بیٹا پیدا کرنے کا بہت شوق ہے مگر بیوی کا ذرا خیال نہیں۔“

سادہ اتنی ہی منہ پھٹ تھی، زینب سمجھتی تھی کہ اتنا پیسہ خود کمانے کی بدولت اس میں یہ خود اعتمادی آئی ہے دوسروں لفظوں میں شاید جاب نے یہ اعتماد بخشا تھا۔

”بہر حال مجھے کوئی حرج نہیں ہے میں تمہیں خود ڈاکٹر عطیہ کریم کے پاس لے جاؤں گی۔ اچھی ڈاکٹر ہے تمہارا معائنہ کر کے تمہیں طاقت کی دوائیں دے گی کیونکہ میرے خیال میں تمہیں کافی کمزوری بھی ہو رہی ہے۔“

سادہ نے اس کے زرد چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

”فیس کتنی ہے اس کی؟“

سادہ کی تمام باتوں کے جواب میں وہ صرف اتنا ہی بولی۔

”پتا نہیں مجھے تو خود چار سال ہو گئے اس کے پاس گئے ہوئے، تم فرہاد بھائی سے کہو کہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس جانا ہے

پیسے دیں، بیٹے کے لیے حکیم سے ڈھائی سو کی دوا تو خرید لایا اور یہ بھی پتا ہے کہ دوسرا مہینہ شروع ہوتے ہی کھانے لگو، مگر بیٹا پیدا کرنے والی ماں کے لیے کیا کرنا ہے اس بارے میں کوئی علم نہیں، مجھے تو حیرت ہے تمہاری دو بیٹیاں کیسے ہو گئیں۔“

”مریم تو میری امی کے گھر ہوئی تھی وہ میری حالت دیکھ کر مجھے شروع میں ہی اپنے ساتھ لے گئی تھیں کیونکہ مجھے الٹیاں بہت تھیں، جگنو کی دفعہ بھی ساری ذمہ داری انہوں نے ہی اٹھائی تھی۔“

سادہ کی طرف دیکھتے ہوئے زینب ہلکا ہنس دی۔ ”یہ پہلی ذمہ داری ہے جو فرہاد پر پڑی ہے اب دیکھو کیسے نبھاتا ہے۔“

اک ساگر ہے زندگی

”بس تو پھر فرہاد بھائی کو بگاڑنے میں تمہارا خود اپنا ہاتھ ہے۔ جب ساری زندگی ایک مرد پر کوئی ذمہ داری نہ ڈالو گے تو وہ ایسا ہی ہوگا اس میں فرہاد بھائی کا کوئی بھی قصور نہیں ہے۔“

سادیہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”وہ تو اب بھی سوچ رہے ہوں گے کہ شاید تمہیں پھر تمہاری امی ہی لے جائیں گی۔“ سادیہ کی بات کافی حد تک درست تھی۔

”نہیں اس دفعہ جو کچھ بھی ہوگا میرے اپنے گھر پر ہی ہوگا، اب ماں کا گھر بھائی والا ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اس حوالے سے وہ کوئی بات کریں۔“

نہیب کی سوچ کافی حد تک درست تھی۔

”چلو پھر تم شام میں ریڈی ہو جانا، ہم رکشہ میں چلیں گے ڈاکٹر عطیہ کے کلینک اور ہمارے گھر سے تو بس شاپ بھی خاصا دور ہے، اس لیے رکشہ ہی بہتر رہے گا۔“ سادیہ نے اسے پوری تفصیلی سمجھائی۔

”ٹھیک ہے تم آ جانا میں تیار ہو جاؤں گی۔“

وہ اپنی چادر سنہال کر اٹھ کھڑی ہوئی، سادیہ اسے رخصت کرنے باہر دروازے تک آئی۔ وہ ہمیشہ سے ہی نہیب کی اسی طرح چاہت کیا کرتی تھی۔



”تمہیں شاہ زین کے ساتھ اس طرح جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔“ حبیبہ کی بات ختم ہوتے ہی کرن بول اٹھی۔

”اگر وہ تمہیں اپنے گھر والوں سے ملانا چاہتا تھا تو تمہیں جانا چاہیے تھا آخر اس میں حرج ہی کیا تھا۔“

”ضروری تو نہیں ہے جو وہ چاہتا سو میں بھی ویسا ہی چاہوں!“

چیتو گم کھول کر منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے کرن پر ایک نظر ڈالی۔

”ابھی شاید شروع میں ہی میں نے تمہیں وضاحت دے دی تھی کہ مجھے بلاوجہ لوگوں پر جا کر مسلط ہونا بالکل پسند نہیں۔“

اب سوچو ذرا ایک فیملی ڈنر جہاں آپ کے سارے اپنے موجود ہوں، آپ ایسے موضوع پر بات کر کے ہنس رہے ہو جو آپ سب کا مشترک ہے، وہاں اچانک ایک اجنبی لڑکی آجائے جسے سوائے نام کے کوئی دوسرا نہ جانتا ہو تو یقیناً آپ ہنستے ہنستے رک جائیں گے، آپ کا موضوع گفتگو تبدیل ہو جائے گا۔ آپ سب ریز رو ہو جائیں گے صحیح یا غلط؟“

بات کرتے کرتے ایک دم ہی حبیبہ نے کرن سے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”جو تم کہہ رہی ہو وہ بالکل ٹھیک ہے حبیبہ، مگر اجنبیت دور کرنے کے لیے کوئی ایک پہلا قدم تو اٹھانا پڑتا ہے۔“

”مجھے اتنا عرصہ ہو گیا اس آفس میں آج تک شاہ زین کی ماسے میری سلام سے زیادہ گفتگو نہیں ہوئی تو پھر سوچو بھلا

میں کیسے ان کے گھر ڈنر کرنے چلی جاتی مجھے تو عجیب بد دماغ سی خاتون لگتی ہیں۔“

ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اس نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

”حیرت ہے یہ تم کہہ رہی ہو۔“ اس کے انداز گفتگو نے کرن کو واقعی حیران کر دیا۔

”یاد ہے تم نے کافی عرصہ قبل مجھ سے کہا تھا کہ ضروری نہیں جو سامنے سے جیسا نظر آئے ویسا ہی ہو اور اپنی اس رائے کا

اظہار تم نے میڈم کے لیے بھی کیا تھا۔“

”کیا ہوگا اس وقت جب میں یہاں نئی نئی آئی تھی اور انہیں جانتی نہ تھی۔“
اس نے کرن کی بات کو جھٹلایا نہیں۔ ”مگر ان کے بارے میں میرا خیال کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے میرے خیال میں وہ خاصی تک چڑھی اور بد دماغ سی خاتون ہیں۔“
”السلام علیکم سر۔“

کرن کے اس طرح بوکھلا کر سلام کرنے پر اس نے پلٹ کر دیکھا، دروازے کے عین درمیان شاہ زین کھڑا تھا وہ کب آیا دونوں کو اپنی گفتگو میں پتا ہی نہیں چلا، اب جو دیکھا تو عجیب شرمندہ سی ہو گئی۔
”شاید اس نے ہماری گفتگو سن لی ہے۔“

شاہ زین کے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہی اس نے اندازہ لگایا جس کی تصدیق اگلے ہی پل ہو گئی۔
”ایک مشورہ دوں آپ کو حبیب۔“

وہ آہستہ آہستہ چلتا حبیب کے سامنے آن کھڑا ہوا، سینے پر دونوں بازو باندھے، لب بھینچے وہ سیدھا حبیب کی آنکھوں میں ہی جھانک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کیا جواب دے، جبکہ کرن اپنے سامنے رکھی فائل اٹھا کر فوراً ہی کمرے سے باہر کھسک گئی، اب وہاں وہ بالکل تنہا تھی۔

”کسی کے بارے میں کوئی رائے اس وقت تک قائم مت کیا کریں جب تک آپ اسے اچھی طرح جان نہ لیں، کیونکہ کئی بار آپ کا لگایا ہوا اندازہ خود آپ کو بعد میں شرمندہ کر دیتا ہے۔“

یہ تو شاید اس کے اپنے الفاظ تھے جو وہ اکثر دوسروں سے کیا کرتی تھی

”سوری شاہ زین اگر میری کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہو۔“

”سوری کی کوئی بات نہیں ہے آپ ایک جمہوری ملک کی شہری ہونے کے ناطے اظہار رائے کی آزادی رکھتی ہیں اس پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔“ وہ بدستور اپنی سابقہ بنجیدگی سے ہی بولا۔

”میں تو جسٹ مشورہ دے رہا ہوں، جسے ماننا نہ ماننا آپ کے مکمل اختیار میں ہے، میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔“

آہستہ آہستہ کہتا ہوا وہ واپس پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔
”شکر۔“

اس کے باہر نکلتے ہی حبیب نے اپنی کتنی دوسرے کی سانس بحال کی۔

”مجھے لگتا ہے انہوں نے ہماری ساری باتیں سن لی تھیں۔“

شاہ زین کے باہر نکلتے ہی کرن فوراً اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔“

شرمندگی حبیب کے لہجہ سے بھی جھلک رہی تھی۔

”مجھے پتا ہی نہیں چلا وہ کب ہمارے پیچھے آکر کھڑا ہوا۔“

”میرا خیال ہے وہ ہم سے ناراض ہو کر گئے ہیں۔“

تاسف کرن کے لہجہ سے بھی جھلک رہا تھا۔

”میں نے معذرت تو کر دی تھی مگر شاید اس کا غصہ کم نہیں ہوا۔“ حبیبہ کرسی پیچھے کھسکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”ذرا اس کا غصہ کم ہو تو میں ایک بار پھر ایکسکیو ز کر لوں گی اب وہ مانے یا نہ مانے اس کی مرضی، جو الفاظ میرے منہ سے نکل گئے اب انہیں تو واپس نہیں لیا جاسکتا ہاں اگر ان الفاظ سے کسی کی دل آزاری ہو تو معذرت ضرور کی جاسکتی ہے۔“
 حبیبہ اپنی ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی جبکہ کرن بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔



”فرہاد..... فرہاد.....“

اس نے فرہاد کا پاؤں ہلاتے ہوئے آواز دی۔

”کیا ہو گیا؟“

اپنے منہ سے کپڑا ہٹاتے ہوئے بمشکل اس نے آنکھیں کھولیں۔

”مریم کو سکول چھوڑ آؤ، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

اسے رات سے بخار تھا، اس وقت تو بہت زیادہ نقاہت محسوس ہو رہی تھی، سر میں بھی شدید درد تھا۔
 ”تو چھٹی کروالو۔“

مشورہ سے نوازتے ہوئے اس نے دوبارہ چادر سر تک تان لی۔

”کروالیتی مگر آج اس کا پیر ہے۔“

”کیا مصیبت ہے سکون سے سونا بھی نصیب نہیں۔“

چادر دور پھینکتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”بجائے مجھے بھگانے کے زیادہ بہتر تھا کہ تم اسے سادیہ کے ساتھ بھیج دیتیں وہ بھی تو اسی کے سکول میں پڑھاتی ہے۔“

”ہاں مگر وہ صبح سویرے سکول کے لیے نکل جاتی ہے۔“

”بات صرف اتنی ہے کہ تمہیں میرا سونا برداشت نہیں۔“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا وہ مریم کی انگلی تھا سے باہر نکل گیا۔ زینب میں بالکل کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ وہ تکیہ سیدھا کر کے وہیں لیٹ گئی آنکھ لگے کچھ ہی دیر ہوئی تھی جب فرہاد کی تیز آواز اس کے کانوں سے مگرائی۔

”زینب..... زینب.....“

اس نے آنکھیں کھول کر سامنے کھڑی پر ایک نظر ڈالی گیارہ بج گئے تھے۔

”اوہ.....“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تاکہ فرہاد کو ناشنا بنا کر دے سکے۔

”تم نے میری دراز سے پیسے نکالے ہیں۔“

فرہاد کا آواز دے کر جگانے کا مقصد بھی غالباً یہی تھا۔

”کون سے پیسے۔“

کچھ تو طبیعت کی خرابی اور کچھ اچانک نیند سے بیداری وہ سمجھ نہ پائی فرہاد کیا کہہ رہا ہے۔

”مکان کے کرایہ کی رقم میں نے یہاں دراز میں رکھی تھی اس میں کچھ پیسے کم ہیں۔“

”اوہ اچھا.....“

نہیں کو ایک دم جیسے کچھ یاد آ گیا۔

”مریم کو امتحان کی فیس دینی تھی آج آخری تاریخ تھی وہ رات کو نکالی تھی شاید پچاس روپے تھے۔“ اس نے مکمل وضاحت دی۔

”پوچھ کر نکالنے چاہئے تھے۔“ فرہاد کے لہجہ میں ناگواری تھی۔

”بنا پوچھے اس طرح اگر تم ہی رقم نکالو گی تو کل کو بچیوں کو کیا سبق دو گی؟ تمہیں دیکھ کر بچوں کو بھی چوری کی عادت پڑے گی۔“

وہ بنا سوچے بولے چلا گیا۔

”چوری.....“

نہیں کو فرہاد کی بات سن کر عجیب سا لگا۔

”یہ چوری نہیں ہے فرہاد، گھر کی رقم گھر کی ضرورت کے لیے نکالی، میں آپ سے لینا بھول گئی تھی بس اس لیے۔“

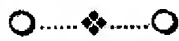
شرمندگی کے ساتھ ساتھ اسے ہلکا سا غصہ بھی آ گیا فرہاد کا رویہ گزرے وقت کے ساتھ کافی تبدیل ہوتا جا رہا تھا جانے کیوں وہ دن بدن نہ صرف چڑچڑا ہوا رہا تھا بلکہ ذرا ذرا سی بات پر غصہ بھی زیادہ کرنے لگا تھا۔

”آئندہ ایسا مت کرنا کیونکہ مجھے یہ سب پسند نہیں۔“

پیسوں والی دراز کو تالا لگا کر چابی جیب میں ڈالتا وہ باہر نکل گیا۔

”بہت ہی گھٹیا شخص ہے اس حالت میں بھی ایک پچاس روپوں کو لے کر میری بے عزتی کر گیا۔“

غصہ میں پہلی بار نہیں کے منہ سے فرہاد کے لیے اس طرح کے غلط الفاظ نکلے جن پر اسے بالکل افسوس نہیں تھا۔



فاطمہ خالہ کے ساتھ گھر میں داخل ہونے والا یہ شخص اس کے لیے قطعی اجنبی تھا مارے حیرت سے وہ چار پائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے اس قدر حیرت زدہ ہونے کا سبب اس شخص کا حلیہ تھا، نہایت سوئڈ بوئڈ ایک امیر و کبیر شخص، جس کے قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے پورا محن مہک اٹھا، بنا پوچھے وہ جان چکی تھی کہ آنے والا کون ہے؟ اس نے پلٹ کر دیکھا ماں بچن کے دروازے سے باہر نکلی۔

”کون آیا ہے؟“

سوال کے ساتھ ساتھ ماں کی نظر اپنے سامنے کھڑے شخص پر پڑی وہ وہیں ساکت ہو گئی۔

”سالار۔“

ماں کے لبوں سے سرسراہٹ کے ساتھ وہ ہی نام نکلا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا یہ تم ہو، تم یہاں اس حلیہ میں یا خدا اگر میں نے تمہیں خود یہاں نہ دیکھا ہوتا تو شاید کبھی کسی کی

بات پر یقین نہ کرتا۔“

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا انکل سالار رو رہے تھے۔ کسی بھی مرد کو اس طرح روتے اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ ماں

کے جسم پر کچلی طاری تھی اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے کہیں وہ گر نہ جائے، اسی خوف سے اس نے دیوار کا سہارا لے رکھا تھا۔

”میں نے تم سے کہا تھا زندگی میں جب میری ضرورت پڑے مجھے پکار لینا مگر تمہیں شاید مجھ پر بھروسہ نہ تھا۔ تم نے مجھے

کبھی نہیں پکارا میں تو یہ ہی سمجھتا رہا کہ تم اپنی نئی زندگی میں خوش اور مگن ہو کر ہمیں بھول چکی ہو مگر یہ کیا تم اس حال میں..... یقین جانو مجھے اس قدر شرمندگی ہو رہی ہے کہ میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔“

وہ ماں کے قریب کھڑے آہستہ آہستہ بول رہے تھے اور ماں تھی کہ بس روئے جا رہی تھی۔ دونوں میں سے کسی کی بھی توجہ اس پر نہ تھی شاید وہ اس وقت وہاں بالکل مس فٹ تھی۔ مگر اسے خواہش تھی کہ انکل سالار، یہاں تک آگئے یقین اب ان کی زندگی سے تمام پریشانیاں دور ہونے والی تھیں۔ ماں کی باتیں سن کر اسے ہمیشہ یہ ہی لگا کہ جیسے انکل سالار اس کے تمام دکھ اور پریشانیوں کو دور کرنے والی جادو کی چھڑی لے کر اس گھر میں آئیں گے اور آج وہ آگئے۔



”شاہ زین ا“

وہ جیسے ہی سیڑھیوں کی جانب بڑھا، حبیہ تیزی سے بھاگ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے ہوٹل چھوڑ دیں گے۔“

اسے خاصی حیرت ہوئی شاید اتنے عرصہ دوستی میں پہلی بار حبیہ نے اس کے ساتھ جانے کا خود کہا تھا۔

”وائے ناٹ شیور۔“

وہ آگے کی جانب بڑھ گیا۔

”ایک سیکنڈ.....“

اس کے ساتھ چلتی حبیہ کو جیسے پھر سے کچھ یاد آ گیا۔

”کل سنڈے ہے نا؟“

پہلے کی طرح اس کا یہ سوال بھی خاصا غیر معقول سا تھا۔

”ظاہر ہے آج اگر سیٹر ڈے ہے تو یقیناً کل سنڈے ہی ہوگا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے مجھے دوپہر میں پک کر لینا، میں کل لچ آپ کی فیملی کے ساتھ کروں گی۔“

اس نے تیزی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی، آج کی اس کی ساری گفتگو ہی خاصی غیر متوقع تھی۔ شاہ زین چلتے چلتے رک

گیا۔

”میری تک چڑھی ماما کے ساتھ لچ کرتے ہوئے تمہیں عجیب سا محسوس نہیں ہوگا۔“

حبیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔

”اب کیا کروں مجبوری ہے۔“

حبیہ کندھے اچکاتے ہوئے ہنس دی۔

”تمہاری ناراضی سے بہتر ہے تمہاری تک چڑھی ماما کے ساتھ لچ کر لیا جائے۔“

”بائی داوے تم انہیں آنٹی کہہ سکتی ہو۔“

”اوکے، ویسے گھر میں تمہاری ماما کے علاوہ اور کون کون ہوگا۔“ شاہ زین کے ساتھ چلتے چلتے اس نے دریافت کیا۔

”کوئی بھی نہیں صرف میں اور ماما کیوں کہ پاپا تو تم جانتی ہو آج کل شہر میں نہیں ہیں شاید ایک دو دن تک آجائیں۔“

”اچھا اور تمہاری بہن.....“

”بہن.....“ اس نے حبیبہ کی جانب دیکھ کر دہرایا۔

”شاید تم جاذبہ آپا کی بات کر رہی ہو۔“

”ہاں ہاں وہ ہی۔“

”وہ میری بہن نہیں کزن ہیں، آج کل اپنے سسرال میں ہیں۔“

”اوہ اچھا تم ہمیشہ ایسے ذکر کرتے تھے کہ مجھے لگا وہ تمہاری سگی بہن ہیں۔“

”میرے لیے تو وہ سگی بہن سے بھی بڑھ کر ہیں، ویسے بھی ان کے والدین کی وفات کے بعد ان کی زیاد تر پرورش میری

ماں نے ہی کی ہے۔ سمجھ لو کہ میری ممانے ہی انہیں پالا ہے ان کی شادی بھی ہمارے ہی گھر سے ہوئی تھی۔“

”اوہ گڈ یہ سب جان کر تو مجھے یقیناً آنٹی کے بارے میں اپنی رائے کو مکمل تبدیل کرنا ہوگا۔“

حبیبہ کا لہجہ ستائشی تھا۔

”ہاں جب تم ان سے ملو گی تو مجھے یقین ہے کہ تمہارے تمام سابقہ خیالات غلط ثابت ہو جائیں گے کیوں کہ میری ممانہ

صرف ایک بہترین ماں بلکہ ایک عظیم ترین عورت بھی ہیں۔“

”شاید ہر اولاد اپنی ماں کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتی ہے۔“

حبیبہ نے پلٹ کر اسے دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”یقیناً کیوں کہ ماں ایک ایسا رشتہ ہے جو ہر غرض سے پاک ہے۔“

”بے شک.....“

حبیبہ نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہو گئی۔

”بہر حال میں ممانے سے بات کر کے تمہیں فون پر بتا دوں گا اگر وہ کل گھر پر ہوئیں اور ان کی کوئی اور مصروفیت نہ ہوئی تو

میں تمہیں بارہ بجے تک پک کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے میں انتظار کروں گی۔“

ہوشل آگیا تھا وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔



”میرا نام زینب ہے۔“

سائے فرش پر بیٹھی لڑکی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

”زینب بنت ہاشم۔“

وہ لڑکی ہاتھ میں کاغذ قلم تھامے مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھی، اور چاہتی تھی کہ زینب اپنی بات دوبارہ شروع کرے،

مگر وہ اس طرح خاموش ہوئی جیسے الفاظ ختم ہو گئے ہوں۔ ”آپ کچھ کہہ رہی نہیں۔“

بالآخر ایک طویل خاموشی سے اکتا کر وہ لڑکی بول اٹھی۔

”ہاں میں کہہ رہی تھی کہ تم میرا نام صرف زینب لکھنا یا پھر ام مریم لکھ دینا، ویسے بھی ہمارے مذہب میں عورت کی

شناخت اس کے باپ یا شوہر کے نام سے نہیں ہوتی ہر عورت اپنی شناخت خود ہے اور میں بھی صرف زینب ہوں، اپنی بچیوں

کی ماں زینب، اس کے علاوہ میری اور کوئی پہچان نہیں۔“

اپنی بات ختم کر کے وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

”میں چاہتی ہوں تم میری کہانی لکھو بالکل سچ سچ جو میں تمہیں بتاؤں تاکہ دنیا جان سکے کیا صحیح تھا اور کیا غلط۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں ایک لالچی، خود غرض اور عیاش عورت ہوں۔ جس نے اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیا اور اپنے شوہر کی قدر نہ کی، اسے دنیا میں رسوا کر دیا وہ جان سکیں کہ سچ کیا تھا۔“

انتنا کہہ کر وہ رونے لگی۔

”دیکھیں پلیز آپ رونیں مت، اور مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دیں جو آپ کے دل میں ہے، وہ سب کچھ جس نے آپ کو آج یہاں اس مقام پر لاکھڑا کیا ہے اپنی اولاد کی جدائی بھی آپ کا مقدر ٹھہر گئی۔ آپ دنیا کو بتائیں کہ کن حالات کے تحت آپ نے یہ انتہائی قدم اٹھایا۔ کیونکہ میں جانتی ہوں آپ ایک ماں بھی ہیں اور کسی بھی ماں کے نزدیک اس کی اولاد سے بڑھ کر کوئی اہم نہیں ہوتا۔“

لڑکی نے ٹھٹھنوں کے بل بیٹھتے ہوئے زینب کا سراپے کندھے سے لگاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گی اسے من و عن لکھ دیتا تاکہ دنیا یہ فیصلہ کر سکے کہ کون صحیح تھا اور کون غلط اور شاید اسی طرح میرے ماتھے پر لگی عیاش اور بد کردار عورت کی مہر مٹ جائے۔“

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے آہستہ آہستہ بولی۔

”ٹھیک ہے بس اب آپ مجھے سب کچھ بتائیں وہ سب جو سچ ہے۔“

لڑکی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی، اس نے اپنا کاغذ اور قلم ایک بار پھر سے سنبھال لیا اب وہ پوری طرح متوجہ تھی کہ زینب جو کچھ کہے اسے پوری طرح اپنے پاس محفوظ کر سکے۔



”مما آپ پورے ٹائم پر اریٹھ کو ایئر پورٹ سے پک کر لیجئے گا کیونکہ وہ اکیلے آتے ہوئے ویسے بھی کافی گھبراہی ہے۔“

فون کے دوسری طرف ایٹال تھا۔

”کیوں کیا تم اس کے ساتھ نہیں آرہے؟“

مما کو ایٹال کی بات سن کر حیرت کا جھٹکا لگا۔

”میں تھوڑا لیٹ آؤں گا مجھے ابھی چھٹی نہیں ملی۔“

”بیٹا ضرور آ جانا تم اچھی طرح جانتے ہو حبا، بھابی کی اکلوتی بیٹی ہے اور تم تو پچھلے سال حذیفہ کی شادی پر بھی نہیں آئے

تھے اسے لے کر بھی وہ تم سے ناراض ہیں۔“

مما نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں جانتا ہوں ممما کہ آنٹی مجھ سے ناراض ہیں اس سلسلے میں میری حظلہ اور حذیفہ دونوں سے بات ہوئی ہے میں نے

ان سے وعدہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ شادی سے ایک ہفتہ قبل پہنچ جاؤں گا آپ آج پلیز رات نو بجے تک اریٹھ کو پک کر لیجئے گا

بھولے گا مت۔“

”تم فکر مت کرو میں ڈرائیور کے ساتھ اسے خود لینے جاؤں گی بس تم شادی تک پہنچ جانا۔“

”ان شاء اللہ ممما ضرور، اللہ حافظ اپنا خیال رکھیے گا۔“



”میری تیسری بیٹی کی پیدائش نے ہی شاید میری زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا، میں جو اپنی ماں کے گھر سے ایک ایسی

خوشگوار اور مکمل زندگی کا تصور لے کر اس گھر میں آئی تھی، جہاں شاید سب کچھ میرے ایک اشارے کا منتظر ہوگا، میں سمجھی تھی کہ

وہ تمام خواہشات جو میری ماں پوری نہیں کر سکی، شوہر کے گھر بنا کسی مشکل کے میرے حصول میں ہوں گی۔ مگر شادی کے بعد پتا

چلا زندگی وہ نہیں ہے، جس کا تصور ہمیشہ یہ رہا کہ شوہر کے گھر جا کر ہر خواہش پوری کرنا یہاں تو شاید زندگی ماں کے گھر سے

بھی زیادہ مشکل تھی۔

جہاں یہ سمجھا گیا کہ عورت ایک بے جان کٹہ تلی ہے جس کی اپنی کوئی خواہشات نہیں ہوتیں، بلکہ اس کی ڈوری ایک

مرد کے ہاتھ میں ہے وہ اسے جیسے چاہے اپنی مرضی کے مطابق چلائے۔ مجھے دوسرے مردوں کا نہیں پتا مگر فرہاد ایک ایسا ہی

اک ساگر ہے زندگی

مرد تھا جو مجھے اپنی مرضی کے رنگ میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میرا سونا، جاگنا، کھانا پینا غرض کے پہننا اوڑھنا بھی اس کی مرضی کے تابع ہو۔ بازار جا کر اپنی مرضی کی شاپنگ کرنا میری ایک ایسی خواہش تھی جو گزرتے وقت کے ساتھ دم توڑ گئی۔ میں وہ ہی پہنتی جو مجھے فرہاد لا دیتا، چاہے وہ مجھے ناپسند ہی کیوں نہ ہو، مگر میں انکار کا حق نہ رکھتی تھی۔ یہاں تک بھی ٹھیک تھا میں اپنی بچیوں کی خاطر سب کچھ برداشت کرنے کو تیار تھی مگر جیسے ہی میں تیسری بار ماں بنی سب کچھ ایک دم تبدیل ہو گیا۔

میں تین دن ہسپتال رہی، فرہاد ایک بار بھی مجھے یا بچی کو دیکھنے نہ آیا حتیٰ کہ اس نے میری خیریت دریافت کرنے کے لیے ایک فون بھی نہ کیا۔ شاید بیٹی کی پیدائش میری ایک ایسی خطا تھی جس کی میں واحد ذمہ دار تھی۔

صباح بھابی کے ساتھ ساتھ مجھے صمد بھائی نے بھی فون کیا دونوں نے ہی مجھے بیٹی کی پیدائش پر مبارکباد دی، فصد بھابی اور ان کے بچے بھی ہسپتال آئے، میرے بھائی بھابی، سب آئے، نہ آیا تو فرہاد نہ آیا۔ ڈسچارج ہونے کے بعد ماں نے چاہا کہ میں ایک ماہ کے لیے ان کے ساتھ گھر چلی جاؤں مگر میں نے صاف انکار کر دیا مجھے اپنی بچی کے ساتھ اپنے ہی گھر جانا تھا۔ میری ضد کے آگے ماں خاموش ہو گئیں اور مجھے احسان کے ساتھ آکر گھر چھوڑ گئیں وہ گھر جہاں میرا استقبال کرنے کے لیے کوئی بھی نہ تھا۔

فرہاد دکان پر تھا، اس نے مجھے آتے دیکھا ضرور مگر گھر آنے کی زحمت نہ کی۔ البتہ سادیہ میرے ساتھ ہی آگئی، دونوں بچیوں کو کھانا بنا کر دینے کے علاوہ اس نے میرے لیے بھی پرہیزی کھانا تیار کیا، گھر کی صفائی میں میری مدد کی اس کے جانے کے بعد میں رات تک منتظر رہی کب فرہاد دکان بند کر کے آئے اور میں اس کے تاثرات جان سکوں جو مجھے امید تھی کہ اچھے نہ ہوں گے۔ مگر میرے لیے اس دنیا میں سب سے زیادہ اہم وہ ہی ایک شخص تھا کیونکہ وہ میرے بچوں کا باپ ہونے کا اعزاز رکھتا تھا۔



مہندی کے فنکشن میں ہر طرف بکھرا گرین کلر ایشال کو وہ سب کچھ یاد کروا رہا تھا جو وہ یاد کرنا نہ چاہتا تھا۔ اسے رہ رہ کر آج وہ ہرے دوپٹے والی لڑکی یاد آ رہی تھی جو جانے کہاں اور کس حال میں تھی۔ اس نے تو ایشہ سے شادی کے بعد سے لے کر آج تک اپنی ماں سے بھی اس کا ذکر نہ کیا۔

وہ جب سے پاکستان آیا تھا پاپا کا رویہ اس سے خالص ریزرو تھا، اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ انہوں نے اسے اور ایشہ کو اپنے گھر رکھنے کی اجازت دے دی تھی ورنہ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ پاکستان میں قیام کا تمام عرصہ اسے ماموں کے گھر رہنا ہوگا۔

مگر آج اس تقریب نے جانے کیوں اسے کئی سال پیچھے ماضی میں پہنچا دیا۔ آج اسے احساس ہوا اس نے جو کچھ کیا شاید اس لڑکی کے ساتھ زیادتی تھی اسے ایک دفعہ اس لڑکی سے ملنا چاہیے۔ یقیناً وہ لڑکی ابھی تک اس کے نام پر بیٹھی تھی کیونکہ طلاق اس نے دی نہ تھی اور خلع اس لڑکی نے لی نہ تھی۔

”مجھے پاپا سے بات کرنی چاہیے جو بھی ہو اس دفعہ میں اس سے مل کر اسے طلاق دے کر جاؤں گا تاکہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کے لیے کسی بھی دوسری جگہ شادی کر سکے۔“

یہ سوچ کر اس نے ایک نظر کچھ دور بیٹھی ایشہ پر ڈالی جو زور و شور سے گانے، گانے میں مصروف تھی۔

اک ساگر ہے زندگی

”کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے یہاں اولاد کا نہ ہونا بھی شاید اسی لڑکی کے دل سے نکلی کسی بد دعا کا نتیجہ ہے۔“

اپنے سامنے کھڑے حظلہ کے چھوٹے سے بیٹے کو دیکھتے بے اختیار اس کے دل میں یہ خیال آیا جس کی اس نے تردید نہ کی۔ حظلہ کی شادی اس کی شادی کے صرف دو ماہ بعد ہوئی تھی اور آج وہ دو بچوں کا باپ تھا جبکہ اس کا آنگن ابھی تک سوتا تھا۔

”بس تو طے ہے اب میں اس لڑکی سے ضرور ملوں گا تا کہ پاپا کی شرط کے مطابق اسے طلاق دے دوں اور وہ کہیں اور شادی کر سکے۔ شاید اسی طرح میرے گھر کے سونے آنگن میں بہار آجائے۔“ پاپا پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔



”مجھے علم تھا تیسری بھی بیٹی ہی پیدا ہوگی۔“

فرہاد کا لہجہ خاصا چمک آمیز تھا یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا وہ فون کان سے لگائے غالباً اپنی بہن سے مصروف گفتگو تھا جس کی تصدیق اگلے ہی پل ہو گئی۔

”آپا میری ذمہ داری تو صرف دو الاکر دینا تھی اب مجھے علم نہیں کہ اس نے کھائی یا نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں پھیلی ناگواری صاف محسوس کی جاسکتی تھی، وہ اپنی آپا سے میرے بارے میں بات کر رہا تھا جبکہ یہ سب مجھے سخت نا پسند تھا۔

”نہیں آپا طبیعت تو نہیں خراب، بس یہ بچی ساری رات روتی ہے اور مجھے بالکل بھی سونے نہیں دیتی اور صبح دکان پر جانا ہوتا ہے۔“

مجھے قطعی نظر انداز کر کے وہ آپا سے مصروف گفتگو تھا، مجھے صرف فرہاد کی آواز سنائی دے رہی تھی دوسری طرف آپا کیا کہہ رہی تھیں میں وہ سب سننے سے قاصر تھا۔

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا چلیں ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“

آپا نے مجھ سے بات کرنے کی زحمت نہ کی اور فون بند کر دیا۔

”تم ذرا فارغ ہو کر ساتھ والا کمر صاف کر دینا، میں آج سے وہاں سونا شروع کروں گا کیونکہ یہ ساری رات بہت روتی ہے اور میری نیند خراب ہونے کے باعث صبح مجھ سے دکان پر صبح کام نہیں ہوتا۔“

یقیناً یہ وہ ہدایت تھی جو ابھی آپا نے چند پل قبل ہی اسے دی تھی اور اب اس پر عمل درآمد فرہاد کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔

”ٹھیک ہے.....“

میرا موڈ اس سے کوئی بحث کرنے کا نہ تھا، اور پھر شام تک کمر صاف ہو گیا اور اس رات جو فرہاد اس کمرے میں تھا سو یا تو اس نے پھر کبھی رات اٹھ کر یہ بھی دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ مجھے اس کی ضرورت ہے یا نہیں دوسرے معنوں میں وہ دیگر تمام باتوں کے ساتھ ساتھ میری ہر ضرورت سے فارغ ہو گیا۔



پاپا کا فون کب سے بج رہا تھا، ایصال نے دیکھا وہ کمرے میں نہ تھے وہ اپنا فون صوفہ پر ہی بھول گئے تھے جب تک ایصال نے فون اٹھایا وہ بند ہو چکا تھا ایصال ان کا سیل ہاتھ میں لیے ماما کی جانب آ گیا۔

”پاپا کہاں گئے ان کا فون کتنی دیر سے بج رہا ہے۔“

”جہاں کی شادی میں شرکت کے لیے سالار آ رہا ہے وہ اسے ریسو کرنے ایئر پورٹ گئے ہیں اب کال آئے تو ریسو کر لو کہیں کوئی ضروری فون نہ ہو۔“

ماما کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ فون ایک بار پھر سے بج اٹھا، ایصال نے دیکھا نمبر کسی بھی نام سے محفوظ نہ تھا، اس نے لیس کا مٹن دبا کر سیل اپنے کام سے لگا لیا۔

”السلام علیکم انکل۔“

ایک نہایت خوب صورت آواز اس کے کان سے گرائی۔

”وعلیکم السلام کون بات کر رہی ہیں آپ۔“

اس نے ماما کی جانب دیکھتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا۔

سوری کیا یہ ملک انکل کا نمبر نہیں ہے؟“

ایصال کی آواز سن کر وہ لڑکی، تذبذب کا شکار ہو گئی۔

”جی یہ ان کا ہی نمبر ہے مگر اتفاق کی بات ہے پاپا اپنا فون گھر بھول گئے ہیں۔“

”آپ کون بات کر رہے ہیں؟“

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ لڑکی قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

”میں ان کا بڑا بیٹا ایصال بات کر رہا ہوں اور آپ؟“

جانے کیوں ایصال کا دل چاہا وہ اس لڑکی سے اس طرح بات کرتا رہے اس کی آواز نہایت ہی مدھر اور رسیلی تھی بالکل دل میں اتر جانے والی۔

”ایصال.....“

لڑکی نے زیر لب دہرایا، ایصال اس کے جواب کا منتظر تھا مگر دوسری طرف مکمل خاموشی طاری تھی ایسے جیسے لائن پر کوئی تھا ہی نہیں، شاید دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

”ہیلو.....“

ایصال نے اپنے خیال کی تصدیق چاہی اب دوسری طرف کوئی بھی نہ تھا۔ لائن ڈسکنیکٹ تھی۔

”کون تھا؟“

ماما نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”پتا نہیں.....“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

”میں نے نام پوچھا تھا مگر اس نے بتایا نہیں۔“

پاپا کا سیل ماما کے حوالے کر کے وہ باہر نکل گیا۔



شاہ زین نے ایک نظر ماما کے قریب بیٹھی جیب پر ڈالی اسے یہ منظر بالکل مکمل لگا، ماما کے پاس بیٹھی کسی بات پر مسکراتی جیب اور اس کی جانب شفقت سے دیکھتی ماما۔ ”کاش یہ منظر یہیں ختم جائے اور جیب کبھی اپنے گھر واپس نہ جائے۔“
بے اختیار ہی اس کے دل سے دعا نکلی، گرے اور پنک فراک میں لمبوس جیب آج پہلے سے کئی گنا حسین دکھائی دے رہی تھی۔

شاہ زین محویت کے عالم میں اسے تک رہا تھا جب ماما کی آواز اس کے کانوں سے نکرائی۔

”شیزئی.....“

”جی ماما.....“

وہ یک دم چونک اٹھا۔

”بیٹا دیر ہو گئی ہے اسے ہوٹل چھوڑ آؤ۔“

ماما کی بات سنتے ہی جیب اٹھ کھڑی ہوئی، شاہ زین کا دل چاہا وہ اسے روک لے، کم از کم آج ایک رات کے لیے وہ یہاں رک جائے۔ دیے بھی بابا یہاں نہ تھے وہ اور ماما گھر میں اکیلے تھے مگر وہ صرف یہ سوچ سکتا تھا کہ نہیں سکتا تھا کیونکہ جانتا تھا جیب اس کی ایسی بچکانہ خواہش کبھی ماننے پر آمادہ ہونے والی نہ تھی۔

”اچھا آنٹی اللہ حافظ۔“

وہ بڑے پیار سے ماما کے گلے لگی۔

”اللہ حافظ بیٹا۔“

اس کے ساتھ ہی ماما نے ایک خوب صورت چھوٹا سا پیکٹ اس کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“

جیب ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گئی۔

”کچھ بھی نہیں ایک معمولی سا تحفہ ہے، تم آج پہلی بار میرے گھر آئی ہو اسی لیے دے رہی ہوں۔“

ماما نے اسے ایک بار پھر خود سے لگاتے ہوئے وضاحت دی۔

”مگر آنٹی یہ تو خاصا قیمتی ہے۔“

جیب نے باکس ہاتھ میں تھامتے ہی کھول کر دیکھا۔

”ہاں مگر تم سے زیادہ نہیں۔“

”لیکن آنٹی۔“

”کوئی لیکن ویکن نہیں تم میری بیٹی ہو اور بیٹیاں کبھی بھی ماں کا دیا ہوا لینے سے انکار نہیں کرتیں۔“

اس کی بات درمیان سے کاٹ کر وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

جب کہ اس ساری گفتگو کے دوران شاہ زین بالکل خاموش کھڑا تھا۔

”اور ویسے بھی تم میرے گھر آج پہلی بار آئی ہو اور ہماری روایت ہے کہ پہلی بار اپنے گھر آنے والے مہمانوں کو خالی

ہاتھ نہیں دیتے۔“

وہ اس کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”او کے آنٹی اللہ حافظ اینڈ ٹھیک یو آپ کا گفٹ بہت خوب صورت ہے۔“

”ہاں اور میں ایک بار پھر کہوں گی تم سے زیادہ نہیں۔“

جواباً وہ ہلکا سا ہنستے ہوئے بولیں۔

حبیبہ ان سے مل کر شاہ زین کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کے لباس سے اٹھتی گلون کی مہک نے شاہ زین کو مبہوت سا کر دیا اور وہ جانے کتنی دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہتا اگر ماما سے آواز دے کر نہ پکارتیں۔

”کہاں گم ہو، جاؤ اسے چھوڑ کر آؤ آٹھ بجنے والے ہیں۔“

وہ ٹیبل پر رکھی گاڑی کی چابی اٹھا کر خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔



”السلام علیکم پاپا۔“

ملک صاحب نے اپنے سامنے پھیلا اخبار سرکاتے ہوئے ایک ہلکی سی نظر ایصال پر ڈالی جو کرسی کھینچ کر، عین ان کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“

سلام کا جواب دیتے ہی انہوں نے اخبار ایک بار پھر سے اپنے چہرے کے سامنے کر لیا، ایصال کی سمجھ میں نہ آیا وہ آگے بات کیسے شروع کرے۔

”پاپا..... آپ مجھ سے ابھی تک ناراض ہیں؟“

اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر سے بول اٹھا۔

”نہیں تو۔“

نہایت ہی مختصر جواب، وہ اخبار میں بری طرح مصروف تھے۔

”پاپا پلیز ہو سیکے تو مجھے معاف کر دیں، اس نا فرمانی پر جو مجھ سے سرزد ہوئی۔“

وہ لندن واپس جانے سے قبل اپنی ہر غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

”کس بات کی معافی ایصال، شاید تم نے سنا نہیں میں نے ابھی کہا تھا کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“

ملک صاحب نے نہایت نرمی سے جواب دیتے ہوئے اخبار لپیٹ کر اپنے سامنے موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔

”بلکہ مجھے تو افسوس ہے میرا ایک غلط فیصلہ انجام دینے میں کسی معصوم کی زندگی برباد کرنے کا سبب بنا، معافی مجھ سے نہیں

اس سے مانگو جس کی زندگی تمہارے نام پر خراب ہوئی۔“

”ہاں پاپا کبھی کبھی تو مجھے بھی ایسا فیصلہ ہوتا ہے جیسے یہ سب اسی کی بددعا کا نتیجہ ہے جو میں آج تک اولاد جیسی نعمت سے

محروم ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”شاید اولاد کی کمی نے تمہیں، تمہاری زیادتی کا احساس دلادیا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت

پوشیدہ ہے ورنہ آج اگر تم صاحب اولاد ہوتے تو کبھی مجھ سے معافی مانگنے کی زحمت نہ کرتے، صحیح کہہ رہا ہوں نا۔“

اپنی بات ختم کر کے انہوں نے ایصال سے تائید چاہی جو جواب میں بالکل خاموش، سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”بہر حال اولاد کا ہونا نہ ہونا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، اور یہ سب کچھ کسی کی بددعا کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ ہمیں ہر چیز اپنے نام پر

اسی وقت ملتی ہے جب وہ ہمارے نصیب میں لکھ دی جاتی ہے۔ تمہاری اولاد جب تمہارے نصیب میں ہوگی تمہیں ضرور مل جائے گی تم بلاوجہ فطرسوچوں کو اپنے دماغ میں جکھ مت دو۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔

”پاپا مجھے آپ سے ایک اور بات بھی کرنی ہے۔“

ملک صاحب کی بات ختم ہوتے ہی وہ جلدی سے بول اٹھا۔

”پاپا میں آپ کی عائد کردہ شرط کے مطابق اس لڑکی سے ملنے کو تیار ہوں تاکہ اس سے مل کر اسے طلاق دے سکوں۔

میں چاہتا ہوں پاپا آپ اس کی شادی کسی اور اچھی جگہ کر دیں تاکہ وہ بھی اپنی زندگی سکھ کے ساتھ گزار سکے۔ مجھ سے انجانے میں جو حق تلفی ہوئی اس کا ازالہ اس طرح ہی ممکن ہے کہ ہم اسے ایک خوشگوار زندگی دینے کی کوشش کریں۔“

وہ جب تک بولتا رہا ملک صاحب اس کا چہرہ نکلتے رہے۔

”نی الحال یہ ناممکن ہے۔“

ایصال کی بات ختم ہوتے انہوں نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیونکہ وہ آج کل یہاں نہیں ہے اس کی ماں کی برسی ہے اور ہر سال وہ ان دنوں لاہور جاتی ہے یہ وہ دن ہیں جو

اسے خاصا ڈپریشن کر دیتے ہیں۔ لہذا ان دنوں اس سے، اس قسم کی کوئی بات نہیں ہو سکتی بہر حال وہ جیسے ہی واپس آتی ہے

میں کوشش کروں گا تمہاری اس سے ملاقات کروا سکوں۔“

ملک صاحب نے ہر بات تفصیل سے بتائی۔

”ایک بات پوچھوں پاپا۔“

ایصال آج ان سے ہر بات کر لیتا چاہتا تھا۔

”ہاں پوچھو۔“

”ماں تو وہ مریم آپا اور جاذبہ کی بھی ہیں تو پھر برسی وہ اکیلی کیوں مناتی ہے یہ دونوں اپنی بہن سے کیوں نہیں ملتیں۔“

”بہت سارے سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا یا شاید کچھ فیصلے ہم اپنی عدالت میں خود ہی کر کے

دوسرے فریق کو سزا بھی سنا دیتے ہیں تمہاری ماں کی طرح شاید ان دونوں کو بھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ ان کی بہن نہیں ہے

میری بات سمجھ رہے ہوتا تم۔“

”جی میں سمجھ گیا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مگر پاپا اگر یہ سب سچ نہیں ہے تو آپ نے کیوں ان دونوں کو سب کچھ سچ

نہیں بتایا۔“

”کیا بتانا بیٹا تم تو جانتے ہی ہو کہ ایک کی ساس فضلہ بھابی ہیں اور دوسری کی تمہاری والدہ محترمہ اور ان دو خواتین کے

ہوتے ہوئے تم امید کر سکتے ہو کہ ان دونوں بچیوں کو صحیح بات بتانے کا موقع مل سکے؟ تمہاری طرح ان کے برین بھی واش کر

دیے گئے ہیں، تمہیں تو شاید اریشہ کی محبت نے کچھ صحیح سننے نہ دیا اور ان دونوں کو دنیا کی باتوں نے، بہر حال وقت نے ان

دونوں کے ساتھ بھی کافی زیادتی کی۔ پھر بھی میں دادوں گا تمہاری ماں اور بتائی کو جنہوں نے مریم اور جاذبہ کو نہ صرف ماں

بن کر پالا بلکہ بہو کا رشتہ جوڑ کر ساری زندگی اپنی آنکھوں کے سامنے بھی رکھا۔ تمہاری ماں نے مریم اور جاذبہ کو ہمیشہ اپنی سگی

اولاد سے بڑھ کر چاہا یہی سبب تھا جو تمہارا نکاح کرتے ہوئے میں نے یہ نہ سوچا کہ معاملہ اس قدر خراب ہو جائے گا۔ مجھے

امید تھی کہ تھوڑا غصہ کرنے کے بعد تمہاری ماں اپنی بچی کو قبول کر لے گی مگر ایسا نہ ہوا جس پر مجھے افسوس ضرور ہے غصہ نہیں،

اک ساگر ہے زندگی

بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمیں درست فیصلہ نہیں کرنے دیتیں یا شاید قسمت میں جو جیسے لکھا ہو ویسا ہی ہو کر رہتا ہے اور اس سلسلے میں ہم سب بے اختیار ہیں۔“

ملک صاحب نے اپنی بات ختم کر کے، ٹیبل پر رکھا اخبار ایک بار پھر سے اٹھا لیا جس کا مطلب تھا وہ کسی ٹاپک پر مزید بات کرنا نہیں چاہتے۔

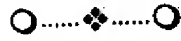
”اوکے پاپا.....“

ایشال اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز آپ میری بات یاد رکھیے گا اور کوشش کیجئے گا کہ اگر وہ میرے واپس جانے سے قبل آجائے تو میری اس سے ملاقات ضرور کروا دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

ملک صاحب نے ایشال کی جانب دیکھے، ہاتھ جواب دیا اور اخبار کے مطالعہ میں کھو گئے۔



پتا نہیں میرے اور فرہاد کے درمیان اتنا فاصلہ کیسے آیا کہ میں صرف اس کی ضرورت بن کر رہ گئی، محبت تو جانے کہاں گئی۔ وہ محبت جو میاں بیوی کے رشتہ کا لازمی جزو ہے ہم دونوں کے درمیان سے بھاپ بن کر اڑ گئی، وہ محبت جو ایک شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے میرے لیے صرف ایک خواب تھی، میں مانتی ہوں کہ فرہاد کی بے رخی اور سرد رویہ نے مجھے اس سے دور کر دیا۔

اس عرصہ میں فرہاد میں صرف ایک اچھی تبدیلی یہ آئی کہ وہ نماز پنجگانہ کے ساتھ تہجد بھی پڑھنے لگا، وہ رات با وضو ہوتا، صبح چار بجے کے لگ بھگ اٹھ جاتا نماز اور قرآن کی باقاعدہ تلاوت کرتا۔ اپنے سارے دن کی اپنی سرگرمیاں رات وہ یا سمین آپا سے ضرور شیئر کرتا، جو اسے دل کھول کر خراجِ تحسین پیش کرتے سے کبھی یہ سوال نہ کرتیں کہ تم حقوق اللہ پورا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوئے حقوق العباد تو نہیں بھول گئے؟ کہیں وہ حق تو نہیں فراموش کر دیا جو اللہ نے تمہارے ذمہ بیوی کا لگایا تھا۔

کاش وہ یہ سب سوال کرتیں فرہاد کو احساس دلاتیں تو شاید آج وہ سب نہ ہوتا جو ہوا، لیکن نہیں سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے نصیب میں جو لکھ دیتا ہے وہ ہر حال میں پورا ہو کر رہتا ہے۔ یقیناً اگر میرا رب مجھے اس بری گھڑی سے بچانا چاہتا تو وہ حادثہ نہ ہوتا جو اس دن ہوا جس نے مجھے اور فرہاد کو ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی کر دیا۔



”حبیبہ!“

”ہاں بولو۔“

وہ کی بورڈ پر مسلسل انگلیاں چلاتے ہوئے ذرا کی ذرا کی۔

”تمہیں میری ماما کیسی لگیں؟“

اس نے حبیبہ کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

”بہت اچھی اور ٹائٹس، میری ان کے بارے میں جو ابتدائی آبرزویشن تھی وہ انتہائی غلط تھی۔“

کمپیوٹر سکرین سے نظر ہٹا کر اس نے شاہ زین کی جانب دیکھتے ہوئے نہایت صاف گوئی سے جواب دیا۔
”تھینک گاڈ، ورنہ میں تو ڈر رہا تھا جانے تمہاری رائے ان کے بارے میں کیا ہو۔“ شاہ زین ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے ہنس دیا۔

”دراصل حبیبہ ماما تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔“
وہ فوراً سے پیشتر اپنے اصل مدعا کی جانب آگیا۔
”میرے گھر والے؟“

حبیبہ کا، کی بورڈ پر تیزی سے چلنا ہاتھ یک دم ساکت ہو گیا۔
”ہاں تمہاری امی یا پھر وہ آنٹی جس سے اس دن میں ملا تھا یعنی کوئی بھی تمہارا ایسا فیملی ممبر جس سے معاملہ سکیں۔“
وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ حبیبہ کو اپنی بات کس طرح سمجھائے۔
”میرے والدین حیات نہیں ہیں اور یہ بات شاید میں پہلے بھی آپ کو بتا چکی ہوں۔“ وہ ایک بار پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”حبیبہ تم ایک سیکنڈ کے لیے اپنا یہ کام چھوڑ کر میری بات نہیں سن سکتیں۔“ اب وہ پوری طرح جھنجھلا گیا۔
”ہاں بولو میں سن رہی ہوں۔“

حبیبہ شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے، پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔
”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ظاہر ہے رشتہ طے کرنے کے لیے میری ماما کا تمہارے کسی فیملی ممبر سے ملنا از حد ضروری ہے۔“

اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔
”واٹ.....“

شاہ زین کی بات سنتے ہی حبیبہ کو ایک جھٹکا سا لگا۔
”مجھ سے شادی.....“

وہ بے ساختہ ہنس دی، اس کو اس طرح ہنسنے دیکھ کر شاہ زین کچھ شرمندہ سا ہو گیا، ہنسنے ہنسنے حبیبہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟“

اس نے سیدھا شاہ زین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”میں کون ہوں؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں؟ میرا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ کیا آپ یہ سب جانتے ہیں؟“
حیرت ہے شاہ زین اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں۔“
وہ اب مکمل طور پر سنجیدہ تھی۔

”تم کون ہو؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو؟ یہ سب جاننا میرے لیے انتہائی غیر ضروری ہے۔ میرے لیے ضروری صرف اتنا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، بس اس سے زیادہ میرے لیے کوئی بات اہمیت نہیں رکھتی۔“

اس کا لہجہ قطعی اور جہتی تھا۔

”حیرت تو اس بات کی ہے کہ میرے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے قبل آپ نے یہ جاننا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ آیا میں بھی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں یا کہ نہیں۔“
وہ کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
”تو سچ یہ ہے کہ میں آپ سے شادی کر ہی نہیں سکتی کیونکہ آئی ایم آل ریڈی میر ڈ۔“
وہ شاہ زین کے اس قدر قریب تھی کہ اس کے بالوں سے اٹھتی مہک شاہ زین کے نشتوں میں گھس کر اسے بے چین کر سکتی۔

”واٹ.....“

اب جھٹکا لگنے کی باری شاہ زین کی تھی، جیبہ کے قرب کی مدد ہوئی سے وہ ایک دم ہی باہر نکل آیا۔
”کیا بکو اس ہے یہ۔“
اس کی آواز بے اختیار ہی بلند ہو گئی۔

”یہ بکو اس نہیں سچ ہے سو فیصد سچ، میرے ہر بینڈ پاکستان سے باہر ہیں جس کے باعث میں ہاسٹل میں تمہارا ہائش اختیار کرنے پر مجبور ہوں اور ایسے میں آپ جیسے لوگ جانے کب کیا اندازے لگاتے رہتے ہیں۔“
وہ اس کے قریب سے گزر کر باہر جاتے ہوئے بولی، شاہ زین کچھ بول نہ سکا، جیبہ کے اس انکشاف نے اسے سن کر دیا اور اپنی جگہ ساکت کھڑا رہ گیا۔



”میں مریم اور جاذبہ کو سکول سے لے کر گھر واپس آرہی تھی جب وہ خوفناک حادثہ رونما ہوا جس نے میرے ہوش و حواس کو کچھ دیر کے لیے مفلوج کر دیا۔ ایک منٹ، پوری بات بتانے سے قبل میں آپ کو واضح کر دوں جاذبہ کون تھی؟
جاذبہ ذرا اصل جگنو کا وہ نام تھا جو اس کے برتھ سرٹیفکیٹ پر درج تھا جبکہ جگنو میں اسے صرف پیار سے پکارتی تھی۔ ہاں میں تو آپ کو اس حادثہ کے بارے میں بتا رہی تھی، جب روڈ کراس کرتے ہوئے بالکل اچانک ہی ایک تیز رفتار گاڑی مریم کو ٹکراتی گزر گئی۔ اس کا سرٹ پاتھ سے ٹکرایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر گئی۔ اسے اس طرح خون میں لپ پت دیکھ کر میں اپنے حواس کھو بیٹھی۔ مریم کے گرد ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا بھانت بھانت کی آوازیں میرے کانوں سے نکل رہی تھیں مجھ کو سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ جب ایک دم مجمع کو چیرتا ہوا ایک شخص آگے بڑھا۔
”ہائیں سب لوگ یہاں سے..... بجائے بچی کو ہسپتال لے جانے کے آپ سب لوگ یہاں کھڑے باتیں بنا رہے ہیں۔“

لوگوں کو لٹاؤنے کے بعد اس نے میری جانب دیکھا۔

”گھبراہٹ مت کچھ نہیں ہوا اسے، معمولی زخمی ہے ہسپتال جا کر مرہم پٹی ہوگی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“
مجھے تسلی دینے کے بعد اس نے مریم کو گود میں اٹھا لیا یہ دیکھے بنا کہ مریم کا خون اس کے سفید کلف شدہ لباس کو خراب کر رہا ہے۔

”پلیز آپ میرے ساتھ آئیں۔“

اک ساگر ہے زندگی

219

اور میں خاموشی سے روتی ہوئی جگنو کو گود میں لیے اس اجنبی شخص کی گاڑی میں جا بیٹھی کیونکہ اس وقت میرے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ شخص کون ہے؟ یہ جاننے سے زیادہ ضروری میرے نزدیک میری بچی کی زندگی تھی۔ اس کی بے ہوشی میرے دل کو ہولا رہی تھی مگر میں خدا پر مکمل بھروسہ کیا اس کی گاڑی میں سوار ہسپتال کی جانب رواں دواں تھی۔

○.....❖.....○

”دیکھو بیٹا کوئی بھی مسئلہ اس طرح رونے دھونے سے حل نہیں ہوتا۔“

سالار نے اپنے سامنے بیٹھی، بری طرح روتی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا۔

”میرا مشورہ مانو ایک دفعہ ایصال سے مل لو اور ختم کرو اس کہانی کو جس نے تمہاری ساری زندگی کو ایک اذیت بنا دیا، میں نے صدمہ پہلے ہی سمجھایا تھا کہ تمہیں ایصال سے طلاق دلوادے تاکہ ہم تمہاری بھی کہیں اور شادی کر سکیں اور تم ایک خوشگوار زندگی میں داخل ہو کر ماضی کی تمام تلخیوں کو بھلا سکو مگر جانے کیوں اس وقت تم دونوں نے میری بات نہ مانی۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا صدمہ کی شرط کے مطابق ایصال تم سے ملاقات کرنے کو تیار ہے دوسرے لفظوں میں وہ تم سے مل کر تمہیں طلاق دینا چاہتا ہے۔“

”ظاہر ہے بیٹا اگر وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تو ایشور سے شادی بھی کیوں کرتا۔“ سالار کی دلیل معقول تھی۔

”مگر انکل.....“

”کوئی اگر مگر نہیں۔ حقیقت کا سامنا کرو بچے زندگی ریت میں سردے کر نہیں گزرتی اسے فیس کرنا پڑتا ہے ویسے بھی

جب تک ایک مشکل ختم نہ ہو ہم آسانوں کی راہ پر قدم نہیں رکھ سکتے میری بات سمجھ رہی ہوتا؟“

سالار آج اسے ہر بات کھل کر سمجھانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”تمہارے لیے بہتر یہ ہے کہ تم ایصال سے طلاق لو تاکہ تمہاری کہیں اور شادی کی جاسکے۔ ساری جوانی اس طرح تمہاری کا عذاب سہتے ہوئے نہیں گزر سکتی یہ ایک بہترین وقت ہے ٹھیک فیصلہ کرنے کا، اپنی مری ہوئی ماں کی روح کو سکون دینے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ہمت کرو اور اپنے حق میں فیصلہ کی خاطر ایصال کا سامنا کرو۔“

سالار انکل ٹھیک کہہ رہے تھے یہ ہی تو وہ وقت تھا جس کا انتظار جانے اسے کب سے تھا۔

”ٹھیک ہے انکل میں ایصال سے ملنے کے لیے تیار ہوں۔“

اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے سالار کی جانب دیکھا۔

”گڈ جھے تم سے یہی امید تھی یاد رکھنا بیٹا مجھے اپنے رب پر پورا بھروسہ ہے اس نے ضرور تمہارے لیے ایک ایسا متبادل رکھا ہوگا، جو پہلے سے کئی گنا بہتر ہوگا اور ان شاء اللہ وہ تمہیں ضرور مل کر رہے گا، جو تمہارے نصیب میں لکھا جا چکا ہے۔“ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

○.....❖.....○

”تم نے حبیب سے بات کی تھی۔“

ممانے صوفی سے سر نکائے، آنکھیں موندے شاہ زین کا کندھا ہلایا۔

”جی ممان۔“

وہ جلدی سے سیدھا ہو بیٹھا اس کی آنکھیں بالکل سرخ تھیں شاید اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

”پھر کب ملو رہے ہو مجھے اس کی آنٹی سے۔“

”شاید کبھی نہیں۔“

وہ نظریں چراتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

”کیوں۔“

مما کو حیرت ہوئی۔

”جیبہ نے انکار کر دیا ہے کیا؟“

اس کے علاوہ کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔

”جی ممّا۔“

اس کی آواز رندہ گئی۔

”مما وہ شادی شدہ ہے اور مجھے دیکھیں میں اتنا بے خبر تھا کہ مجھے اس بات کا آج تک علم ہی نہ ہوا یہاں تک کہ کرن بھی اس کی شادی کے بارے میں قطعی کچھ نہیں جانتی، پتا نہیں ممّا مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ جیبہ نے اپنی شادی کے حوالے سے جو کچھ مجھ سے کہا آیا وہ سچ بھی ہے یا جھوٹ۔“

”شوہر کہاں ہے اس کا؟“

مما اس کی کسی بھی بات پر توجہ دینے پر تیزی سے بولیں۔

”شاید کہیں باہر رہتا ہے کسی اور ملک میں، میں نے پوچھا نہیں۔“

”اوہ میرے خدایا، اس کا مطلب میں جو کچھ سمجھ رہی تھی وہ سچ تھا۔“

ان کی آواز کپکپا رہی تھی یا شاید شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا۔

”میرے ساتھ آؤ۔“

وہ تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھیں شاہ زین عالم حیرت میں گھرا ان کے ساتھ ہولیا۔ جب وہ اسٹڈی کارڈوازہ کھول کر پاپا کے عین سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

”سالار۔“

انہوں نے پاپا کو پکارا، شاہ زین کو ان کی آواز رندھی ہوئی محسوس ہوئی ان کی آنکھیں سرخ تھیں یقیناً وہ رورہی تھیں۔

”جیبہ کون ہے؟“

پاپا کے کچھ کہنے سے قبل ہی انہوں نے وہ سول کر دیا جسے سنتے ہی پاپا حیرت کے عالم میں منہ کھولے ان کی جانب دیکھنے لگے۔

”مجھے بتائیں سالار جیبہ کون ہے؟“

اب وہ باقاعدہ رورہی تھیں، شاہ زین کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا یہ سب کیا ہو رہا ہے وہ ہکا بکا ان دونوں کی جانب تک رہا تھا۔

”تم جو سمجھ رہی ہو وہ بالکل درست ہے نازیہ۔“

پاپا اپنا قلم ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے، آہستہ آہستہ چلتے وہ ماما کے قریب آن کھڑے ہوئے۔
”حبیبہ نوب کی بیٹی ہے۔“

”اوہ میرے خدایا، آپ نے آج تک مجھ سے یہ بات چھپائی اس لیے میں جب اسے دیکھتی تھی مجھے نوب کی یاد آ جاتی تھی۔“ پاپا خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

”وہ تمہاری بھالی ہے شاہ زین، تمہارے بھائی ایٹال کی منکوحہ جسے طلاق دیئے بتا اس نے اریبہ سے شادی کر لی۔“
ماما نے پلٹ کر شاہ زین کی جانب دیکھا جو اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑا تھا یہ ایک ایسا انکشاف تھا جس نے اسے بالکل سن کر دیا تھا اور وہ کچھ بھی بولنے کے قابل بھی نہ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک انکشاف نے اسے دنگ کر کے رکھ دیا تھا۔



”پلیز آپ روئیں مت آپ کی بچی اب بالکل ٹھیک ہے صرف خوف کے باعث بے ہوش ہو گئی تھی اب مانتے پر لگی چوٹ کی ڈرینگ ہو گئی ہے، بچی بھی ہوش میں ہے آپ چاہیں تو میرے فون سے اپنے گھر اس حادثہ کی اطلاع دے سکتی ہیں۔“

سامنے کھڑے شخص نے موبائل میری جانب بڑھایا۔

میں جیسے یک دم ہوش میں آ گئی مجھے یاد آیا حبیبہ صبح سے اوپر فائزہ کے پاس تھی، فرہاد جب دوپہر میں گھر آیا ہوگا تو ہمیں نہ پا کر یقیناً پریشان ہوا ہوگا سوچ رہا ہوگا میں جانے کہاں گئی، یہ بھی سب سوچتے ہوئے میں نے اپنے پرس سے وہ پرچی نکالی جس پر فرہاد کا موبائل نمبر درج تھا اور خاموشی سے سامنے کھڑے شخص کی جانب بڑھادی، اس نے نمبر ملایا اور فون میری سمت بڑھادیا۔

”ہیلو فرہاد میں نوب بات کر رہی ہوں۔“

فرہاد کے فون ریسیو کرتے ہی میں بے قراری سے بولی۔

”کہاں ہو تم فائزہ کئی بار پوچھ چکی ہے بچی نے رورو کر اپنا برا حشر کر لیا ہے اور یہ کس کے نمبر سے بات کر رہی ہو تم۔“
اسے جیسے اچانک ہی یاد آیا کہ میرے پاس تو موبائل فون ہی نہیں ہے جواب میں نے اسے ساری بات بتادی۔

”اوہ کہاں ہو تم اس وقت، میرا مطلب کس ہسپتال میں ہو اور مریم کیسی ہے؟“

اس کے لہجہ کی بے قراری مجھے اچھی لگی۔

”اب تو اللہ کا شکر ہے کہ وہ ٹھیک ہے۔“

جواب کے ساتھ ہی میں نے ہسپتال کا نام بھی بتادیا۔

”کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے پرائیویٹ ہسپتال جانے کی۔“

ہسپتال کا نام سننے ہی فرہاد کا موڈ آف ہو گیا۔

”قریب ہی ایک سرکاری ڈسپنسری تھی وہاں لے جاتیں مگر اب تمہیں کون سمجھائے تمہیں تو صرف ایک ہی شوق ہے کسی

بہانے فرہاد کا روپیہ برباد کرنے کا۔“

وہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا، میری کچھ دیر قبل والی خوشی کا فور ہو گئی۔

”بہر حال میں آ رہا ہوں۔“

میرا جواب سنے بنا اس نے فون بند کر دیا۔

”میرے ہر بینڈ آر ہے ہیں۔“

میں نے فون اپنے سامنے کھڑے شخص کی جانب بڑھا دیا جو میری طرف ہی متوجہ تھا۔

”میرا خیال ہے آپ مسز فرہاد ہیں۔“

فون تھامتے ہی اس نے اپنا خیال ظاہر کیا جو سو فیصد درست تھا۔

میں حیران ہو گئی وہ مجھے کیسے جانتا تھا۔

”آپ شاید مجھے نہیں جانتیں میں فائزہ کا بھائی ہوں آپ کے گھر اس دن چابی کے لیے آیا تھا۔“

”اوہ.....“

تو یہ ہی سبب تھا جو وہ شخص مجھے کہیں دیکھا ہوا لگ رہا تھا۔

”آپ کی بچیاں تو اکثر مجھے فائزہ کے گھر دکھائی دیتی ہیں بہر حال آپ کی بیٹی ڈسچارج ہو چکی ہے، میں فائزہ ہی کی

طرف جا رہا ہوں آپ اگر چاہیں تو آپ کو بھی ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ سوالیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”نہیں شکریہ آپ کا، بس فرہاد بھی آتے ہی ہوں گے۔“

جانتی تھی اگر اس وقت میں فرہاد کو ہسپتال میں نہ ملی تو کئی دنوں تک اس کا سوڈ آف رہنا تھا نہ صرف یہ بلکہ اس نے مجھے

بہت باتیں بھی سنائی تھیں اس لیے بہتر تھا سامنے کھڑے شخص کو صاف منع کر دیا جائے۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“

مریم کو فرس نے میرے قریب ہی رکھی کرسی پر لٹا دیا، ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا بیگ جس میں اس کی دوائیاں

تھیں۔

”میں نے بل پے کر دیا ہے کچھ زیادہ نہیں تھا۔“

مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر وہ فوراً ہی سمجھ گیا۔

”ویسے اگر آپ برانہ مائیں تو ایک بات پوچھوں۔“

وہ شخص گہری نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”جی پوچھیں۔“

میں نے چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔

”آپ استانی فضیلت کی بیٹی تو نہیں ہیں وہ جو مثل پورہ میں بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہیں ان کی ایک بیٹی تھی،

عالمِ اس کا نام بھی نرنب ہی تھا.....“

مجھے حیرت ہوئی فائزہ نے تو کبھی مجھ سے اس حوالے سے بات نہیں کی تھی۔

”ہلیز آپ کچھ غلط مت سمجھیں میں بھی وہیں کارہائشی ہوں، ہمارا گھر آپ کی دوسری گلی میں تھا آپ نے یقیناً مجھے نہیں

دیکھا ہوگا مگر میں اکثر آپ کو سکول سے گھر آتے جاتے دیکھتا تھا۔“

”آپ نے ٹھیک پہچانا استانی فضیلت میری والدہ ہیں۔“

کسی شخص کی یادداشت اتنی اچھی بھی ہو سکتی ہے میں حیران تھی۔

”اچھا اللہ حافظ میں اب چلتا ہوں۔“
 شاید وہ میری بے چینی بھانپ گیا تھا اس لیے اٹھ کھڑا ہوا۔
 میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ فرہاد کے آنے تک وہ یہاں موجود رہے۔
 ”آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے آج میری بہت مدد کی۔“
 مجھے بروقت یاد آیا کہ اس شخص کی مہربانی کے باعث ہی آج مریم ہسپتال پہنچ پائی تھی۔
 ”کوئی بات نہیں۔“
 مجھے جواب دے کر وہ شخص باہر نکل گیا۔



”بی بی جی آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“
 ”کون ہے؟“
 حبیبہ نے الماری کے پٹ بند کر کے رابعہ کی جانب دیکھا جو اسی ہاسٹل کی ملازمہ تھی۔
 ”پتا نہیں جی کوئی بیگم صاحبہ ہیں۔“
 ”بیگم صاحبہ۔“ حبیبہ نے حیرت سے دہرایا۔
 ”یہ مجھ سے ملنے کون آگیا؟“
 اس نے دل ہی دل میں سوچا ضرور مگر بولی نہیں۔
 ”اچھا انہیں بٹھاؤ میں آرہی ہوں۔“
 بالوں کو اچھی طرح ستوار کر، گلے میں وہ پٹا ڈالے جیسے ہی وہ وینٹک روم میں داخل ہوئی خلاف توقع اپنے سامنے
 موجود نازیہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔
 ”آئی آپ.....“
 وہ اتنی ایکسائٹڈ ہوئی کہ سلام کرنا بھی بھول گئی۔
 ”ہاں بیٹا میں.....“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔
 ”پلیز آئی بیٹھیں آپ۔“
 ”مجھے معاف کر دینا حبیبہ میں نہیں جانتی تھی کہ تم کون ہو۔“
 حبیبہ کے قریب آ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے وہ اتنا بے اختیار بولیں کہ حبیبہ ہکا بکار رہ گئی۔
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو سالارا انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“
 نازیہ آئی کے رویہ نے اس پر ہر بات واضح کر دی۔

”ہاں بیٹا وہ سب کچھ جس کا تعلق تمہاری ماں کی ذات سے تھا آج وہ سب جان گئے جو نہ جانتے تھے اور اللہ تعالیٰ ہمیں
 معاف فرمائیں ہم اس کے لیے بہت کچھ غلط سمجھتے رہے۔ ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ تم شاید فرہاد کی بیٹی ہی نہیں ہو یہ
 سب وہ غلط باتیں ہیں جو فضا بھابی نے شروع دن سے ہی ہمارے دلوں میں ڈال دی تھیں ایسی باتیں جو میں اور صباحت چاہ
 کر بھی دل سے نہ نکال سکے۔ بہر حال بیٹا اب ہو سکے تو ہمیں معاف کر دو بے شک گزرا وقت واپس نہیں آ سکتا پھر بھی ہم یہ

چاہیں گے کہ تمہارے ساتھ جو بھی زیادتی آج تک ہوئی ہے اس کا کسی حد تک ازالہ کیا جاسکے۔“
وہ رورہی تھیں جواباً حبیبہ کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

”رات میری مریم اور جاذبہ دونوں سے بات ہوئی ہے وہ دونوں بھی بے حد شرمندہ ہیں اور تم سے ملنا چاہتی ہیں بس بیٹا تم ہم سب کو معاف کر دو۔“

انہوں نے روتی ہوئی حبیبہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”پلیز آئی آپ مجھے شرمندہ مت کریں۔“

اتنی محبت کا تو حبیبہ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا، اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر نازیہ کے بندھے ہاتھ کھول دیئے۔

”آئی میری اماں آپ سے بہت محبت کرتی تھیں انہوں نے ہمیشہ آپ کو اچھے الفاظ میں یاد کیا۔“

”ہاں بیٹا میں جانتی ہوں وہ مجھ سے اپنی سگی بہن سے بھی بڑھ کر محبت کرتی تھی بس میں ہی اپنی نا سبھی کے باعث دوسروں کی باتوں میں آگئی۔ میں تمہیں یہاں سے لینے آئی ہوں اپنا سامان پیک کر دو تمہیں آج اور اسی وقت یہاں سے جانا ہے تم یہ ہاسٹل چھوڑ رہی ہو اور یہ ہم سب کا متفقہ فیصلہ ہے۔“

وہ شاید سب کچھ طے کر کے آئی تھی۔

”مگر آئی.....“

”اگر کچھ نہیں جلدی جلدی سامان پیک کر دو اور ہمارے ساتھ گھر چلو۔“

پشت کی جانب سے آئی یہ آواز یقیناً سالار انکل کی تھی حبیبہ حیرت سے پلٹی۔

”ہاں بیٹا ہماری کوتاہیوں کے باعث تم نے بہت قید تنہائی کاٹ لی اب ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ تم مزید ایک پل بھی یہاں رہو۔“

سارے فیصلے ہو چکے تھے حبیبہ کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں تمہارا ویٹ کر رہی ہوں تم اپنا سامان لے آؤ۔“

”اوکے آئی۔“

جواب دے کر وہ باہر نکل آئی۔



”کیا ضرورت تھی اتنے مہنگے ہسپتال جانے کی، قریبی کسی کلینک سے پٹی کروا لیتیں بلا وجہ اتنا پیسہ برباد کیا۔“

یہ وہ جملہ تھا جو جانے دن میں کتنی بار مجھے فرہاد سے سننا پڑتا جبکہ مل کی مد میں خرچ ہونے والی رقم وجاہت نے ہم سے نہیں لی تھی۔ فرہاد کی اس گفتگو نے مجھے جی بھر کر بدظن کر دیا۔ مریم اب بالکل ٹھیک تھی مانتے پر زخم کا نشان بھی خاصا مندمل ہو چکا تھا۔ مریم کے ساتھ پیش آنے والے اس اتفاقی حادثہ نے مجھے فائزہ کے خاصا قریب کر دیا شاید اس کی ایک وجہ وجاہت بھی تھا۔ عموماً جب بھی میں اوپر جاتی وہ پہلے سے ہی موجود ہوتا ورنہ فائزہ مجھے نیچے سے بلا کر لے جاتی، ان دونوں بہن بھائیوں کی سنگت میں میرا وقت اتنا اچھا گزرنے لگا کہ میں آہستہ آہستہ اپنے گھر کی تلخیاں بھولنے لگی۔

وجاہت اپنی بہن کے لیے جب بھی کچھ لاتا میرا حصہ ضرور ہوتا، اور پھر جانے کیسے ایسا ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان سے فائزہ نکل گئی اب صرف میں اور وجاہت ہی رہ گئے۔ یہ سب کیسے ہوا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ میری اتنی تعریفیں کرتا کہ میرا

دل چاہتا وہ اسی طرح بولتا رہے اور میں اس کے سامنے بیٹھی سنتی رہوں اور اس دن تو میں بہت ہی حیران ہوئی جب وجاہت نے بتایا کہ وہ مجھے شادی سے پہلے پسند کرتا ہے اس نے اعتراف کیا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور وجاہت کی یہ بات سن کر جانے کتنے دنوں تک میں ایک صدمے کی سی کیفیت میں مبتلا رہی۔

”کاش وجاہت مجھے شادی سے پہلے مل جاتا تو یقیناً آج فرہاد کی جگہ وہ ہوتا اور پھر صورت حال قدرے مختلف ہوتی۔“ رفتہ رفتہ اس سوچ نے میرے دماغ کو بالکل مفلوج کر دیا۔ فرہاد سے مجھے بالکل انسیت نہ رہی وہ میرے لیے قطعی اجنبی بن گیا۔ پہلے وہ مجھے اگنور کرتا تھا اب میں نے اسے اگنور کرنا شروع کر دیا۔ وقت نے مجھے ضرورت اور محبت کے درمیان فرق سمجھا دیا۔ وجاہت کی محبت نے مجھے اپنی نظروں میں دنیا کی حسین ترین عورت قرار دے دیا، میں بھول گئی کہ ایک شادی شدہ عورت ہونے کے ناطے میرے فرائض کیا ہیں؟ میں اپنی تینوں بیٹیوں کو یکسر فراموش کر کے وجاہت کی محبت میں غرق ہو گئی۔

اس کا تعریفیں کرتا، میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا، یہاں تک کہ محبت سے میری جانب نکلتا، یہ سب وہ کچھ تھا جو مجھے آٹھ سالہ ازدواجی زندگی میں کبھی نہ ملا وجاہت نے میری ترسی روح کو سیراب کر دیا۔ کیا گناہ، کیا ثواب اپنے نفس کی تسکین کے لیے میں سب کچھ بھلا بیٹھی۔ کسی نے صحیح کہا ہے ”عورت اور مرد کی تہائی میں تیسرا وجود شیطان کا ہوتا ہے۔“ وہ شیطان ہم دونوں کے درمیان داخل ہو چکا تھا اپنے آپ کو تہائی کے دہانے کی طرف دھکیل کر شاید میں فرہاد سے انتقام لے رہی تھی۔ میں سارا دن تک سک سے تیار رہتی میری یہ تیاری وجاہت کے لیے ہوتی، فرہاد میری طرف متوجہ ہے یا نہیں اس بات کی اہمیت میرے نزدیک بالکل ختم ہو گئی تھی۔



آج ملک انکل کے ساتھ آنٹی اور ایصال بھی آرہے تھے، شاید اریشہ بھی ان کے ساتھ تھی، مگر اسے کسی سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے لیے پریشانی کی بات تو صرف یہ تھی کہ شاہ زین اسے مسلسل اگنور کر رہا تھا وہ جب سے یہاں آئی تھی اس کا سامنا بہت کم ہی شاہ زین سے ہوتا، مگر جب بھی کبھی اتفاق سے وہ اس کے سامنے آتا یک دم ہی اجنبی سا بن جاتا اور یہ بھی بات حبیبہ کے لیے باعث تکلیف تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی اسے نازیہ آنٹی نے بتایا تھا کہ انکل اور آنٹی صباحت کے ساتھ ایصال اور اریشہ اس سے ملے آرہے ہیں لہذا وہ اچھی طرح تیار ہو کر نیچے آجائے، مگر وہ نہایت بددلی سے بیڈ پر بیٹھی جانے کیا سوچ رہی تھی جب کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں نیچے ماما تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

یہ آواز یقیناً شاہ زین کی تھی اس نے چونک کر سر اٹھایا وہ اس کے عین سامنے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے کھڑا اس کی ہی جانب متوجہ تھا۔ شاہ زین کو آج اتنے دنوں بعد خود سے مخاطب دیکھ کر وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

”کم آن حبیبہ خود کو مضبوط کرو، ایصال کو احساس دلاؤ کہ وہ تمہارے لیے اتنا ہی غیر اہم ہے جتنی تم اس کے لیے، اس کا سامنا خود اعتمادی سے کرو، جتنے آنسو بہانا ہے ابھی بہا لو اور رولو جتنا رونا ہے مگر خدا کے لیے اس کے سامنے تم اس طرح مت رونا اس کے سامنے پہننے والا ایک آنسو کا قطرہ بھی تمہاری اہمیت ختم کر دینے کے مترادف ہے میری بات سمجھ رہی ہونا۔“ حبیبہ کے آنسو اسے بے چین کر گئے۔

”میں اس کے لیے نہیں رو رہی۔“

حبیبہ نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے وضاحت دی۔
”میں تو صرف اس لیے رو رہی ہوں کہ آج اتنے دنوں بعد تم نے مجھے مخاطب کیا، مجھ سے بات کی، تمہیں اس طرح اچانک اپنے سامنے دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ بے اختیار ہی آنسو آنکھوں سے بہہ نکلے ورنہ ایصال میرے لیے اتنا اہم نہیں کہ اس کے لیے اپنے قیمتی آنسو ضائع کروں۔“
اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی۔

”گڈ مجھے ایسی ہی حبیبہ چاہیے خود اعتماد اور حاضر جواب، اب وہ کچھ ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں جلدی سے تیار ہو کر نیچے آ جاؤ۔“

شاہ زین کا دل بہت کچھ کہنے کو چاہا، مگر وہ اتنا ہی کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ گیٹ کے دوسری طرف تیز ہارن کی آواز سنائی دی اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر نیچے جھانکا گاڑی ملک انکل کی تھی، خان چاچا نے گیٹ کھول دیا تھا وہ پردہ چھوڑ کر تیزی سے الماری کی جانب بڑھی اپنا ڈریس نکالا اور باجھ روم میں گھس گئی۔



آج فضلہ بھابی کے گھر میلاد تھا، میں فرہاد کے ساتھ جب وہاں پہنچی تقریباً میلاد ختم ہونے والا تھا۔ میلاد کے بعد کھانے کا اہتمام خواتین کے لیے چھت پر ہی تھا۔ سب سے فارغ ہو کر میں نیچے آئی جہاں لاؤنج میں فرہاد، اسفند بھابی کے ساتھ موجود تھا مجھے جلدی واپس گھر جانا تھا کیوں کہ صبح مریم اور جازبہ (یہ جگنو کا اصل نام تھا اور وہ جب سے سکول داخل ہوئی تھی میں اسے اسی نام سے پکارنے کی عادی ہو چکی تھی) کا سکول تھا اور جازبہ اگر کسی وجہ سے سونے میں لیٹ ہو جاتی تو صبح اٹھتے وقت بہت تنگ کیا کرتی۔

”فرہاد کھانا کھا لیا ہے تو آجائیں گھر چلیں۔“

تیزی سے بولتے ہوئے میرا جملہ درمیان میں ہی رہ گیا، لاؤنج میں فرہاد اور اسفند بھابی کے ساتھ ایک تیسری شخصیت بھی موجود تھی جس پر پڑنے والی پہلی نظر نے ہی مجھے ساکت کر دیا میرے عین سامنے والے صوفے پر سالار موجود تھا۔

”السلام علیکم زینب کیسی ہیں آپ.....؟“ مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”شکر الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں، آجائیں فرہاد دیر ہو رہی ہے۔“

اسے جواب دے کر میں نے فرہاد کو مخاطب کیا اور خود لاؤنج سے باہر نکل آئی۔ سالار اور نازیہ نے پچھلے کچھ عرصہ میں مجھے اگنور کیا تھا جس کا احساس ابھی بھی میرے دل میں پوری طرح موجود تھا یہ ہی وجہ تھی جو میرا دل سالار سے زیادہ بات کرنے کو بالکل نہیں چاہا۔



”تم نے ایک بات نوٹ کی؟“

فضلہ بھابی نے حسب عادت سسپنس پھیلاتے ہوئے سوال کیا۔

”کون سی بات؟“ مباحثہ جانتی تھیں ان کی پٹاری میں ضرور کوئی نئی بات موجود ہوگی۔

”زینب خاصی بدل گئی ہے۔“

جانے کیوں نہ نب ہمیشہ ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہی اور یہ بات صباحت سے زیادہ بھلا کون جان سکتا تھا۔
 ”میں آپ کی بات سمجھی نہیں بھابی آپ کس تبدیلی کی بات کر رہی ہیں؟“
 ”نہ نب کے رویہ کی جو پہلے سے بالکل بدل چکا ہے پہلے والی اپنائیت اور لگاؤ تو اب اس میں سرے سے غائب ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ عجیب سی سرد مہری اس کے مزاج کا حصہ بن گئی ہے۔“
 جانے ان کا پیش کردہ تجربہ درست تھا یا غلط، صباحت سمجھ نہ پائیں۔
 ”میری تو ایک ماہ قبل فون پر اس سے بات ہوئی تھی مجھے تو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔“
 ”اچھا.....“

فضہ بھابی کچھ مایوس سی ہو گئیں۔
 ”ہو سکتا ہے، مگر جانے کیوں مجھے نہ نب کچھ عجیب سی لگنے لگی ہے۔“ وہ اپنی بات سمجھا نہیں پا رہی تھیں۔
 ”چلو خیر ہمیں کیا۔“
 وہ سمجھ چکی تھیں کہ صباحت ان کی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہیں اس لیے ہی انہوں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔
 ”لگتا ہے مسلسل بچیوں کی پیدائش نے اسے تھوڑا سا بد دل کر دیا ہے۔“
 ”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔“
 صباحت نے ان کی بات سے مکمل طور پر اتفاق کیا۔



فرہاد کافی دیر سے فون پر بڑی تھا اس کی گفتگو سے میں اندازہ لگا چکی تھی کہ یقیناً دوسری جانب یاسمین آپا ہیں، مگر اب میں نے ان فون کالز سے پریشان ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی کیا بات کر رہے تھے اب یہ سب جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فرہاد کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے میں ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی جب اچانک اوپر جانے والی سیڑھیوں سے فائزہ نے مجھے آواز دی۔

”نہ نب آپ..... نہ نب آپ۔“
 ”ہاں کیا ہوا؟“ ٹی وی آف کر کے میں فوراً صحن میں نکل آئی۔
 ”مچھلی کھائیں گی وجاہت بھائی لے کر آئے ہیں۔“
 وہ سیڑھیوں کے اوپر منڈیر پر جم چکی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ وجاہت پچھلے دو دن سے اپنے چھوٹے بھائی کے پاس حیدر آباد گیا ہوا تھا اب فائزہ کی بات سننے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ واپس آ چکا ہے میرا دل یک دم ہی خوشی سے بھر گیا۔
 ”میں اوپر ہی آرہی ہوں۔“

اسے جواب دے کر میں نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کیا اور اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے پیچھے کی کوئی فکر نہیں تھی کیوں کہ جانتی تھی کہ میں کتنی ہی دیر بعد گھر واپس آؤں فرہاد نے کوئی پروا نہیں کرنی یہاں تک کہ بستر میں جانے سے قبل اس نے آواز دے کر مجھے نیچے بھی بلانا، اس کے اس قسم کے رویہ نے ہی مجھے شاید اس قدر آزاد اور خود سر بنادیا تھا شاید میں بھی دوسروں کی طرح اپنی غلطیوں کا الزام خود سے منسلک دوسرے افراد پر ڈالنے کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔



اک ساگر ہے زندگی

بے چینی ایصال کے چہرے سے چھلک رہی تھی، اریشر نے ایک نظر بغور اس کے چہرے کی جانب ٹکا اور دوسری نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی صباحت آنٹی پر ڈالی جو نہایت اطمینان سے نازیبا آنٹی سے محو گفتگو تھیں۔ وہ نفرت جو حبیبہ کا ظہم سنتے ہی ان کے چہرے پر چھا جایا کرتی تھی آج سرے سے غائب ہو چکی تھی یعنی کافی کچھ بدل چکا تھا اور جو رہ گیا تھا وہ کچھ ہی دیر میں تبدیل ہونے والا تھا۔ وہ کہانی جو آج سے کئی سال قبل شروع ہوئی تھی بہت سارے لوگوں کو کئی عرصہ تک تکلیف میں مبتلا رکھ کر آج ختم ہونے والی تھی۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا، جانے حبیبہ اب تک کیوں نہیں آئی تھی۔ وہ بڑی شدت کے ساتھ اس کی آمد کی منتظر تھی وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی اس سے ملنا چاہتی تھی۔ حبیبہ نامی وہ تلوار جو کئی سالوں سے ان دونوں میاں بیوی کے سر پر لٹک رہی تھی، آج اس سے نجات کا دن تھا، وہ چاہ رہی تھی کہ ہر عمل بخوبی انجام پا جائے اور جتنی جلدی ہو سکے ایصال حبیبہ کو طلاق دے دے۔

وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اس نے فوراً گردن گھما کر دیکھا اندر داخل ہونے والا شاہ زین تھا اس کے ساتھ ساتھ ایصال کے چہرے پر بھی ایک مایوسی سی چھا گئی۔



”ایک بات کہوں زینب۔“

وجاہت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ میں نے سر اس کے کندھے سے ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

”مجھ سے شادی کرو گی۔“

”کیا.....“

میں ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولتے ہوئے سیدھی ہو گئی، کچھ سال قبل یہ جملہ اسی طرح میرے کانوں نے سنا تھا، مگر کہنے والا شخص کوئی اور تھا آج پھر میں اسی جگہ کھڑی تھی وہی جملہ اور ویسی ہی محبت، مگر کہنے والا کوئی اور.....

”میری بات کا جواب دو زینب.....“

میری خاموشی نے شاید اسے پریشان کر دیا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے میں تو پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔“

اس دفعہ میرا لہجہ پہلے سے خاصا کمزور تھا وہ مضبوطی جو سالار کو جواب دیتے ہوئے میرا انداز میں تھی آج وہ کہیں نہ تھی شاید فرہاد کے رویہ نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔

”ہمارے مذہب میں طلاق رکھی ہی اس لئے گئی ہے کہ ہم اپنی ناپسندیدہ زندگی سے نجات حاصل کر سکیں، ہمیں کہیں پابند نہیں کیا گیا کہ ایک مسلسل اذیت میں رہتے ہوئے جیسے تیسے اپنی زندگی پوری کر دو اور مر جاؤ۔ قرآن میں کہیں عورت کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔“ وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”مگر وجاہت میری بچیاں.....“

ایک اور کمزور دلیل۔

”مجھے تمہاری بچیاں پالنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ تم پر منحصر ہے اگر تم چاہو تو.....“

”دنیا کیا کہے گی اگر میں فرہاد کو چھوڑ کر تم سے شادی کر لوں پورا خاندان مجھ پر تھوکرے گا۔“ میری آواز خاصی دھیمی تھی۔

”ایک ناجائز تعلق دنیا کے سامنے آنے سے بہتر ہے کہ اسے جائز کر لو۔ دنیا سے زیادہ اللہ کا خوف دل میں رکھو سب آسان ہو جائے گا۔“ وجاہت کی ہر بات درست تھی، میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

”تقدیر بدلنے کا ایک موقع ہر انسان کو ضرور ملتا ہے۔“ سالار کے الفاظ ایک بار پھر میرے کان سے نکلے، مجھے تو قدرت نے ایک کے بعد دوسرا موقع فراہم کر دیا تھا اب مجھ پر منحصر تھا میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں یا ایک بار پھر سے رد کر کے پرانی زندگی میں لوٹ جاؤں، مگر اب کی بار میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”پھر کیا سوچا زین؟“ وہ منتظر انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے کچھ ناٹم دو، میں اچھی طرح سوچ لوں۔“ یہ میری طرف سے نیم رضا مندی تھی۔

”جتنا چاہو ناٹم لے لو، مگر میں یہ چاہوں گا کہ تمہارا فیصلہ میرے حق میں ہو کیوں کہ میں اب تمہارے بنا زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

اس نے ایک محبت بھری نگاہ میرے چہرے پر ڈالی ایسی نگاہ جس نے مجھے ساری دنیا بھلا کر صرف اسی کا ہی کر دیا تھا۔ ویسے بھی وہ شادی شدہ نہ تھا۔ سالار کے ساتھ نازیہ کی موجودگی مجھے اس سے دور کرنے کا باعث بنی تھی اور یہاں ایسا کچھ نہ تھا اسی لیے میں مطمئن تھی۔



”یہ حبیبہ کہاں رہ گئی۔“

نازیہ نے شاہ زین کو مخاطب کیا جو ابھی ابھی ایٹال سے گلے مل کر فارغ ہوا تھا۔

”ہاں نہیں ماما میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

اماں کے اشارہ کرتے ہی وہ پھر سے اٹھ کھڑا ہوا جب ایک دم بیرونی دروازے پر پڑا پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہو گئی جس کا انتظار کمرے میں موجود ہر فرد بڑی بے چینی سے کر رہا تھا۔

”السلام علیکم؟“

سلام کرتے ہی وہ دروازے کے بالکل قریب ہی رک گئی، ایسے جیسے اس کے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا ہو، باوجود کوشش کے وہ کچھ ندوس ہو گئی تھی۔

”وعلیکم السلام.....“ جواب کے ساتھ ہی مباحث اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”آگے آ جاؤ بیٹا وہاں کیوں رک گئیں۔“

اسے کنفیوڈ کھڑا دیکھ کر نازیہ آٹنی نے حوصلہ دیا، سچ سچ قدم اٹھاتی وہ آگے بڑھ آئی۔

”تم تو ہو بہو اپنی ماں جیسی ہو۔“ اسے گلے لگاتے ہی پہلا جملہ مباحث کے منہ سے یہ ہی نکلا۔

ایٹال نے ہمیشہ یہ سنا تھا کہ زینب چاچی ایک مکمل حسن کا نمونہ تھیں۔ اس وقت اپنی ماں کے منہ سے نکلنے والے یہ سنائی الفاظ سن کر اس نے جو نظریں اٹھائیں تو وہ جھکتا ہی بھول گئیں، اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ سامنے کھڑی لڑکی حبیبہ ہے وہ

اک ساگر ہے زندگی

حبیبہ جسے اس کی منکوحہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے خوب صورت تو جاذبہ اور مریم بھی تھیں، مگر حبیبہ کا حسن ایسا تھا جس نے ایصال جیسے خود پسند شخص کو مبہوت کر دیا۔

”ایک ہل تو تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے میرے سامنے نہب کھڑی ہو۔“

مباحث نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا جوا بابا حبیبہ کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، شاید اس وقت وہ بول ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا گلارندہ گیا ہے اس کی نگاہوں میں بے اختیار اپنی ماں کا بیمار اور لاغر و جود لہرا گیا، جو زمانے کی تتم نظر پائی کے ہاتھوں یکسر برباد ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم حبیبہ کیسی ہیں آپ!“ اسے مخاطب کرنے سے ایصال خود کو باز نہ رکھ سکا۔

”شکراً الحمد للہ بالکل ٹھیک۔“

مختصر جواب دے کر اسے قطعی نظر انداز کرتی وہ سامنے رکھے صوفے پر شاہ زین کے برابر جا بیٹھی۔ حبیبہ اتنی حسین ہوگی، یہ تو شاید اس کے تصور میں بھی نہ تھا اسے دیکھتے ہی نگاہ بے اختیار قریب بیٹھی اریشہ کے چہرے پر جا پڑی، جو بغور اسے ہی تک رہی تھی۔ جانے اس کی نگاہوں میں ایسا کیا تھا وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ اتنا دل پھینک تو کبھی نہ تھا کہ کسی لڑکی کے حسن کو دیکھ کر ایسے بے خود ہو جاتا، یہاں شاید اس کی اس بے خودی کی وجہ حبیبہ سے جڑا رشتہ تھا وہ رشتہ، جسے اتنے سال اس نے کبھی کوئی اہمیت ہی نہ دی، حبیبہ سامنے بیٹھی ماسے بات کر رہی تھی۔ ایصال نے ترجمہی نگاہوں سے اس کا بغور جائزہ لیا سبز شلوار قمیص میں ملبوس حبیبہ کا ملکوتی حسن اسے اپنے سحر میں جکڑ رہا تھا۔

”گرین کلر کس قدر خوب صورت ہوتا ہے، میں بلا وجہ ہی آج تک اس رنگ سے چڑھا رہا۔“ حبیبہ کے جسم پر موجود گرین کلر دیکھتے ہی اس کے دل میں پہلا خیال یہ ہی آیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اب چلنا چاہیے۔“

جانے اریشہ کو کیا ہوا وہ یک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی شاید وہ ایصال کی بے خودی محسوس کر چکی تھی، بے چینی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ جو بھی تھا اس وقت سامنے بیٹھی لڑکی اس کی سوتن کے عہدے پر فائز تھی رشتہ پسند کا ہو یا مجبوری کا، اپنی نزاکتوں کا احساس ہر دم دلاتا ہے۔

”اتنی جلدی.....“ ایصال کے کچھ کہنے سے قبل ہی نازیہ آنٹی بول اٹھیں۔

”میں نے سب کے لیے ذریعہ کر دیا ہے۔“

”سوری آنٹی، ہمیں پاپا کی طرف جانا ہے ہمارا ذر وہاں ہے اور وہ ویت کر رہے ہوں گے چلو ایصال۔“

اس نے اطمینان سے بیٹھے ایصال کو پکارا، حبیبہ نے دیکھا وہ کچھ گھبرائی ہوئی تھی اسے حیرت ہوئی شاید اریشہ کو ایصال کی محبت پر مجروح نہ تھا کیوں کہ جو بھروسہ رکھتے ہیں وہ ایسے نہیں گھبراتے۔

”اوکے آنٹی، ہم چلتے ہیں ماما پاپا آپ کے ساتھ ڈنر کریں گے۔“

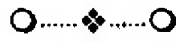
کھڑے ہوتے ہوئے ایصال نے نازیہ کو مخاطب کیا، پھر ایک نظر حبیبہ کے چہرے پر ڈالی جو شاہ زین سے مسکرا مسکرا کر محو گفتگو تھی۔ اسے ایصال کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا ایصال یہ محسوس کر چکا تھا اسے حبیبہ کا اس طرح خود کو نظر انداز کر کے شاہ زین سے باتیں کرنا قطعی پسند نہ آیا جو بھی تھا حبیبہ اس کی منکوحہ تھی..... اور ہے..... ابھی تک اس نے طلاق نہ دی تھی وہ ایک مرد تھا اور مرد کی انا کی تسکین ہمیشہ ایک عورت کو اپنے سامنے گڑ گڑاتے دیکھ کر ہوتی ہے چاہے وہ مرد کتنا تعلیم

یافتہ کیوں نہ ہو۔

لیکن یہاں تو وہ جس جیبہ کا تصور لے کر آیا تھا صورت حال اس سے قطعی مختلف تھی، جیبہ کا اسے اگتور کرنا، اسے ذرا نہ بھایا۔ وہ جو اس غلط فہمی میں تھا کہ جیبہ اس کے انتظار میں لگا ہیں فرش راہ کیے بیٹھی ہوگی اس کی یہ غلط فہمی ایک پل میں ہی دور ہوگئی۔ اپنی غلط فہمی کے دور ہوتے ہی وہ ایک دکھ اور تکلیف کے احساس میں گھر گیا، بھول گیا کہ یہ ابتداء اس کی طرف سے ہوئی تھی، وہ ہی تو تھا جس نے اتنے سال جیبہ کو انتظار کی سولی پر لٹکا رکھا تھا اور خود اپنی بھرپور زندگی جی رہا تھا۔ بالآخر وہ جیبہ کا اس طرح نظر انداز کرنا برداشت نہ کر سکا اور ایک دم بول اٹھا۔

”اللہ حافظ جیبہ۔“

اس کی زبان سے ادا ہونے والے ان بے اختیار الفاظ نے جیبہ کو حیران کر دیا، جواباً وہ کچھ بول ہی نہ پائی اور نہ ہی ایشال نے اس کے جواب کا انتظار کیا اور ایشہ کی سنگت میں لاؤنچ کا دروازہ عبور کر گیا۔



”یہ نینب اور وجاہت بھائی کے درمیان کیا چل رہا ہے۔“

آج کئی دنوں بعد رابعہ، فائزہ سے ملنے آئی تھی اور آتے ہی اس کی طرف سے کیے جانے والے اس سوال نے فائزہ کو تھوڑا سا بوکھلا دیا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ اس کی زبان تھوڑا سا لڑکھڑائی۔

”وہ دراصل ہمارے پرانے محلے میں رہنے والی فضیلت آنٹی کی بیٹی ہے جو محلے کے بچوں کو سپارہ پڑھایا کرتی تھیں۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ رابعہ نے کڑے انداز میں تفتیش کی۔

”میں نے یہ پوچھا ہے کہ اس کا وجاہت بھائی سے کیا سلسلہ ہے، کیوں وجاہت بھائی سارا دن تمہارے گھر پائے جاتے ہیں اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ نینب بھی اوپر تمہارے گھر ہی ہوتی ہے خاص طور پر اس وقت جب وجاہت بھائی یہاں آتے ہیں۔“

”تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔“ فائزہ قدرے حیران ہوئی۔

”میں نے جب بھی بھائی کو فون کیا وہ تمہارے گھر ہی ہوتے ہیں اور اکثر ان کی باتوں میں نینب کا تذکرہ ہوتا ہے جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے، میں جانتی ہوں کہ وہ کئی سالوں سے نینب کو پسند کرتے ہیں اور ان کی یہ پسنداب محبت میں دھل چکی ہے جس کا اندازہ ان سے بات کرنے والا ہر شخص با آسانی لگا سکتا ہے۔“

رابعہ نے ہر بات تفصیل سے بتائی جسے سن کر فائزہ نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور نہ وہ جانے کیا سمجھی تھی۔

”جو آپ سوچ رہی ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے نینب ایک شادی شدہ عورت ہے جس کی تین بیٹیاں ہیں۔“ فائزہ اب قدرے مطمئن ہو چکی تھی۔

”شادی شدہ یا بچیاں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ سب کچھ کسی بھی انسان کو بچکنے سے روکنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم ان دونوں پر نظر رکھو اور کوشش کیا کرو جب وجاہت بھائی آئیں نینب اوپر نہ آئے۔“ رابعہ کے دل میں کچھ ایسا تھا جو اسے پریشان کر رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے بابا کروں گی کوشش، اب یہ بتاؤ تم نے کھانے میں کیا کھانا ہے؟“ فائزہ قدرے اکتا گئی۔

”جودل چاہے بنا لو.....“

رابعہ کے جواب دیتے ہی فاترہ وہاں سے اٹھ کر باہر کچن کی طرف آگئی کیوں کہ وہ رابعہ کے پاس بیٹھ کر اس کے مزید سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھی۔

○.....❖.....○

”یہ رکھ لو.....“ وجاہت نے ایک پھولا ہوا براؤن لفافہ میری جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“

لفافہ تھا متھے ہی میں نے کھول کر اندر جھانکا، ہرے اور نیلے نیلے نوٹ جنہیں دیکھتے ہی میں حیران رہ گئی۔

”یہ کس لیے ہیں؟“ میں نے لفافہ وجاہت کی سمت واپس بڑھایا۔

”تمہارے لیے۔“ اس نے لفافہ کو ہاتھ لگائے بنا جواب دیا۔

”میرے لیے کیوں؟“ وجاہت کا اس طرح پیسے دینا مجھے بہت عجیب لگا۔

”کیوں اتنے سوال جواب کر رہی ہوں، رکھ لو میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں گرمیوں کی شاپنگ کر لینا۔“

”سوری وجاہت میں اتنی رقم ایسے نہیں رکھ سکتی۔“

میں نے فوراً سے پیشتر ہاتھ میں پکڑا لفافہ بیڈ پر رکھ دیا۔ وجاہت کا اس طرح پیسے دینا مجھے ذرا اچھا نہ لگا، ایسا محسوس ہوا

جیسے وہ میری قیمت ادا کر رہا ہو۔

”میں چلتی ہوں فرہاد گھر آنے والا ہوگا۔“ گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہی میں سیڑھیوں کی جانب لپکی۔

”ایک منٹ ننب! میری بات تو سنو۔“ وہ جلدی سے میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”ناراض ہو گئی؟“ میری دلی کیفیت کا اندازہ اسے ہمیشہ بنا کہے ہی ہو جایا کرتا تھا۔

”نہیں.....“ میں نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

”سوری ننب میرا مقصد تمہیں تکلیف دینا نہ تھا، میں تو صرف.....“

”ٹھیک ہے وجاہت ہم اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے ابھی مجھے جانا ہے کیوں کہ کچھ ہی دیر میں فرہاد گھر آنے

والا ہے اور مجھے نیچے جا کر روٹی پکانی ہے ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔“

میں اس کے قریب سے گزر کر باہر نکل آئی۔

○.....❖.....○

”ایک بات پوچھوں۔“

وہ میز پر تنہا کھڑی جانے کن سوچوں میں گم تھی جب اس کے پیچھے شاہ زین آن کھڑا ہوا۔

”ہاں پوچھو.....“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی جانب پلٹی۔

”تمہیں دکھ نہیں ہوا ایشال اور ایشہ کو ایک ساتھ دیکھ کے.....“

”کس بات کا دکھ.....“

حبیبہ کا لہجہ بالکل سادہ سا تھا جس میں کوئی دکھ یا پریشانی کہیں نہیں جھلک رہی تھی شاہ زین کے دل کو اطمینان سا حاصل

ہوا۔

”یہ دکھ کہ جس جگہ تمہیں ہونا چاہیے تھا، وہاں ایصال کے برابر اریشہ کھڑی تھی۔ دیکھو حبیب یہ سننا کہ، ایصال نے تمہیں چھوڑ کر اریشہ کو اپنا لیا اتنا تکلیف دہ شاید نہ ہو جتنا ان دونوں کو اس طرح ایک ساتھ دیکھنا میری بات سمجھ رہی ہوتا۔“

حبیب کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ دیکھ کر وہ کچھ کنفیوژ ہو گیا۔

”بہت اچھی طرح۔“ وہ بدستور مسکراتے ہوئے۔

”ایک بات بتاؤں شاہ زین، میں نے اپنی ماں کی زندگی سے ایک سبق بہت اچھے طریقے سے سیکھا ہے وہ یہ کہ، زندگی کبھی بھی کسی ایسے شخص کے ساتھ نہ گزارو جو تمہاری قدر و قیمت نہ جانتا ہو ورنہ تمہاری زندگی خود تمہارے لیے عمر بھر کا روگ بن جائے گی۔ جانے لوگ صبر و شکر جیسے الفاظ صرف عورت ہی کے ساتھ کیوں منسوب کر دیتے ہیں اور مردانہ لفظوں سے مبرا کیوں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہیں قرآن میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ صبر و شکر کرنے والی صرف خواتین ہونی چاہئیں وہاں تو لفظ مومنین استعمال کیا گیا ہے، مگر افسوس ہم ہمیشہ عورت ہی کو یہ درس دیتے ہیں کہ ہمیشہ صبر کرے، اللہ کا شکر ادا کر دے۔ ایسے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ اپنے دل کو کہاں کہاں مارتی ہے، صرف ایک اچھا بننے کا جوش اسے اندر سے مار دیتا ہے ختم کر دیتا ہے، مرد کا ہر گناہ جائز اور عورت کی ایک ذرا سی غلطی پر پکڑ، صرف عورت ہی کھوٹ سے پاک کیوں ہونی چاہیے؟ کیوں ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی بیوی نیک اور پاکباز ہو؟ کیوں مرد کوشش نہیں کرتا خود سے منسوب عورتوں کو نیک اور پاکباز بنانے کی؟ کیوں ان کی دلی خواہشات کو اس قدر بے مول کر دیتا ہے کہ وہ سانس لیتے ہوئے بھی ڈرنے لگتی ہے کہ کہیں ٹوٹ کر بکھر نہ جائے؟ کیوں کرتے ہو تم سب مرد ایسا، کیوں عورت کی قدر نہیں کرتے؟“

اس کی آواز بھرا گئی وہ رو رہی تھی۔

”سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے حبیب بالکل اسی طرح سب عورتیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔“ اس نے حبیب کے کندھے

پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھا۔

”تم اریشہ، فضلہ تائی اور زینب چاچی کیا یہ سب عورتیں ایک جیسی ہیں، نہیں نا تو بس سب مرد بھی ایک جیسے نہیں ہوتے بالکل ایسے جیسے میں اور ایصال ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ایک نے تمہیں کھو دیا اور دوسرا تمہیں پانے کے لیے سرگرداں۔“

وہ نہایت ہلکے ہلکے انداز میں بول رہا تھا اور حبیب بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔ اس کا آخری جملہ سنتے ہی حبیب کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”گلدہنتی رہا کرو تم مجھے ایسے ہی اچھی لگتی ہو۔“ اس کی ہلکی ہلکی سرخ آنکھیں اور بکھرے گولڈن بال، شاہ زین کو ایسا محسوس ہوا جیسے اگر وہ کچھ دیر اور یہاں کھڑا رہا تو شاید خود پر اپنا ضبط کھودے۔

”بہت رات ہوگئی ہے سو جاؤ اب تم بھی۔“

اسے ہدایت دے کر وہ وہاں رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چند ہی لمبے میں اس کی نگاہوں سے اوچھل ہو گیا۔



”یہ میرے کپڑے ہیں پیک کرو جمعرات کی شام میں عمرے پر جا رہا ہوں۔“

ہجن کے دروازے پر کھڑے فرہاد نے مجھے ایسے اطلاع دی جیسے وہ دودن کے لیے کسی دوسرے شہر جا رہا ہو، حالانکہ یہ مجھے دودن قبل فضلہ بھابی بتا چکی تھیں کہ یا سمین فرہاد کے ساتھ عمرے پر جا رہی ہے پھر وہاں سے دودن صباحت کی طرف دہنی

جائیں گے مگر، میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ وہ ہمیشہ سے ہی ایسی بے پَر کی اڑانے کی عادی تھیں لیکن اب فرہاد کے بتانے کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہی۔

”کم از کم مجھے بتانا تو چاہیے تھا کہ، میں عمرے پر جا رہا ہوں یہ کیا چھپ چھپا کر ساری تیاری کر لی اور جانے سے پہلے ایسے اطلاع دی جیسے کسی غیر کو بتایا جائے۔“

اس کے ہاتھوں میں موجود کپڑے کا تھملا تھامتے ہوئے شکوہ خود بخود میری زبان سے پھسل گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری تیوری پر چند بل ابھر آئے۔

”یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے وہ جب اپنے بندوں کو بلا لے اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات ہے نصیب والے اس کے در پر جاتے ہیں۔“ فخریہ لہجہ۔

میں جو کہنا چاہتی تھی وہ فرہاد کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا اسی لیے مزید بحث کرنے سے اچھا تھا خموشی اختیار کر لی جائے۔

”جانا تو یاسمین آپا نے تھا لیکن ان کی بدولت میرا بھی سبب بن گیا، انہیں محرم کا مسئلہ تھا اسفند اور صمد بھائی دونوں نے ہی منع کر دیا۔ جانتی ہونا وہ تو اپنی اپنی بیویوں کے بغیر جاتے ہی نہیں ہیں، اب ایسی بھی کیا عورت کی غلامی کہ بندہ کسی کام کا ہی نہ رہے۔ کتنے عرصہ سے صمد نال رہا تھا کہ صباحت بھابی فارغ ہوں تو سب چلیں گے مگر، نہ وہ فارغ ہوئیں اور نہ ہی صمد نے ہاں کی۔ بے چاری ان کے انتظار میں بیٹھی تھیں تو، میں نے سوچا کیوں نہ میں ہی چلا جاؤں حالانکہ انہوں نے مجھ سے کہا بھی نہیں تھا یہ تو ثواب کا کام ہے جس کے بھی حصہ میں آ جائے۔“

جانے وہ کیا کیا بول رہا تھا مجھ میں اب مزید سننے کی تاب نہیں تھی اس لیے میں نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔

”مجھے اپنے سارے کپڑے نکال دو میں بیک کر دوں۔“ مجھے اس کی کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ کیا، کیوں اور کب جا رہا تھا اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔

”ایک تو میں جب بھی کہیں جانے لگوں تمہارا موڈ پہلے ہی آف ہو جاتا ہے شکر نہیں کرتیں کہ، اللہ تعالیٰ نے مجھے عمرے کی سعادت کے قابل سمجھا لیا منہ بنالیا تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو یہ سب سن کر خوش ہو جاتی۔“

میں اس کی تمام باتوں کو نظر انداز کر کے اندر کمرے میں آ گئی کیونکہ میرا موڈ اس وقت کسی بات پر بھی فرہاد سے الجھنے کا نہ تھا۔



”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ایسا؟“

وہ جب سے نازیہ آنٹی کے گھر سے آیا تھا ایسا ہی کھویا کھویا سا تھا کہ اریشہ سے برداشت نہ ہوا اور اس نے ٹوک ہی

دیا۔

”نہیں سر میں بہت شدید درد ہے۔“

اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں، وہ جھوٹ بول رہا تھا اس بات کا اندازہ اریشہ کو ہو چکا تھا۔

”ایسا!.....“

اس نے ایک بار پھر اسے پکارا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“

اب وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔
 ”ممانے کسی لیڈی ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ لیا ہے۔“
 ”اچھا تو تم چلی جانا۔“
 جواب دے کر اس نے ایک بار پھر سے کروٹ بدل لی۔
 ”مجھے اکیلے نہیں جانا تمہیں بھی میرے ساتھ جانا ہے وہ تمہارا چیک آپ بھی کریں گی۔“
 اریشہ نے ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے ڈریسنگ کے شیشہ سے اس کی جانب دیکھا جو بدستور آنکھیں موندے لیتا تھا۔
 ”مجھے کسی چیک آپ کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”لیکن ایصال تمہیں ایک دفعہ تو ڈاکٹر کے دیئے ہوئے سارے ٹیسٹ کروانے چاہئیں اس میں آخر برائی کیا ہے جو تم ہر بار منع کر دیتے ہو۔“
 اسے ایصال کا انکار کرنا ہمیشہ سے زیادہ برا لگا۔
 ”مجھے نیند آرہی ہے لائنٹ بند کر دو۔“
 یہ اس کی بات کا جواب نہیں تھا، مگر اس وقت وہ مزید کوئی بات کر کے اس سے الجھنا نہ چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اٹھ کر لائنٹ بند کر دی۔



”ہمیں معاف کر دو حبیبہ ہم تمہارے گناہ گار ہیں ساری زندگی ہم نے عیش و عشرت میں گزاردی اور کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا ہماری ماں اور بہن کن حالوں میں زندہ ہیں۔“
 جاذبہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے معافی مانگی۔
 ”مجھے آپ لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں اور جہاں تک میں سمجھتی ہوں ان حالات میں ہر شخص اپنی جگہ درست تھا۔“ اس کا سپاٹ لہجہ بالکل پُر سکون تھا۔
 ”میں تو سمجھ دار تھی جانتی تھی کہ میری ماں کن حالات میں زندگی بسر کر رہی ہے پھر بھی وقت پڑنے پر دوسروں کے ساتھ شامل ہو گئی۔ ان سنگسار کرنے والوں کے ساتھ جن کے ہاتھوں میں نوکیلے پتھر تھے۔“
 مریم آپا کے لہجہ میں تاسف چھلک رہا تھا۔
 ”اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں مریم آپا، وقت سب کچھ روند کر گزر گیا۔“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھل گئی۔
 ”میری ماں آپ سب کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے تڑپتی اس دنیا سے چلی گئی۔ ان کے کان آپ کی آواز سننے کے خواہش مند تھے۔ مجھے تو خیر آپ لوگوں نے کبھی اپنی سگی بہن نہ سمجھا مگر معاف کیجئے گا، وہ تو آپ کی سگی ماں تھیں تاکتنا سمجھایا تھا آپ لوگوں کو سالار انکل نے مگر، آپ دونوں نے وہ کیا جو ففہ تائی نے چاہا اور ان کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنی سگی ماں سے ہر ناطہ توڑ لیا۔“

”ناطہ ہم نے نہیں توڑا تھا حبیبہ.....“

جاذبہ کے لہجہ میں شکوہ ابھرا۔

”وہ ہمیں چھوڑ کر گئی تھیں بالکل بے یار و مددگار اور بے آسراء جانتی تھیں کہ ہمارے باپ کو ہم سے کوئی سروکار نہ تھا۔“

ہمارے لیے تو سب کچھ ہماری ماں ہی تھی ہمارے ہر دکھ درد کی ساتھی پھر کیوں اس نے ہمارے ساتھ یہ سب کیا، صرف ہمارے باپ سے انتقام لینے کی خاطر، اسے نیچا دکھانے کے لیے ہم سب کو برباد کر دیا۔ تم فطرتاً ہی کوکتا بھی برا سمجھو مگر سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لیے سب کچھ وہ ہی ہیں انہوں نے ماں نہ ہوتے ہوئے بھی ہمیں ماں بن کر پالا۔“

”سچ تو یہ ہے جاذبہ باجی کہ کئی دفعہ ہماری زندگی میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جس کے لیے ہم کوئی پلاننگ نہیں کرتے۔ جہاں تک میں سمجھتی ہوں زندگی پلاننگ سے نہیں گزرتی، اس کا تو کام گزرتا ہے اور یہ گزرتی چلی جاتی ہے۔ کئی دفعہ تو ہنا سوچے سمجھے وہ سب ہو جاتا ہے جو ہماری قوت فیصلہ کو ختم کر دیتا ہے اور ہم ایک مشین کی مانند وہ سب کرتے چلے جاتے ہیں جو کرنا نہیں چاہتے اور شاید اسی کو نصیب کہتے ہیں۔“

وہ ذرا کی ذرا سانس لینے کے لیے رکی۔

”یہ سب کچھ کہنے کا میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اماں کی وکالت کر رہی ہوں یا یہ کہ اماں نے جو کیا صحیح کیا، میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ دونوں کی طرح میں بھی فرہادی کی بیٹی ہوں آپ کی سگی بہن اور میرا مقصد صرف یہ ہی ثابت کرنا ہے آپ لوگوں نے جو کچھ میرے لیے دوسروں سے سنا دہ محض من گھڑت تھا سچ وہ ہے جو میں آپ دونوں کو بتا رہی ہوں۔“

بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

اس کے الفاظ دونوں کو شرمندہ کر گئے، سچ تو یہ تھا کہ اب ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہ تھا یہ سب تو زینب کی موت کے ساتھ ہی شاید ختم ہو گیا تھا۔



”ایشال اس دن کے بعد آپ سے نہیں ملا۔“ نازیہ نے سالار کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں اور مجھے حیرت ہے صدر نے بھی اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“ نازیہ کی بات بنا کہے ہی وہ سمجھ چکا تھا۔

”تو پھر آپ کو خود انہیں فون کر کے پوچھنا چاہیے تاکہ معاملہ ایک طرف ہو اور ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔“

”ٹھیک ہے میں کل ہی دونوں کو فون کرتا ہوں۔“ سالار اس کی بات سے متفق ہوتا ہوا بولا۔

”یہ جیب کہاں ہے شام سے دکھائی نہیں دے رہی۔“

”گھر ہی میں ہے، آج مریم اور جاذبہ اس سے مل کر گئی ہیں جب سے ہی ڈسٹرب ہے اب تو میرا خیال ہے سو گئی ہے۔“

”اللہ تعالیٰ اب اس کی تمام مشکلات جلد از جلد آسان کرے اور اس سلسلے میں کی جانے والی ہماری کوششوں کو کامیاب فرمائے۔“

سالار نے اٹھتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے اس کے حق میں دعا کی۔

”آمین۔“

جواباً نازیہ نے صدق دل سے آمین کہا۔



رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ایشال کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی کروٹ بدل کر اپنے قریب

لیٹی اریٹھ پر ایک نظر ڈالی۔ ایک دم اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اریٹھ کا وجود حبیبہ کی صورت میں ڈھل گیا ہو وہ چونک اٹھا جلدی سے قریب رکھا موبائل اٹھا کر آن کیا، اس کی روشنی میں ایک بار پھر اریٹھ کا جائزہ لیا تاکہ اس کے نقوش واضح ہو سکیں جو حبیبہ کے تصور میں کہیں کھو گئے تھے وہ اٹھ بیٹھا۔

”پتا نہیں یہ مائیں اولاد کی اس قدر برین واشنگ کیوں کرتی ہیں۔ جب پاپا نے میرا نکاح حبیبہ سے کیا تھا تو کیا ضرورت تھی ماما کو بلا وجہ بہکانے کی انہیں پاپا کا ساتھ دینا چاہیے تھا نہ کہ مجھے غلط راستے پر ڈال کر بلا وجہ حبیبہ بے چاری کی زندگی برباد کی۔“

اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر ڈالنا اس کی پرانی عادت تھی جس میں اسے کمال حاصل تھا۔
”میری بات ہے ایشال، اپنی کسی بھی غلطی کا ذمہ دار دوسروں کو مت ٹھہراؤ مان جاؤ دونوں بار تصور تمہارے دل کا ہی تھا۔“

اس کے دماغ نے اسے سرزنش کی، وہ اٹھ بیٹھا، جانتا تھا کہ اب نیند نہیں آئی، اپنے پاس رکھا سگریٹ کا پیکٹ لیے وہ باہر ٹیرس میں آ گیا کمرے کی گھٹن سے باہر نکلتے ہی اسے قدرے سکون ملا۔
”اب پتا نہیں یہ سالارا نکل مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے خود سے سوال کیا۔
”مجھے یہاں اب مزید نہیں رکنا چاہیے لندن واپس چلے جانا چاہیے تاکہ وہاں کوئی مجھ سے وہ ڈیمانڈ نہ کرے جو میرے لیے پورا کرنا ابھی فی الحال ممکن نہیں رہا۔“

اس نے ریت میں سر ڈال کر زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔
”لیکن کب تک، آخر تو مجھے کوئی ایک فیصلہ کرنا ہی ہوگا پھر اس قدر گھبرانے یا ڈرنے والی کیا بات ہے، میری زندگی ہے اور مجھے جو بہتر لگے وہ سب سے کہہ دینا چاہیے۔“

اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا اور وہ وہیں ٹیرس پر موجود کرسی پر بیٹھ گیا۔



میں جیسے ہی میز میوں سے نیچے اتری صحن میں رکھی چار پائی پر موجود رنگ برنگے کپڑے دیکھ کر وہیں رک گئی۔
”یہ سب کس کے ہیں؟“

میں نے چار پائی کے قریب کھڑے فرہاد کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”یہ یاسمین آپا کے ہیں میرے بیک میں ہی رکھ دو۔“

اس نے تمام کپڑے قریب موجود شا پر میں ایک ایک کر کے ڈال دیئے اور پھر وہ پلاسٹک کا تھیلا میری جانب بڑھایا۔
”سعودیہ میں بہت گرمی ہے، صدمہ نے بتایا ہے کہ وہی بھی خاصا گرم ہے اس لیے ہلکے کپڑے لے کر آنا سو، آپا نے مجھے فون کیا کہ ان کے لیے کچھ کپڑے لے کر سلوالوں۔ ان کے شوہر کا تو تمہیں پتا ہی ہے عجیب ڈھیٹ سا آدمی ہے بیوی پر ایک روپیہ خرچ کرنا گناہ سمجھتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اس نے عمرے کی مد میں خرچ ہونے والی رقم جانے کیسے دے دی، اسی لیے میں نے آپا کو منع کر دیا تھا کہ اب مزید اس سے کچھ نہ مانگے ایسا نہ ہو کہ بلا وجہ کا فساد کھڑا کر دے۔“

میرے سوال کا جواب خاصا تفصیلی تھا جسے سنتے ہی نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آ گیا۔
”مگر میاں صرف سعودیہ یا وہی میں نہیں آتیں، یہاں بھی آتی ہیں مجھے اور بچیوں کو بھی اتنی ہی گرمی لگتی ہے جتنی یاسمین

آپا کو، تمہارا فرض تھا فرہادان کی شاپنگ کرتے وقت ہمیں بھی یاد رکھتے۔“

”ارے اس میں اتنا غصہ ہونے والی کیا بات ہے۔“ وہ حیران ہوا۔

”اس گھر میں جو کچھ ہے سب تمہارا ہے میں نے تو تم سے کبھی کسی بات کا حساب نہیں مانگا۔ تمہارا جودل چاہے کھاؤ، جیسے دل چاہے استعمال کرو، تمہارے گھر سے کوئی آئے کوئی جائے میں نے کبھی سوال نہیں کیا اور جہاں میں اپنی بہن پر ایک روپیہ خرچ کر دوں وہاں تم لڑنے جھگڑنے لگتی ہو کم از کم اتنا تو احساس کیا کرو کہ میری ایک ہی بہن ہے۔“

حسب معمول اسے بہت برا لگا، جھنگلی سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے۔

”اس گھر میں ہے ہی کیا جو میں استعمال کرتی ہوں یا اپنے گھر والوں پر لٹا دیتی ہوں اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو میرے گھر والے یہاں آ کر ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھاتے۔“

”دراصل تم ایک ناشکری عورت ہو۔“

دھیما لہجہ اور سخت الفاظ ہمیشہ سے اس کا وطیرہ رہے۔

”اور تم جیسی عورت کبھی کسی کا احسان نہیں مان سکتی تمہارے لیے کچھ بھی کر لوں تم ساری زندگی ایسی ہی رہو گی۔“

کپڑے کا تھیلا اٹھائے وہ اندر چل دیا۔

”ایسا کون سا احسان ہے تمہارا مجھ پر کوئی شوہر اپنی بیوی پر نہیں کرتا سوائے تمہارے۔“ لاکھ کوشش کے میرا غصہ کم نہ

ہوا۔

”دراصل زینب تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم دوسروں سے جنٹلس ہو جاتی ہو، چاہے وہ فضا بہابی ہوں یا یاسمین آپا، تمہیں

تکلیف صرف یہ ہے کہ میں اپنی بہن کے ساتھ عمرہ کرنے کیوں جا رہا ہوں۔“ اس کا سلگتا لہجہ جو مجھے سر تا پا آگ کر گیا۔

”ایک مسلمان ہونے کے ناطے صرف پانچ وقت کی نماز، تہجد، عمرے، حج تم پر فرض نہیں ہے فرہاد میرے بھی کچھ حقوق

ہیں جن کے تم ذمہ دار ہو۔“

میں حلق کے بل چلائی اور بھول گئی مریم سامنے کمرے کے دروازے منہ کھولے کھڑی مجھے ہی تک رہی ہے۔

”اپنی آپا کا تمہیں ساری زندگی خیال رہا میرا کوئی احساس ہے تمہیں میرے کسی بھی گناہ ثواب کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی

بھی ایسا گناہ جو تمہاری غفلت کے باعث مجھ سے سرزد ہو اس کا حساب کون دے گا کبھی سوچا ہے تم نے یہ۔“ میں رونے لگی۔

”میں جب بھی کوئی نیکی کا ارادہ کرتا ہوں تم اسے ہمیشہ اسی طرح ہی رد وحو کر برباد کرنے کی کوشش کرتی ہو۔“

کپڑوں کا تھیلا اندر کمرے میں پھینک کر وہ باہر نکل گیا۔

”لعنت ہے مجھ پر جو سب کچھ ہوتے ہوئے ایسے بے فیض مرد کے ساتھ اپنی زندگی برباد کر رہی ہوں، سالار تو مجھ سے

دور ہو گیا لیکن وجاہت کو اب میں کبھی نہیں چھوڑوں گی چاہے اس کے لیے مجھے سب کچھ چھوڑنا پڑے۔ میں دکھاؤں گی اس

فحش کو کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو میری قدر کرتے ہیں، مجھ سے محبت کرتے ہیں۔“

میں آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، کپڑوں کا تھیلا وہیں فرش پر پڑا تھا جسے میں نے ہاتھ بھی نہ لگایا، الماری میں

کپڑوں کے نیچے ایک موبائل موجود تھا جو مجھے وجاہت نے دیا تھا جس کا نمبر صرف اس کے پاس تھا لیکن آج تک میں نے

خود اسے فون نہیں کیا تھا۔ اب فرہاد کے رویہ نے مجھے اتنا تاؤ دلایا کہ میں نے باہر دروازے کی کنڈی لگائی موبائل نکالا اور

وجاہت کا نمبر ملانے لگی تاکہ اس سے بات کر کے اپنی فرسٹریشن دور کر سکوں فرہاد کا رویہ میرے اندر سرکشی کو ابھار رہا تھا جس کی

کوئی پروا اب مجھے بھی نہ رہی تھی۔



”میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے پاپا۔“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے صدر کے سامنے کھڑا تھا۔

”کون سا ارادہ۔“

اس نے بات اتنی اچانک شروع کی تھی کہ صدر کو سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

”میں حبیبہ کو طلاق نہیں دوں گا۔“

اس کے لہجہ کی سختی چہرے پر بھی ڈر آئی۔

”واٹ.....؟“

اس کی بات سنتے ہی صدر کو ایک جھٹکا سا لگا۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ہوش میں ہو تم جانتے ہو..... تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”شکر الحمد للہ میں باقائمی ہوش و حواس آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے حبیبہ کو طلاق نہیں دینی وہ میری منکوحہ ہے اور زبردستی کوئی بھی مجھے اس بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتا کہ میں حبیبہ کو طلاق دوں یہاں تک کہ آپ بھی نہیں۔ میں عاقل و بالغ ہوں اور اپنے ہر فیصلے کا اختیار قرآن و سنت کی رُو سے میرے پاس ہے۔“

”بھاڑ میں گئے تم اور تمہارے فیصلے، تم نے تو زندگی کو ایک مذاق بنا لیا ہے۔ تمہارا ہر فیصلہ صرف تمہاری اپنی ذاتی اُنا کے لیے ہے۔ دوسروں کا احساس تو تم میں قطعی ختم ہو گیا ہے۔ شرم آئی چاہیے تمہیں دوڑ کیوں کی زندگی اپنے ہاتھوں برباد کرتے ہوئے۔“ غصہ سے ان کا سانس تیز ہوا۔

”آپ بھول گئے شاید.....“

اس پر صدر کے غصہ کا قطعی کوئی اثر نہ ہوا۔

”ہمارا مذہب ہمیں چار شادیوں کی اجازت دیتا ہے اور حبیبہ سے اپنی شادی برقرار رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں خدا نا خواستہ اریشہ کو چھوڑ رہا ہوں، میں اتنا کماتا ہوں کہ دو بیویوں کی کفالت کر سکتا ہوں۔“

اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ صدر کی جانب نکلتے ہوئے بولا۔

”تم جانتے ہو کہ چار شادیوں کی اجازت کن شرائط کے تحت ہمارے مذہب نے دی ہے۔“

صدر اس کے مقابل آن کھڑے ہوئے۔

”ہاں میں نے اپنے دین کا مکمل طور پر مطالعہ کیا، پھر ایک عالم دین سے ملاقات کی اور اس کے بعد آپ تک آیا۔“ وہ بالکل مطمئن لہجہ میں بولا ایسے جیسے سارے فیصلے کر کے آیا ہو۔

”اگر آپ کو خدشہ ہو کہ آپ کی نسل آگے نہیں بڑھ سکتی اور آپ کی بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس صورت میں آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ دونوں کے برابری حقوق ادا کرنے کے قابل ہوں۔ میں اپنی نسل آگے بڑھانا چاہتا ہوں اس لیے حبیبہ کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنا میری ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ ساری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔“

یہ کہہ کر وہ ہاں رکنا نہیں اور تیزی سے چلتا باہر نکل گیا۔ اس کے کیے گئے فیصلہ نے صدر کو اپنی جگہ ساکت کر دیا انہیں ایسا

محسوس ہوا کہ اب شاید وہ بٹنے جلنے کے قابل بھی نہیں رہے۔ انہیں افسوس ہوا کیوں بلا وجہ ایک ایسی شرط رکھی جس نے زندگی کے اس مقام پر آکر انہیں ایک ایسے دوراہے پر لاکھڑا کیا جس کے دونوں طرف سوائے موت کے کچھ بھی نہ تھا۔



”کیا مصیبت ہے نہ بے تھوڑا ذرا پیچھے ہو کر لیٹو ایک تو گرمی اس قدر ہے نیند ہی مشکل سے آتی ہے اور جو آئی وہ تم نے ہاتھ مار کر خراب کر دی۔“

میں گہری نیند میں تھی جب فرہاد نے مجھے کندھا پکڑ کر بلایا۔ اس کا موڈ سخت خراب تھا شاید میرا ہاتھ گلنے سے اس کی نیند خراب ہو گئی تھی، میں یک دم ہی شرمندہ سی ہو گئی ایک ہل میں ایسا لگا جیسے بیڈ کے دوسرے سرے پر کوئی اجنبی لیٹا ہو، میں فوراً بیڈ کے کنارے پر ہو گئی، فرہاد کروٹ لے کر مزید دور ہو گیا اپنی نیند خراب ہونے پر وہ ابھی بھی بڑبڑا رہا تھا۔

مجھے بہت ہی عجیب لگا اس کے اس رویہ نے مجھے ایک بار پھر دل برداشتہ کر دیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے تکیہ اٹھایا اور نیچے فرش پر آ لیٹی، اس کے بعد ساری رات مجھے نیند ہی نہ آئی، اپنی توہین کے احساس نے مجھے سونے ہی نہ دیا اور اس کے بعد آنے والی ہر رات میرا اس بستر سے دل اچاٹ ہو گیا، بے شک مجھے فرش پر نیند نہیں آتی تھی مگر میں نیچے تکیہ رکھ کر سونے کی عادی ہونے لگی۔

حسب روایت مجھ میں آنے والی اس تبدیلی کا فرہاد پر کوئی اثر نہ ہوا شاید کچھ لوگ پتھر کی مانند ہوتے ہیں جن پر زمانے کے سرد گرم اثر انداز نہیں ہوتے۔



”آجائیں آنٹی میں بالکل ریڈی ہوں۔“

حبیبہ کی آواز سن کر شاہ زین نے جو پلٹ کر دیکھا تو پلکیں جھپکنے لگیں بھول گیا۔ رائل لیوڈریس میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

”ہاں بس تمہارے انکل کا ویٹ کر رہی ہوں جانے کہاں رہ گئے۔“

نازیہ نے اپنی ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے حبیبہ کا مکمل جائزہ لیا۔ آج حنظلہ کے بیٹے کی سالگرہ تھی جس میں مریم نے اسے بڑے دل سے مدعو کیا تھا، ویسے بھی وہ جب سے آئی تھی اس کی فضلہ تائی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالیہ ہونے والے فاج کے باعث وہ کہیں بھی آنے جانے سے قاصر تھیں اور اب وہ بھی حبیبہ سے ملنے کو بے تاب تھیں، جس کی اطلاع اسے مریم اور صباحت آنٹی دونوں دے چکی تھیں۔ جبکہ وہ خود بھی فضلہ تائی کو دیکھنا چاہتی تھی ان سے ملنا چاہتی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے مریم کو ایک بار بھی منع نہیں کیا اور ٹائم پر تیار ہو کر نیچے آ گئی۔

”آپ نے فون نہیں کیا؟ انہیں یاد کروائیں ہو سکتا ہے بھول گئے ہوں۔“

بمشکل اس سے نظریں ہٹا کر شاہ زین ماں کی طرف متوجہ ہوا۔

نازیہ نے بنا کوئی جواب دیئے ہینڈ بیگ کے پاس رکھا اپنا سیل اٹھایا اور سالار کا نمبر ملائے لگی۔

”مجھے یقین ہے آج اس محفل میں تم سے زیادہ حسین کوئی نہ ہوگا۔“ شاہ زین نے سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے اسے سراہا۔

”میں نے سنا ہے اماں بھی جب کسی خاندانی تقریب میں جاتی تھیں تو وہاں ان سے زیادہ حسین کوئی اور نہ دکھتا تھا یا

شاید سب حسین ان کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔“

وہ ایک بار پھر سے ماضی کی یادوں میں گم ہو گئی۔
 ”گاڑی نکالو شاہ زین ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“
 نازیہ آنٹی کی آواز اسے ہل بھر میں ماضی سے حال کی طرف کھینچ لائی۔
 ”کیوں انکل ہمارے ساتھ نہیں جا رہے؟“ اس نے حیران ہوتے ہوئے نازیہ کی جانب دیکھا۔
 ”وہ کسی میٹنگ میں ہیں فارغ ہو کر سیدھے وہیں آ جائیں گے۔“
 نازیہ نے شیشے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے اسے اطلاع دی اور وہ ان کی تقلید میں باہر آ گئی جہاں شاہ زین گاڑی اشارت کیے اس کا منتظر کھڑا تھا۔



”تم کہاں سے آرہی ہو؟“
 مجھے تیار جی سنوری دیکھ کر فرہاد کو اچنبھا ہوا اس لیے وہ پوچھے بنا نکلیں رہ سکا۔
 ”فائزہ کے ساتھ اس کی بہن کے گھر گئی تھی۔“
 اسے قطعی نظر انداز کرتی میں اندر کمرے میں آ گئی وہ بھی میرے پیچھے چلا آیا۔
 ”جانے سے پہلے روٹی تو پکا جاتیں کب سے بھوکا بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“
 ”ہوٹل سے لے آتے۔“ مختصر جواب دے کر میں نے الماری کھولی تاکہ کپڑے تبدیل کر سکوں۔
 ”تم نے یہ سوٹ کب بنوایا؟“
 شاید اسے خیال آ گیا تھا کہ میرے تن پر موجود لباس اس کا خریدا ہوا نہیں ہے، اس کے تجزیہ نے مجھے حیران کیا میں جو ہمیشہ سمجھتی رہی کہ فرہاد نے مجھ پر کبھی توجہ نہ دی، آج مجھے اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی۔
 ”پچھلی بار جب میں گھر گئی تھی اماں نے کچھ رقم دی تھی اس میں سے ہی فائزہ کے ساتھ شاپنگ پر جا کر یہ سوٹ خریدا تھا۔“
 ”خیریت ہے تمہاری اماں بھی تمہیں کپڑوں کے لیے کچھ دیتی ہیں آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔“ وہ تھوڑا سا مٹکوک ہوا۔

”اپنے پیسے کن لو ان میں سے کچھ نہیں لیا۔“
 فرہاد کا شک محسوس کرتے ہی تلخ ہوئی اور بنا اس کا جواب سنے ونگر سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں گھس گئی، ویسے بھی اب میں نے اس کی باتوں کا اثر لینا چھوڑ دیا تھا۔



وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی وہاں کی جج دھج دیکھ کر حیران رہ گئی ایک ہل کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جیبہ نہیں بلکہ معمولی لباس میں ملبوس زینب ہو، جیسے وہاں موجود ہر شخص پر غرور نگاہوں سے گھور رہا ہے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا کاش ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ ہوتا، جس سے ہم ہر عورت کے اندر چھپے احساسات کو جانچ سکتے تو ہمیں پتا چلتا کہ اپنی فیملی کے اعتبار سے دنیا کی ہر عورت دوسری سے مختلف ہے تو شاید ہم کسی ایک عورت کو دوسری عورت کی مثال دینے سے گریز کرتے۔
 ”ارے وہاں کیوں کھڑی ہو آگے آؤ تمہیں فضلہ بھابی سے ملو اؤں۔“

اک ساگر ہے زندگی

اسے اپنی جگہ ساکت کھڑا دیکھ کر مریم تیزی سے اس کی جانب آئی اور حبیبہ اس کی ہمراہی میں قدم گھسیٹتی اس جانب چل دی جہاں جیل چیز پر موجود تائی اس عمر اور بیماری میں بھی ایک شان بے نیازی کے ساتھ موجود تھیں۔ وہیل چیز کے پیچھے کھڑی خاتون غالباً ان کی ملازمہ تھی جس کی نشاندہی اس کا لباس کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تائی کے لیے اورنج جوس اور ٹشو پیپر تھا جس سے وہ بار بار تائی کا منہ صاف کر رہی تھی۔ حبیبہ کی ذہنی رو بہک کر پھر وہاں چلی گئی۔

جہاں اس کی ماں بے یار و مددگار بستر پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ تو کیا اس کی ماں دنیا کی واحد گناہ گار عورت تھی، جسے اتنی سخت سزا کے عمل سے گزرنا پڑا یا شاید آخرت کے عذاب سے وہ پکڑ بہتر ہے، جو دنیا میں ہی ہو جائے کم از کم یہ احساس تو رہتا ہے کہ ہم اپنے اللہ کو یاد ہیں وہ ہمیں بھولا نہیں ورنہ ہماری رسی دراز کر دیتا۔

”تائی یہ حبیبہ ہے میری چھوٹی بہن۔“

اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مریم آپا نے اسے تائی کے سامنے لا کھڑا کیا۔

”ہاں میں پہچان گئی یہ ہو، ہونہب جیسی ہے سوائے ایک چیز کے۔“ حبیبہ چونک گئی وہ جانے کیا کہنے والی تھیں۔

”اس کی آنکھیں بالکل اپنے باپ جیسی ہیں اللہ بخشنے فرما دی آنکھیں بھی اتنی ہی خوب صورت تھیں۔ وہ مرد تھا اس لیے

اس کی آنکھوں کا بھورا رنگ اتنا نمایاں نہ ہوتا تھا جتنا حبیبہ کا ہو رہا ہے۔“

تائی نے رک رک کر بمشکل اپنے الفاظ مکمل کیے۔ فالج کے باعث ان کی بولنے کی صلاحیت خاصی متاثر ہوئی تھی جس کا اندازہ حبیبہ کو ابھی ابھی ہوا۔ اس نے اپنا سر تائی کے سامنے جھکا دیا کیونکہ وہ اس وقت اس ماحول میں کچھ بھی کہنے کی صلاحیت شاید کھو چکی تھی اس کا ماضی اس پل اس کے بالکل ساتھ آن کھڑا ہوا تھا۔

”جیتی رہو اللہ نصیب اچھا کرے۔“ تائی نے اپنا لرزنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر دعا دی۔

”آمین.....“

آہستہ آواز میں کہتی وہ وہاں سے ہٹ گئی۔ اس فنکشن میں اسے ایصال اور اریٹھ نظر نہ آئے۔ مریم نے بتایا ان دونوں نے اپنے کسی دوست کے گھر انوائٹ ہونے کے باعث یہاں آنے سے معذرت کر لی تھی، سالار انکل بھی خاصے لیٹ پہنچے۔ حبیبہ نے دیکھا وہ اور انکل صد ایک دوسرے کے برابر بیٹھے آہستہ آہستہ جانے کیا گفتگو کر رہے تھے اسے محسوس ہوا جیسے اس گفتگو کا محور اس کی ذات ہو۔ اس نے ایک دو بار جب بھی نگاہ اٹھا کر دیکھا انکل سالار کو اپنی طرف بھی متوجہ پایا۔

وہ کچھ الجھ گئی اسے سالار انکل کچھ پریشان دکھائی دیے کیوں، وہ جان نہ پائی۔ گھر واپسی میں بھی سالار انکل سارے راستے خاموش سے تھے ایک دو بار نازیہ آنٹی نے پوچھا مگر کوئی جواب نہ پا کر چپ کر گئیں۔

”کیا بکواس ہے یہ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس کا۔“

شاہ زین کی تیز آواز سن کر وہ وہیں بیڑھیوں کے سرے پر رک گئی۔ نیچے لاؤنج میں نازیہ آنٹی اور سالار انکل کے ساتھ مریم اور شاہ زین بھی موجود تھے، اسے سمجھ نہیں آیا کہ نیچے کیا بات ہوئی ہے جس نے شاہ زین کو اتنا چرغ پا کر دیا ہے وہ اپنے بڑوں کا لحاظ بھی بھول بیٹھا۔

”پلیز شاہ زین آہستہ بولو وہ سن لے گی۔“

مریم آپا کی دھیمی آواز کان سے ٹکراتے ہی وہ سمجھ گئی کہ محور گفتگو اس کی اپنی ذات ہے۔ وہ بے اختیار ہی تھوڑا سا پیچھے کی جانب ہو گئی تاکہ اس وقت کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔

”واٹ.....“

شاہ زین کی قہر زدہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”وہ ہستی جس کی ذات کو ایک شخص نے محض اپنی آنا کی تسکین کے لیے تماشا بنا دیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے بھی کچھ پتا نہ چلے، حد ہے مریم آپا، کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اسے اعتماد میں لیے بغیر ہی ہم سارے مسئلے کو حل کر دیں۔“ وہ مریم آپا سے مخاطب تھا۔

”میرا کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہمیں پہلے ایصال کو سمجھانا چاہیے اسے قائل کرنا چاہیے تاکہ وہ ہماری بات مان سکے اگر ایسا نہ ہو تو پھر اگلے قدم کے طور پر حبیبہ کو سب کچھ بتانا پڑے گا تاکہ پتا چلے کہ وہ کیا چاہتی ہے۔“

”مجھے سب پتا ہے وہ کیا چاہتی ہے، اسے ایصال سے خلع لینا ہے اور بس۔ وہ وقت گزر گیا مریم آپا جب وہ ”طلاق“ جیسے لفظ کے خوف میں صرف اس لیے جکڑی ہوئی تھی کہ اس کی ماں کی تربیت پر حرف نہ آئے۔ اب میری محبت نے اسے وہ اعتماد بخش دیا ہے کہ وہ برے حالات کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کل کورٹ میں خلع کے کاغذ جمع کروا دیئے جائیں۔ مجھے امید ہے میرے اس فیصلے پر آپ سب کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

سب کے سامنے شاہ زین کا اعتراف محبت اسے اعتماد بخش گیا۔

”تم جو کہہ رہے ہو بے شک وہ سب ٹھیک ہے بیٹا مگر خلع کی درخواست جمع کروا دینا ہمارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

سالارا نکل کو بولنا پڑا۔

”اگر ایصال نے کورٹ میں آکر حبیبہ سے صلح پر آمادگی ظاہر کی تو ہمیں اس کی بات سننا پڑے گی کوئی بھی عدالت ایک دم اپنا فیصلہ نہیں سناتی اور پھر عدالت میں جا کر ذلیل ہونے سے اچھا ہے کہ گھر کی بات گھر میں ہی ہو جائے۔“

”لیکن انکل جب میں اس سے صلح نہیں کرنا چاہتی جب میں اس سے طلاق چاہتی ہوں تو پھر زبردستی کیسی۔“

حبیبہ سے اب مزید برداشت نہ ہوا اور وہ بیڑھیوں اتر کر سب کے درمیان آ گئی۔

”تم لوگ ابھی بچے ہو شرعی نزاکتوں کو نہیں سمجھتے۔“

سالارا نکل جیسی آواز میں بولے جبکہ نازیہ آنٹی بالکل خاموش بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

”مجھے ایک دفعہ ایصال سے بات کرنے دو اگر وہ آمادہ نہ ہو تو پھر ہم کوئی اگلا قدم اٹھائیں گے۔“

○.....◆.....○

آج دس دن ہو گئے تھے فرہاد کو گئے ہوئے۔ خرچے کے نام پر جو معمولی رقم وہ مجھے دے کر گیا تھا، اس میں سے چند سو میرے پاس باقی بچے تھے حالانکہ میں بہت سوچ سمجھ کر پیسہ خرچ کر رہی تھی پھر بھی اس کے جاتے ہی جاؤ کہ کو بخار ہوا دس دن وہ ڈاکٹر کے پاس گئی اب حبیبہ کی طبیعت خراب تھی وہ دانت ٹکانے کے عمل سے گزر رہی تھی میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا ابھی شاید اس کے آنے میں مزید دس دن باقی تھے۔

”میرا خیال ہے کہ اماں کو فون کروں کہ وہ احسان کے ہاتھ کچھ رقم بھیج دیں۔“

دوسرے ہی پل میں نے دل میں آئے اس خیال کو رد کر دیا۔ مجھے عجیب سا لگا اگر احسان کی بیوی کو پتا چلا تو وہ کیا سوچے گی جو بھی ہے، مجھے ان ہی پیسوں میں گزارا کرنا ہے۔ سادہ یہ بھی اپنی نند کے پاس گاؤں گئی ہوئی تھی ورنہ اتنا مسئلہ نہ ہوتا وہ تو اکثر ہی میرے کام آجایا کرتی تھی باوجود کوشش کے حبیبہ کا بخار رات میں تیز ہو گیا۔

اماں نے صبح فون کیا تھا کہ میں کچھ دن ان کی طرف رہ لوں مگر چونکہ مریم کے سکول ٹیسٹ چل رہے تھے اس لیے میں نے معذرت کر لی مگر اس پل حبیبہ کی بگڑتی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔

کاش میں صبح ہی رکشہ کر کے اماں کی طرف چلی جاتی تو یہ مسئلہ نہ ہوتا۔ اب رات کے اس پہر میں کس کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جاؤں۔ وہ بری طرح التیاں کر رہی تھی، اگر اس کی یہ حالت کچھ دیر اور رہتی تو یقیناً وہ پانی کی کمی کا شکار ہو جاتی میں تیزی سے اندر کمرے میں آئی مریم بیڈ پر بیٹھی اپنے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی جبکہ جاذبہ سو گئی تھی۔

”کیا بات ہے اماں رو کیوں رہی ہیں۔“

شاید پریشانی کے سبب میری آنکھوں میں پانی آ گیا تھا جو میری معصوم بیٹی کی نگاہوں سے چھپانہ رہ سکا۔

”کچھ نہیں بیٹا تم اپنی پڑھائی کرو حبیبہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہوں۔“

اسے تسلی دے کر میں نے کپڑوں تلے دبا سو ہائل نکالا اور باہر صحن میں آگئی وجاہت کا نمبر ملایا دوسری تیل پر ہی اس نے فون ریسیو کر لیا۔

”خیریت ہے نہ اب اس وقت میں کیسے یاد آ گیا۔“

میں کبھی بھی اتنی رات گئے وجاہت سے بات نہ کرتی تھی اس لیے میرا نمبر دیکھ کر اسے حیرت ہوئی جس کا اظہار کیے بنا وہ نہ رہ سکا۔

”حبیبہ کی طبیعت بہت خراب ہے اسے لے کر ہسپتال جانا ہے۔“

”تم اسے لے کر مین روڈ کی طرف آؤ میں پانچ منٹ میں وہاں پہنچ جاؤ گا مریم اور جاذبہ کو اوپر فائزہ کے پاس چھوڑ دو۔“

میں کیا چاہتی تھی وہ ایک پل میں سمجھ گیا۔

”نہیں آج کل اس کا شوہر پاکستان آیا ہوا ہے اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ اتنی رات گئے بچیاں اس کے گھر چھوڑ دوں میں باہر سے لاک کر کے اوپر فائزہ کو اطلاع کر دیتی ہوں کہ وہ دونوں گھر پر اکیلی ہیں۔“

جلدی جلدی یہ سب کہہ کر میں نے فون بند کیا مریم کو ساری ضروری ہدایات دیں، حبیبہ کو اچھی طرح کپڑے میں لپٹا اس کے فالٹو کپڑے ایک شاہر میں ڈالے اور گھر کے دروازے کو باہر سے تالا لگا کر میں اپنی گلی پار کر کے مین روڈ پر آگئی۔ مجھے علم تھا وجاہت گاڑی لے کر کہاں کھڑا ہو گا جب تک میں وہاں پہنچی وجاہت کی سفید گاڑی دور سے ہی نظر آگئی دروازہ کھولے وہ باہر ہی کھڑا تھا۔ میرے بیٹھے ہی اس نے بنا کوئی بات پوچھے گاڑی سٹارٹ کر دی اور پھر چند منٹوں میں، ہم شہر کے ایک بہترین ہسپتال میں تھے جہاں ایمر جنسی میں حبیبہ کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی اگر مجھے آنے کچھ دیر ہو جاتی تو جانے کیا ہوتا، پانی کی کمی پورا کرنے کے لیے اسے ڈرپ لگا دی گئی۔

”میں نے ٹائم دیکھا رات کے دو بج گئے تھے مریم اور جاذبہ گھر میں بالکل تنہا تھیں میرا دل ہول گیا، مگر کیا کرتی مجبوری تھی حبیبہ کو اس طرح چھوڑ کر میں گھر واپس نہیں جاسکتی تھی بمشکل میں نے دو گھنٹے اور گزارے اور پھر اماں کو فون کیا۔ جانتی تھی کہ اس وقت وہ تھک کے لیے اٹھی ہوں گی انہیں ساری بات بتائی سوائے اس کے کہ میں وجاہت کے ساتھ ہسپتال آئی ہوں انہیں بتایا کہ مجھے فائزہ کا شوہر چھوڑ کر گیا ہے۔“

”پلیز اماں آپ گھر چلی جائیں دونوں بچیاں رات سے تنہا ہیں۔“
ان کے پاس میرے گھر کی دوسری چابی موجود تھی اس لیے میں نے ان سے درخواست کی۔
”تمہیں مجھے رات ہی اطلاع دینی چاہیے تھی۔“ وہ خفگی سے بولیں۔
”بہر حال ابھی میں احسان کے ساتھ جا رہی ہوں تم فکر مت کرو۔“ ان کے اس جملے نے مجھے مطمئن کر دیا۔
”شکریہ اماں۔“

میں فون بند کر کے وجاہت کی سمت پلٹی جو نرس کی ہدایت کے مطابق میڈیکل سٹور سے کچھ دوائیاں خرید کر لایا تھا وہ رات سے میرے ساتھ تھا ورنہ میں تنہا عورت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔
”میں تمہارا شکریہ کس طرح ادا کروں وجاہت میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تم ہمیشہ اس وقت میرے کام آتے ہو جب مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہوتا کہ میں کیا کروں۔“
میں نے بدلہ سے اسے خراج تحسین پیش کیا حالانکہ جانتی تھی کہ میرے الفاظ کم ہیں اس نے بنا کچھ کہے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر مجھے تسلی دی۔ اور پھر نو بجے تک حبیبہ کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی اور ہم اسے ڈسچارج کروا کر گھر لے آئے جہاں ایک نیا امتحان میرا منتظر کھڑا تھا۔



”تم نے کبھی ایسی مچھلی دیکھی ہے جسے زندہ پانی سے نکال کر کنارے پر ڈال دیا جائے تو اس کے پاس کھڑے لوگ اس کے تڑپنے کا منظر بڑی بے حسی سے دیکھ رہے ہوں۔“
اریشہ کے الفاظ حبیبہ کے حساس دل کو زخمی کر گئے۔ اس نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑی اس لڑکی کو دیکھا جس کی وجہ سے اس نے جانے کتنی راتیں رو رو کر گزاری تھیں۔ جس کے ہونے سے اس کی زندگی کے کئی سال ویران کیے پھر بھی اسے اس لڑکی سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ وہ تو پچھتاہٹ تھی اس وقت کو جب اس نے ایصال کے اپنے سامنے آنے کی دعا کی تھی۔ کبھی وہ چاہتی تھی کہ ایصال صرف ایک بار اسے دیکھے اور پھر تاجر اپنے فیصلے پر پچھتائے مگر آج نہیں آج تو وقت بہت بدل گیا تھا۔
”سو تو پتھر کی بھی بہت اذیت دیتی ہے اور تم تو ایک جیتا جاگتا وجود ہو، حبیبہ تم شاید اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہارا ہونا میرے لیے کتنی تکلیف کا باعث بن رہا ہے۔“

حبیبہ نے دیکھا یہ اریشہ اس لڑکی سے بہت مختلف تھی جسے پہلی بار اس نے نازیہ آنٹی کے گھر دیکھا تھا یہ تو کوئی اور ہی لڑکی تھی۔ پہلی رنگت، روکھے بال، میک اپ سے عاری چہرہ، ہناکسی وجہ کے وہ شرمندہ سی ہو گئی۔
”تمہاری تکلیف کا اندازہ مجھ سے زیادہ بہتر شاید کوئی نہیں لگا سکتا اریشہ، وہ اذیت جو تم پچھلے چند دنوں سے بھگت رہی ہو، میں نے پورے دس سال جھیلی ہے۔ سو جو تم چند دنوں میں تھک گئیں، ہار گئیں اور میں تنہا دس سالوں میں بھی تھک کر پڑ نہ ہوئی۔ شاید اس لیے کہ تمہیں ایصال سے محبت تھی اور اس کے بدلنے نے تمہیں تکلیف دی ورنہ حق ملکیت تو اس پر میرا بھی اتنا ہی تھا جتنا آج تمہارا ہے۔ اگر وہ تمہارا شوہر ہے تو نکاح میں تو میں بھی اس کے تھی پھر تم نے کس طرح اس سے شادی کر لی، کیوں نہ سوچا کہ اگر کبھی زندگی میں وہ میرے سامنے آ گیا تو کیا ہوگا۔“

اس کے سوال کا اریشہ کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ خاموش کھڑی اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔
”تم نے اپنی زندگی کی شروعات ریت کے محل سے کی تھی جو حیر چلتی ہوا کے سامنے کبھی نہیں ٹھہر پاتا۔ تمہیں چاہیے تھا

اس کا نام اپنے ساتھ لگانے سے پہلے قانونی اور شرعی طور پر مجھے اس سے الگ کرتیں مگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تمہیں شاید خود پر بہت اعتماد تھا، ایصال کی محبت پر بھروسہ تھا تم بہت بیوقوف تھیں اریشہ اس مرد کی محبت کبھی قابل اعتبار نہیں ہوتی جو رشتوں کی نزاکتوں کو نہیں سمجھتا۔ تم اس کے لیے صرف اس لیے اہم تھیں کہ تم اس کے قریب تھیں۔ مجھ سے فرار کے لیے اس نے تمہارا سہارا لیا اور آج تم سے فرار کے لئے وہ بے اولادی کا سہارا لے رہا ہے ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔“

سنیے پر دونوں ہاتھ باندھے وہ بڑے پُر اعتماد انداز میں کھڑی اریشہ سے جواب طلب کر رہی تھی اور اریشہ جو اسے جانے کیا کیا سنانے کا سوچ کر گھر سے نکلی تھی اب بالکل گونگی ہو گئی۔ حبیبہ کی باتوں نے اسے آئینہ دکھا دیا اس کے تمام الفاظ کہیں گم ہو گئے۔

”بہر حال تم فکر نہ کرو مجھے ایصال کے ساتھ نہیں رہنا وہ کچھ بھی کر لے طلاق میرا قانونی حق ہے جو میں اس سے لے کر رہوں گی اس لیے تمہیں مجھ سے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”مجھے تمہارا پتا ہے حبیبہ تمہاری زندگی میں اب ایصال کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ مسئلہ تو صرف ایصال کا ہے جو اپنی ضدی طبیعت کے باعث ہمیشہ وہ کرنا چاہتا ہے جس سے اسے روکا جائے۔“

وہ بیوی تھی اس لیے ایصال کی فطرت سے واقف تھی۔ ”صدا نکل سے میری بات ہو گئی ہے ان کے کہنے کے مطابق میں نے آج ہی کورٹ میں خلع کی درخواست جمع کروائی ہے۔ مجھے امید ہے ان شاء اللہ فیصلہ بہت جلد میرے حق میں ہو گا۔“

حبیبہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی اریشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا وہ شکوہ جو کبھی اسے اریشہ سے تھا آج خود بخود دور ہو گیا اور اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ وہ ایصال کی پہلی بیوی نہیں تھی ورنہ وہ اسے اریشہ کی خاطر بہت پہلے ہی چھوڑ چکا ہوتا۔ چھوڑا تو اس نے اب بھی تھا، مگر اس چھوڑنے کے بعد جو تکلیف وہ اٹھا رہا تھا دوسری صورت میں یہ زندگی بھر کا روگ حبیبہ کا نصیب بن جاتا۔



”جانے تم کیسے بھائی ہو جو صرف مجھے بچا دکھانے کے لیے حبیبہ کو بہکا رہے ہو۔“ وہ ابھی ابھی آفس آکر بیٹھا ہی تھا جب زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر ایصال اندر داخل ہوا اس کے ہاتھ میں دبا کاغذ دیکھ کر شاہ زین ساری صورت حال سمجھ گیا۔ یقیناً اسے آج ہی کورٹ کی طرف سے خلع کا نوٹس ملا تھا جس نے اسے آپے سے باہر کر دیا۔

”السلام علیکم بھائی آپ بیٹھیں تو سہی۔“

شاہ زین اس کے غصہ کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے؟“ ہاتھ میں پکڑا کاغذ کا ٹکڑا اس نے شاہ زین کی ٹیبل پر پٹخا۔

”آپ نے پڑھا نہیں.....“

اس نے خاصا ریلکس ہوتے ہوئے اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔

”پڑھا ہے اس لیے ہی تم سے پوچھ رہا ہوں اگر، حبیبہ نے مجھ سے خلع لینا تھا تو اس وقت کیوں نہ لیا جب میں نے اسے تنہا چھوڑ کر اریشہ سے شادی کی۔ اتنے سال اس نے میرے نام پر بیٹہ کر گزاردیے۔ جب بھی پاپا یا انکل نے اسے طلاق لے کر شادی کے لیے کہا اس نے منع کر دیا، پھر اب ایسا کیا ہوا کہ جب میں نے اسے اینا نا جاہا اور وہ مجھے چھوڑنے پر تیار

ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے شاہ زین اس کے پیچھے تم کھڑے ہو تم اس کی محبت میں گرفتار ہو کر یہ بھی بھول گئے ہو کہ اس کا تم سے رشتہ کیا ہے؟“

حبیبہ اس کی ملکیت تھی یہ احساس ایصال کے لہجہ میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا جس کا اندازہ اس کے الفاظ سن کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

”ایک منٹ بھائی مجھ پر اتنے الزام لگانے سے پہلے آپ صرف اپنے ہی کہے ہوئے الفاظ پر غور کریں تو شاید آپ کی سمجھ میں سب کچھ آجائے۔“

شاہ زین نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا۔

”آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے خود ہی کہا کہ جب وہ تھا تھی تب اس نے آپ کو نہیں چھوڑا تو بات صرف اتنی ہے کہ اب وہ تھا نہیں ہے۔ تھا عورت مرد کو چھوڑتے ہوئے شاید ڈرتی ہے کہ دنیا کیا کہے گی مگر وہ عورت جس کے آس پاس سارے رشتہ موجود ہوں۔ جو اسے سپورٹ کر رہے ہوں وہ عورت کسی ایسے مرد کے نام پر اپنی زندگی برباد نہیں کر سکتی جو کبھی اس کا تھا ہی نہیں، آپ شاید بھول گئے وہ آپ کی بیوی نہیں صرف منکوحہ ہے، بہت فرق ہوتا ہے ایک بیوی اور منکوحہ میں۔ منکوحہ بھی ایسی جس کی دس سالوں میں آپ نے کوئی ذمہ داری پوری نہیں کی جبکہ آپ کے نکاح میں آنے کے بعد اس کے نان نفقہ کے ذمہ دار تھے، پھر آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ آپ کے چھوڑنے کے بعد وہ کہاں جائے گی۔ کبھی اتنے سالوں میں آپ نے یہ سوچا کہ وہ کن حالوں میں اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ نہیں نا۔“

شاہ زین سانس لینے کے لیے رکا، اتنی گفتگو میں بھی اسے ایصال کے چہرے پر کوئی شرمندگی نظر نہیں آئی جس سے یہ احساس ہوتا کہ اس پر شاہ زین کی باتوں کا کوئی اثر ہوا ہے۔

”جب آپ نے اس کے بارے میں یہ سب نہیں سوچا تو اب آپ یہ کیوں چاہ رہے ہیں کہ وہ آپ کی فکر کرے۔“

”مجھے پتا تھا کہ پاپا اس کی کفالت کر رہے ہیں۔ اب چاہے نان نفقہ میں پورا کرتا یا میرا پاپا بات ایک ہی تھی۔“ اس نے ڈھٹائی سے ٹانگ پر ٹانگ دھرتے ہوئے جواب دیا۔

”معاف کیجئے گا آپ کو شاید علم نہیں فرہاد انکل کے گھر کی جگہ آج جو بلڈنگ تعمیر ہے اس کا کرایہ ان تینوں بہنوں کا قانونی حق ہے۔ اس میں جتنا حصہ مریم اور جاذبہ آپا کا تھا اتنا ہی حبیبہ کا بھی تھا اور وہ ہی پیسہ حبیبہ کی ذات پر خرچ ہوا ہم میں سے کسی نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔“

شاہ زین نے اس کی ساری غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

”مجھے ان تمام باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں حبیبہ کو طلاق نہیں دے رہا اور تم بجائے اپنے مفاد کی خاطر ہمیں جدا کروانے کے، بہتر ہے کہ اس سے صلح میں میری مدد کرو کیوں کہ سننے میں آیا ہے وہ تمہاری بات بہت مانتی ہے۔“

”وہ عاقل و بالغ لڑکی ہے اور اپنی زندگی کے لیے وہ ہی فیصلہ کرے گی جو اس کا دماغ سے اجازت دے گا۔“

شاہ زین نے حتمی لہجہ میں بات ختم کرنا چاہی۔

”بہر حال کوئی بھی شرعی قانون مجھے دو شادیوں سے نہیں روک سکتا وہ بھی اس صورت میں جب میں اولاد کا خواہش مند ہوں اس لیے بہتر ہے کہ تم اس مسئلے سے دور رہو۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن جاتے جاتے شاہ زین کو تنبیہ کرنا نہ بھولا۔ اس کے باہر نکلتے ہی شاہ زین مسکرا دیا وہ بے شک اس کا سگابھائی تھا دونوں کا خون ایک ہی تھا، مگر شاید تربیت میں فرق تھا۔ اس کی تربیت نازیہ جیسی عورت کی گود میں ہوئی جو ایک حساس دل کی مالک تھی جب کہ صباحت کے لہجہ میں ایک خاندانی فخر و غرور اسے ہمیشہ جھلکتا نظر آیا وہ ہی فخر و غرور اسے ابھی ابھی ایصال کے اندر بھی دکھائی دیا۔



”فرہاد کا فون آیا تھا۔“

میں حبیبہ کو دوا کھلا کر فارغ ہوئی تھی کہ اماں نے اطلاع دی۔

”اچھا.....“

میں مختصر جواب دے کر واش روم گئی تاکہ ہاتھ منہ دھو کر اماں کو ناشتا دے سکوں کیوں کہ گیارہ بج گئے تھے اور انہوں نے ابھی تک چھ نہیں کھایا تھا۔

”کیا کہہ رہا تھا فرہاد۔“

میں تولیہ سے منہ پونچھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اعتراف کر رہا تھا کہ تم نے اسے حبیبہ کی طبیعت کی خرابی کا نہیں بتایا اور یہ کہ تم فضا بھابی کو فون کرتیں اور ان کے ساتھ ہسپتال جاتیں! بیٹا وہ تو بہت ناراض ہو رہا تھا کہ اس طرح کسی غیر کے ساتھ ہسپتال جانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”آپ نے ناشتا کیا ہے؟“

میں نے ان کی بات درمیان سے ہی کاٹ کر سوال کیا۔

”ہاں چائے بنا کر پی تھی اب تم کھانا ہی بنا لو مجھے ناشتے کی حاجت نہیں ہے۔“

اماں کا بھجا ہوا لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ فرہاد نے میرے ہسپتال جانے کا سن کر اماں کو بہت کچھ سنا دیا ہے۔

”اچھا ہے ان کو بھی پتا چلے کہ ان کا داماد کس قابل ہے۔“ یہ سوچتی ہوئی میں کچن میں آگئی تاکہ مریم اور جاذبہ کے لیے کچھ بنا سکوں۔



”میرا تم سے ملنا بہت ضروری ہے حبیبہ۔“

فون کے دوسری طرف موجود ایصال کا لہجہ بتاتی تھا۔

”آپ کو مجھ سے جو بھی بات کرنی ہو پلیز کورٹ میں کریں اور ویسے بھی میں آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

حبیبہ نے دو ٹوک لہجہ میں جواب دیا۔

”دیکھو حبیبہ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ اور اب بھول کر مجھ سے صلح کر لو یقیناً جانو تمہیں اب مجھ سے کبھی کوئی شکایت

نہیں ہوگی۔“

”مجھے سمجھ نہیں آتا ایصال آپ کس قسم کے مرد ہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخ ہو گئی۔

”وہ ایشہ جس کی خاطر آپ ساری دنیا چھوڑنے کو تیار تھے آج اس ایشہ کے بچے آنسو آپ کو دکھائی نہیں دے رہے،

آپ اس سب کو نظر انداز کر کے مجھ سے دس سالہ پرانا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے پر بھند ہیں، لیکن جو رشتہ ٹوٹ رہا ہے وہ آپ کو

دکھائی نہیں دے رہا۔“

”میں اریشہ سے کوئی رشتہ نہیں تو زربا وہ میرے لیے آج بھی وہی اریشہ ہے جو دس سال قبل تھی اور سوچو ذرا اگر اس سے شادی کرتے وقت تم سے میرا رشتہ ختم نہ ہوا تھا تو اب اس سے کوئی رشتہ کیسے ختم ہو سکتا ہے۔“

شاہ زین نے صحیح اندازہ لگایا تھا ایصال اس معاملے میں خاصا ڈھیٹ ثابت ہوا تھا۔ اس سے بات کر کے جیبہ کو جلد ہی یہ علم ہو گیا کہ اسے شاید شاہ زین سے ضد ہو گئی ہے اور وہ صرف یہ چاہ رہا ہے کہ کسی طرح اسے شاہ زین سے جدا کر دیا جائے وہ ایسا کیوں چاہ رہا تھا جیبہ سمجھ نہ پائی۔

”جو بھی ہے ایصال یہ طے ہے کہ میرا تم سے کوئی بھی رشتہ اس دن ہی ختم ہو گیا تھا جب تم نے اریشہ کی محبت میں مجھے ٹھکرایا تھا اور مجھے بھی کسی بھی حال میں اب تمہارا ساتھ نہیں چاہیے یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے اور اس سلسلے میں کوئی بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتا نہ تم، نہ عدالت، نہ ہی انکل، نہ کوئی اور خدا حافظ۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ آئندہ مجھ سے اس طرح بات کرنے کی کوشش نہ کرنا اب تمہیں جو بھی کہنا ہو وہ عدالت میں ہی کہنا۔“

”ایک منٹ جیبہ فون بند مت کرنا۔“

اس سے قبل کہ وہ فون بند کرتی ایصال بول اٹھا۔

”دیکھو جیبہ میں تمہیں طلاق دے دوں گا، لیکن میری ایک شرط ہے تم مجھ سے ایک دفعہ مل لو صرف ایک دفعہ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ وہ یہ سب کیوں چاہ رہا تھا جیبہ سمجھ نہ پائی۔

”بہت مشکل ہے ایصال میں آپ سے نہیں مل سکتی۔“ اس کے ساتھ ہی ان نے فون بند کر دیا۔

زندگی غم کا ساگر بھی ہے

ڈوب کے اس پار جانا پڑے گا

ایصال کافی دیر تک ہاتھ میں سیل لے کر اسے گھورتا رہا اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ فون کے دوسری طرف وہ جیبہ تھی جس نے اس کے نام پر اپنی پوری زندگی گزار دینے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بات کئی بار اپنی ماں سے سن چکا تھا۔ اب جیبہ وہ نہیں تھی یہ جیبہ اس کے ساتھ ایک ہل بھی نہیں رہ سکتی تھی وقت شاید بہت بدل گیا تھا۔

”عزت اسی میں ہے کہ میں خود اسے طلاق دے دوں۔“

یہ فیصلہ کرتے ہی وہ مطمئن ہو گیا۔



صحن میں یہاں وہاں سامان بکھرا پڑا تھا، آب زم زم کے کین، کھجور، جانمازیں اور بھی بہت سارا سامان جس کے یا سمین آپا پیکٹ بنا رہی تھیں اور فرہاد ان پر سب رشتہ داروں کے نام لکھ رہا تھا۔ میری حیثیت تیسرے فریق جیسی تھی جس کے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سارے عمل کی کرتا دھرتا یا سمین آپا تھیں، کس کو جانماز دینی ہے، کسے صرف کھجور اور پانی اور کس کو وہاں سے لایا ہوا کوئی اور تحفہ، اس سب کا فیصلہ وہ ہی کر رہی تھیں اور فرہاد ان کے کیے گئے ہر فیصلہ پر کسی رپورٹ کی مانند عمل درآمد کر رہا تھا۔

صبح سے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت نے مجھے تھکا دیا تھا، ابھی فضا بھابی نے ملنے آنا تھا اسی سبب میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی جب باہر سے آتی یا سمین آپا کی آواز نے میرے کام کرنے کے عمل کو سسٹ کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا

جیسے موضوع گفتگو، میری ذات ہے۔ یا میرے گھر والے ہیں، میں بچن کے دروازے سے مزید قریب ہوگئی، یا سکین آپا کی میرے کانوں تک آتی آواز نے مجھ پر ہر چیز واضح کر دی۔

”میرا خیال ہے کہ کھجور اور پانی کے ساتھ ایک جانماز اور تسبیح کافی ہے۔“

”لیکن آپا.....“ فرہاد آہستہ آواز میں منمنایا۔

”میں جو سفید دوپٹا لایا ہوں وہ بھی اماں جی کا ہے حسن اور احسان کے لیے ٹوپیاں بھی رکھ دیں اور دو عطر کی بوتلیں بھی

ان کی ہیں۔“

”حد ہے فرہاد کیا ضرورت ہے اتنا سامان دینے کی، اب دیکھو ہمیں چھ گھنٹے ہو گئے آئے ہوئے، مگر مجال ابھی تک کسی

نے ایک فون کر کے مبارک دی ہو۔“

”وہ تو صحیح ہے آپا پھر بھی برا لگتا ہے غیروں کی طرح وہ چیزیں دیتا۔“

مجھے حیرت ہوئی فرہاد اور میرے گھر والوں کی وکالت، مجھے کسی طور پر یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ الفاظ فرہاد کے ہیں۔

”لو بھائی پھر جو تمہارا دل چاہے تم کرو، مجھے میری کھجوریں اور پانی الگ کر دو۔“ صاف محسوس ہوا کہ آپا ناراض ہوگئی

ہیں۔

”انہوہ آپا اتنی چھوٹی سی بات پر آپ اپنا دل کیوں برا کر رہی ہیں، ٹھیک ہے جو آپ بہتر سمجھیں وہ کریں۔“

اب مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں بچن سے باہر نکل آئی شروع سے ہی سب مجھ سے یہ کہتے تھے کہ میں بہت جذباتی

ہوں اور غصے میں ہٹا سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہوں ہٹا کسی لحاظ و مروت کے۔ میری یہ خوبی شاید کافی عرصہ سے

میرے حالات نے دہادی تھی، اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ابھر کر سامنے آ رہی ہے اور شاید یہ میری جذباتیت ہی تھی جو ہٹا سوچے

سمجھے بچن سے باہر آ کر یا سکین آپا سے الجھ پڑی۔

”یا سکین آپا آپ پلیز میرے گھر والوں کے لیے کھجور اور پانی بھی مت دیں۔ اماں سے سپارہ پڑھنے والے بچوں کے

گھروں سے یہ سب سوغات اتنی آتی ہیں کہ ہم خود محلے میں تقسیم کرتے ہیں۔“

”تم بچن میں جاؤ نہ نب تم سے بات نہیں ہو رہی۔“ ان کے جواب دینے سے قبل ہی فرہاد بول اٹھا۔

”مجھ سے بات نہیں ہو رہی، لیکن میری بات ہو رہی ہے، آپ محلے بھر کے لیے تحفہ تحائف لائے، میں نے تو کچھ نہیں

پوچھا جہاں میرے گھر والوں کی بات ہوئی وہاں انہیں پریشانی لاحق ہوگئی۔“

مانتی ہوں میرا لہجہ بہت تیز تھا اور شاید یا سکین آپا کے لیے بالکل غیر متوقع تھا کہ میں فرہاد کے سامنے اتنی بدتمیزی کا

مظاہرہ کروں، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ہکا بکا میرا منہ نکلے گئیں۔

”آپ پیٹھ پیچھے تو خوب باتیں کرتی ہیں اور اب سامنے بالکل ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ کو بولنا ہی نہ آتا ہو۔“

فرہاد کا مجھے بنا ہٹائے ان کے ساتھ عمرہ پر جانا، میری ہر بات اس سے ڈسکس کرنا یہ وہ وجوہات تھیں جنہوں نے اسی

پل مجھے بری طرح بھڑکا دیا۔

”میں نے تو کبھی آپ کے شوہر کو فون کر کے آپ کی برائیاں نہیں کیں تو پھر کیا کام ہے آپ کا، ہر وقت فرہاد سے میری

باتیں مزے مزے لے لے کر سننے کا اور کرنے کا۔“

”نہ نب خاموش ہو جاؤ.....“

فرہاد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ مجھے خاموش کروانے کی کوشش کی، جبکہ یاسمین آپا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور بنا کچھ کہے یہاں وہاں رکھا سامان سینٹے لگیں۔ ان کے ماتھے پر پڑی تیوریاں ان کے شدید غصہ کی عکاسی کر رہی تھیں۔

”کیوں خاموش ہو جاؤں پچھلے چھ سات سال میں نے خاموش رہ کر ہی گزار دیئے اور آپ میری ایک بات اپنی بہن سے شیئر کرنے لگے، بنایہ سوچے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں اور یہ حکم قرآن کا ہے کہ ہمیں اپنی باتیں دوسروں کے سامنے نہیں کرنی چاہئیں۔ پھر بھی فرہاد آپ نے نہ کبھی خود میری عزت کی اور نہ کسی کو کرنے دی۔“

زور زور سے بول کر میں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی اور پھر کچھ بھی سنے بنا اندر کمرے میں جا کر دروازے کی کنڈی لگائی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ مجھے لگا شاید میری باتوں نے فرہاد کے اندر موجود انسان کو جگا دیا ہوگا، مجھے امید تھی کہ وہ پشیمان ہوگا اور کچھ دیر بعد مجھے کھانے کے لیے بلائے ضرور آئے گا، مگر ایسا نہ ہوا دوپہر سے شام ہو گئی کسی نے میرے کمرے کا دروازہ نہ بجایا اور نہ ہی مجھے آواز دی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا، جہاں سے آنے والی آوازیں سن کر مجھے پتا چلا کہ فضا بھابی بھی آئی ہوئی ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ مجھے آواز دے کر بلایا جاتا، کم از کم فضا بھابی تو مجھ سے آکر ملتیں، مگر ایسا نہ ہوا اور رات کو ڈھیوں کی مانند کمرے کا دروازہ کھول کر میں خود ہی باہر نکل آئی۔ ظاہر ہے جب مجھے یہاں رہنا تھا تو بلاوجہ یہ سب غم کرنے کی کیا ضرورت تھی، جبکہ معلوم تھا کہ انہیں دیکھنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ ویسے بھی بھوک بڑی ظالم چیز ہے پیٹ کی ہو یا کسی اور چیز کی.....



”پلیز اریشہ مجھے معاف کر دو اور اس طرح تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔“

ایشال نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا ایک پکڑ لیا۔

”چھوڑ دو ایشال میں فیصلہ کر چکی ہوں حبیبہ سے رخصتی کی صورت میں تمہیں مجھے طلاق دینا ہوگی۔“

سرخ آنکھیں اور پہلی رنگت کے ساتھ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”بے وقوف عورت تمہیں کس نے کہا کہ میں حبیبہ کو رخصت کروانے لگا ہوں۔“

اپنے لہجہ کو بتا دیتے ہوئے اس نے اریشہ کو بازو سے تھام کر اپنے قریب کیا۔

”مجھے معاف کر دو اریشہ شاید حسد، غصہ اور جانے کس جذبے کے تحت میں نے وہ بیوقوفانہ فیصلہ کیا، جس نے کئی دنوں سے پورے خاندان کو ایک اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے، میں شرمندہ ہوں اپنے کہے ہوئے الفاظ اور عمل سے جو تمہاری تکلیف کا باعث بنے۔“ نہ صرف اس کے الفاظ بلکہ لہجہ میں بھی شرمندگی تھی۔

”میں نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ حبیبہ کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن شاید حبیبہ میرے بغیر مر جائے گی یہ احساس برتری ہمیشہ میرے اندر موجود رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ جب میں اسے طلاق دینے لگوں گا تو وہ میرے سامنے گڑگڑائے گی۔ میرے سامنے حبیبہ کا تصور ایک بے چاری سی عورت کا تھا، لیکن جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کے اعتماد اور مجھے اگنور کرنے کے عمل نے میرے تن من کو جھلسا دیا، مجھے آگ لگا دی اور میں ضد میں آ گیا، جانے کیوں میں اسے اپنے سامنے روتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا، مگر ایسا نہ ہوا، حبیبہ کے رویہ نے میری مردانگی پر ضرب لگائی اور اسے جھکانے کی خاطر میں بنا سوچے سمجھے یہ سب فضول حرکتیں کرتا گیا جن پر اب میں بے حد شرمندہ ہوں۔ اب ہو سکے تو پلیز تم وہ سب باتیں بھول

جاؤ اور مجھے معاف کر دو۔“

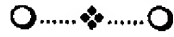
وہ اس کی منت کرتے ہوئے بولا۔ اریشہ نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جہاں شرمندگی رقم تھی، مگر پھر بھی اس کا دل نہ چاہا کہ وہ ایصال کو معاف کر دے۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اس کی وجہ سے جس ڈھنی اذیت کا شکار تھی وہ قطعی قابل معافی نہ تھی، لیکن کیا کرتی مجبور تھی کیوں کہ وہ ایک مشرقی عورت تھی، جو ہمیشہ اپنے مجازی خدا کی تمام غلطیوں کو نظر انداز کرنے کی عادی ہوتی ہے، چاہے وہ کسی اعلیٰ یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن شاید عورت صرف عورت ہوتی ہے ایسے حالات میں اریشہ اور زینب میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

”نی الحال مجھے تمہا چھوڑ دو ایصال، میرا اس وقت کسی سے کوئی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ اپنے کمرے کی جانب واپس چلی ایصال کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ رک گئی تھی۔ ورنہ آج اگر وہ ایصال کی بات نہ مانتی اور یہ گھر چھوڑ جاتی تو جانے کیا ہوتا؟ اسے یقین تھا کہ ماموں اور مامی کبھی اریشہ کو دوبارہ اس گھر میں نہ آنے دیتے خواہ کچھ بھی ہو جاتا۔

”تھینک یو اریشہ تم نے آج میرا مان رکھ لیا۔“ وہ اریشہ کے پیچھے کمرے کے دروازے تک آیا۔ ”تمہارا مان نہیں، اپنی عزت رکھی ہے آج میں نے اور میں اگر یہاں رکی ہوں تو اس کی وجہ تم نہیں ہو، وجہ صرف یہ ہے کہ میں نہیں چاہتی لوگوں کا محبت پر سے یقین اٹھ جائے۔“

اس نے اپنی جگہ رک کر سیدھا ایصال کی آنکھوں میں جھانکا وہ لا جواب سا ہو گیا، سمجھ ہی نہ آیا کہ ان تمام باتوں کا کیا جواب دے۔

”اور ہاں پلیز اب تم یہاں سے جاؤ اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ لاک کر دینا۔“ اس نے الماری سے اپنے کپڑے نکالے اور واش روم کی جانب بڑھتے ہوئے ایصال کو ہدایت کی اس نے خاموشی سے سنا اور اپنے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا باہر نکلتے نکلتے وہ کمرے کا دروازہ لاک کرنا نہ بھولا۔



کئی دنوں سے فرہاد مجھ سے واجبی سی بات چیت کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ میں یا سمین آپا سے معافی مانگوں، مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ رات ہی اماں اور احسان، فرہاد سے ملنے آئے اور اتوار والے دن فرہاد کے ساتھ ساتھ یا سمین آپا کو بھی دوپہر کے کھانے کی دعوت دے گئے۔

”میں تو آج فضلہ بھابی کے گھر رہنے جا رہی ہوں کیوں کہ ان کی فیملی میں میری دعوت ہے اور پھر شاید پیر کی صبح مجھے اسلام آباد بھی واپس جانا ہے۔ البتہ فرہاد اور زینب آجائیں گے۔“

اماں کی بات سنتے ہی یا سمین آپا نے نخوت سے جواب دیا، جسے اماں نے تو شاید محسوس نہ کیا، لیکن میرے ساتھ ساتھ احسان کے چہرے پر بھی ناگواری کا تاثر ابھر آیا۔

”پھر بھی بیٹا کوشش کرنا اگر تم آسکو، تو یقین جانو ہم سب کو بہت خوشی ہوگی۔“ میری سادہ سی ماں ان کے غرے سمجھ بنا دعوت قبول کرنے پر زور دیتے ہوئے بولی۔

”اگر آسکتی تو آپ کو کبھی اس طرح منع نہ کرتی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں جبکہ اس سارے عمل کے دوران فرہاد نہایت اطمینان سے ٹی وی دیکھنے میں مصروف

رہا۔

”اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔“

اماں نے کھڑے ہوتے ہوئے احسان کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا، جسے سمجھتے ہی میں آگے بڑھی اور انہیں کندھوں سے تھام

لیا۔

”کہاں جا رہی ہیں اماں بیٹھ جائیں، میں نے کھانا بنا لیا ہے کھا کر جائیے گا۔“ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری ماں اس طرح بنا کچھ کھائے پیئے میرے گھر سے جائے، مگر اماں نہ رکیں۔

”نہیں بیٹا مجھے احسان کے ساتھ کہیں اور بھی جانا ہے پھر کبھی آئی تو ضرور کھاؤں گی۔“ میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے

انہوں نے وضاحت کی۔

”اچھا فرہاد بیٹا اللہ حافظ۔“

انہوں نے فرہاد کے قریب جا کر اس کے بھی سر پر دستِ شفقت رکھا۔

”اللہ حافظ۔“

اتنا کہہ کر وہ پھر سے ٹی وی دیکھنے میں لگن ہو گیا، میں انہیں دروازے تک چھوڑ کر اندر واپس آئی تو فرہادی وی بند کر چکا

تھا۔

”دیکھ لو تمہاری ماں اور بھائی میرے گھر آئے تو میں نے کتنی عزت کی، تمہاری کوئی شکایت نہیں لگائی اور نہ ہی انہیں

دیکھ کر منہ بنایا۔“ میرے اندر داخل ہوتے وہ طنز یہ بولا۔

”اور اگر میرا کوئی بہن بھائی یہاں آجائے تو تم سے برداشت بھی نہیں ہوتا دراصل یہ ہی فرق ہے تمہاری اور ہماری

تر بیت میں.....“

اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر وہ میرے قریب آیا، آہستہ آواز میں بولتے ہوئے ہلکا سا مسکرایا اور برآمدے کا دروازہ کھول کر

باہر نکل گیا، لیکن باہر نکلتے نکلتے اپنے الفاظ کے ذریعے وہ میرے تن بدن کو آگ لگا گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا تعلق

کیسی اعلیٰ خاندان سے ہے اور میں کوئی نہایت گری پڑی عورت جس کی کوئی عزت اور حیثیت ہی نہ تھی۔

”یقین جانو تمہارے تمام الفاظ تمہیں لوٹا کر ہی اس دنیا سے واپس جاؤں گی۔ تمہیں بتاؤں گی کہ عورت اگر اپنی بے

عزتی کا بدلہ لینے پر آئے تو تم جیسے مرد کو کوڑی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔“

فرہاد کو پشت سے دیکھتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں عہد کیا اور پھر اپنے اس عہد کو پورا کرنا میری زندگی کا مقصد بن

گیا۔ اب میں صرف یہ ہی چاہتی تھی کہ فرہاد کو احساس دلا سکوں کہ، دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت اور اعلیٰ مقام لوگ

میری ایک نظر کرم کے منتظر ہیں اور اب میں کسی ایسے مرد کا ہونا چاہتی تھی، جو مجھے فرہاد اور اس کے خاندان میں وہ عزت

اور مرتبہ دلائے جو اس خاندان کی دوسری عورتوں کو حاصل تھا اور بس یہاں سے ہی میری کہانی نے نیا موڑ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ

عورت ہو یا مرد انتقام کی آگ دونوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے جس کا ہوش سب کچھ ختم ہونے کے بعد آتا ہے۔

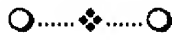
○.....❖.....○

فائزہ اپنے سسرال گئی ہوئی تھی اور اس کا گھر آج کل خالی تھا جہاں اکثر اوقات وجاہت آ جاتا، جس کی اطلاع وہ مجھے

موبائل پر فون کر کے دے دیا کرتا اور جس حد تک ممکن ہوتا میں اس سے ملنے اور پر چلی جایا کرتی۔

میرے اور اس کے درمیان موجود تمام فاصلے ختم ہو گئے تھے جس میں میرے نزدیک سارا قصور فرہاد کا تھا، نہ وہ مجھ سے اتنی بے اعتنائی برتتا اور نہ میں اس دلدل میں گرتی، جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔ اپنی غفلت کے سبب اس نے اپنے ساتھ ساتھ میری آخرت بھی برباد کی۔ اللہ ایسے تمام مردوں کو نیک ہدایت دے تاکہ انہیں علم ہو سکے کہ بیوی کے حقوق کیا ہیں؟ اور وہ اپنی ماں، بہن اور بیوی کے درمیان کی حد قائم رکھ سکیں۔

وجاہت مجھے اکثر اوقات ہی خرچہ کے نام پر کچھ رقم بھی دے دیا کرتا جو میرے لیے کافی ہوتی، میں نے فرہاد سے کوئی بھی پیسہ مانگنا چھوڑ دیا وہ بھی مطمئن ہو گیا اور کبھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ میں اپنے تمام اخراجات کہاں سے پورے کر رہی ہوں یا شاید اس کے نزدیک میرے کوئی اخراجات بھی نہ تھے سوائے دو وقت کی روٹی کے جو وہ مجھے فراہم کر رہا تھا اور اس کا یہ بھی مجھ پر ایک احسانِ عظیم تھا جو وہ ہر وقت جتایا کرتا۔



”ایشال نے یہ پہرہ زیبی ہے۔“

سالار نے ہاتھ میں تھا ماخا کی لفافہ جیب کے سامنے موجود شیشے کی ٹیبل پر رکھ دیا، بنا کھولے وہ جان پہچان تھی کہ اس لفافہ میں کیا ہے؟ مگر ہاتھ بڑھا کر نہ اسے اٹھایا اور نہ کھول کر دیکھا، سامنے کھڑی نازیہ نے ایک نظر سالار کے تھے ہوئے چہرے پر ڈالی اور دوسری جیب پر، جو ساری دنیا سے بے نیاز اپنے موبائل میں بڑی تھی شاید دل کا درد چھپانے کے لیے وہ خود کو ریلیکس ظاہر کر رہی تھی نازیہ کو بے اختیار ہی اس معصوم سی لڑکی پر ترس آ گیا۔

”جیب.....“

وہ اس کے قریب رکھے صوفہ پر آن بیٹھیں۔

”دیکھو بیٹا ہمیں ہمیشہ زندگی میں وہ ہی ملتا ہے جو ہمارا نصیب ہو اور دعا کرنی چاہیے کہ نصیب ہمیشہ اچھا ہو۔“ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں جیب سمجھ نہ پائی، بس ٹکر ٹکران کی جانب دیکھ گئی شاید طلاق کے صدمہ نے اس سے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیت چھین لی تھی نازیہ کو افسوس ہوا۔

”دیکھو بیٹا مجھے امید ہے تمہیں ایشال سے کئی گنا اچھا ہم سفر ملے گا، بس تم اپنے رب سے کبھی مایوس نہ ہونا۔“ اپنے تئیں وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

”افوہ آئی یہ آپ کیا بولے جا رہی ہیں؟“

نازیہ کی ساری باتیں اس کی سمجھ میں اب آئیں اور وہ بے اختیار ہنس دی۔

”فارگارڈ سیک نہ مجھے کوئی صدمہ ہے اور نہ ہی ایشال سے طلاق کا دکھ، وہ میری زندگی میں نہ کبھی تھا اور نہ ہی ہے، اسے اس کی زندگی مبارک ہو۔ میرے نزدیک وہ صرف ایشال کا شوہر ہے دوسری حیثیت اسے میرے کزن کی حاصل ہے اور شاید وہ میری بہن کا دیور بھی ہے۔“

ایک ایک کر کے اس نے ایشال کے سارے رشتہ گنوا دیئے۔

”مگر میرا وہ کچھ بھی نہیں ہے اس لیے پلیز آپ اس مسئلے کو لے کر بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔“

وہ نہایت اطمینان سے بولی، نازیہ نے دیکھا وہ واقعی سچ کہہ رہی تھی اس کے چہرے پر جو کیفیت تھی وہ کسی بھی طرح اسے پریشان ظاہر نہ کر رہی تھیں۔

”شکر ہے بیٹا ورنہ میں بہت ڈر رہی تھی.....“ انہوں نے اپنا جملہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔
 ”وقت بہت بدل گیا ہے آنٹی، اب کوئی کسی پر زبردستی مسلط نہیں ہوتا، یہ فیصلہ اپنے دل اور خوشی سے کیا جاتا ہے جو اس کے لیے بہتر تھا۔ اس نے کیا اور اب جو میرے لیے بہتر ہوگا، میں کروں گی۔“ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”انکل مجھے لاہور جانا تھا فاطمہ آنٹی کی ڈیجھ ہو گئی ہے ان کا افسوس کر کے آتا ہے، اماں کی قبر پر بھی جانا ہے اور ہاں احسان ماموں سے میری بات ہوئی تھی وہاں چھوٹے کمرے میں اماں کا کچھ سامان موجود ہے وہ بھی لے کر آتا ہے اور میں نے سنا ہے آنٹی سیکینہ بہت بیمار ہیں ان کی عیادت کو بھی جانا ہے۔“ اس نے سالار کے قریب جا کر اسے اپنا پروگرام بتایا۔
 ”ہاں میں نے شاہ زین سے کہا ہے وہ تمہاری اور اپنی سیٹ کروالے۔“
 ”اوکے، اینڈ تھینک یو انکل، آپ ہمیشہ میرے کام آتے ہیں۔“ وہ اظہارِ تشکر سے بولی۔
 ”بیٹا میں نے تمہارے لیے جو کچھ کیا وہ تم پر کوئی احسان نہ تھا وہ صرف ایک فرض تھا جو میں نے باپ ہونے کے ناطے ادا کیا۔“

سالار نے کھڑے ہو کر اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا انہیں ویسے بھی یہ معصوم سی لڑکی بہت عزیز تھی وہ جب اسے دیکھتے ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے سامنے زینب کھڑی ہو وہ بالکل زینب جیسی تھی۔



”تم فرہاد سے طلاق لے لو۔“

وجاہت نے میری طرف سے دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”طلاق.....“

میں ایک لمحہ کے لیے سوچ میں پڑ گئی، بظاہر یہ چھوٹا سا لفظ اپنے اندر بڑی مشکلات رکھتا تھا، سب کچھ اتنا آسان نہ تھا جتنا ہمیں دکھائی دے رہا تھا ایک پل کے لیے میرے سامنے سفید دوپٹے میں لبوس اپنی ماں کا نورانی چہرہ آگیا، پھر اس پر یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کے چہرے کی چھاپ دکھائی دی، پھر اپنی بچیاں، فرہاد اور اپنے سے منسلک وہ تمام رشتے جو وجاہت سے رشتہ جوڑنے کی صورت میں میرے لیے اجنبی ہو جاتے اس پل میرے سامنے سالار کا ہیولا آن کھڑا ہوا۔
 ”مجھ میں کیا برائی تھی زینب، جب یہ ہی آفر میں نے تمہیں دی تھی تو تم نے بنا سوچے ٹھکرادی اور اب وجاہت میں ایسا کیا دکھائی دیا جو تم ہر رشتہ توڑنے کے لیے تیار ہو۔“ اس کا شکوہ بجا تھا۔

”تم میں کوئی عیب نہ تھا سالار، فرق صرف یہ تھا کہ تم ایک بیوی کے شوہر تھے۔ بیوی بھی وہ جو مجھے اپنی بہن جیسا مانتی اور ویسے بھی میں لاکھ بری سہی، مگر شاید کسی دوسری عورت کا گھر اجاڑنے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا اور پھر سالار، تمہارا تعلق فرہاد کے خاندان سے تھا تم سے شادی کر کے میں تمہارے لیے مزید مشکلات کا باعث بنتی۔“

اتنے سالوں بعد آج یہ سب وضاحت دے رہی تھی جب وہ میرے سامنے ہی نہ تھا۔

”کہاں کھو گئیں زینب میری بات کا جواب دو۔“

وجاہت نے میرا کندھا تھام کر مجھے ہلایا اور میں جیسے یک دم ہوش میں آ گئی۔

”ایک بات بتا دو وجاہت کیا تمہارا خاندان مجھے قبول کرے گا۔“ اپنے دل کا دوسرہ میں لیوں تک لے آئی۔

”مجھے کسی کی پروا نہیں سوائے تمہارے، اگر تم میرے ساتھ ہو تو میں ساری دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس نے والہانہ انداز

میں میرا ہاتھ تھام لیا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں وجاہت۔“

مجھے ایک ہل میں اپنی وہ بے عزتی یاد آگئی جو پچھلے ہفتہ فرہاد کے ہاتھوں اس سے ہوئی، جب میری ماں اور بھابی دعوت کا اہتمام کر کے مجھے فون کرتی رہیں اور فرہاد نے میرے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

”تمہاری اماں کو دعوت کا دن مجھ سے پوچھ کر رکھنا چاہیے تھا۔ آج تو میرے دوست مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے شاید میرے لیے کوئی اہتمام وغیرہ کیا ہے۔“

یہ جانے بنا کہ اس کا انکار میرے لیے کتنی تکلیف کا باعث بنا ہے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں اپنی ماں کو کس طرح منع کروں اور پھر فرہاد سے اجازت لیے بنا میں ٹیکسی کروا کر اپنی بچیوں کے ساتھ اماں کی طرف چلی گئی۔

”فرہاد گھر میں نہیں تھا اسے اپنے کسی دوست کے گھر جانا تھا۔“

میں نے گھر کے ہر فرد کے سوال کا ایک ہی جواب دیا اور پھر میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر کسی نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ رات کو احسان نے مجھے گھر چھوڑ دیا جہاں اب مجھے فرہاد کا سامنا کرنا تھا۔ جو ایک الگ کہانی تھی، مگر سچ تو یہ تھا کہ اب مجھے اس کا کوئی ڈر و خوف نہ رہا تھا۔ اس دن اپنی ہونے والی بے عزتی یاد کرتے ہی میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”مت رونا، اگر تم نہیں چاہتیں تو میں دوبارہ تم سے ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جو تمہیں تکلیف دے۔“ جانے میرے رونے سے وہ کیا سمجھا۔

”نہیں وجاہت میں تمہاری کسی بات پر نہیں رورہی مجھے تو کچھ اور ہی یاد آ گیا تھا۔“

اسے جواب دے کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیچے جا کر مریم کا ہوم ورک مکمل کر دانا تھا اس کا پہلا پیپر تھا۔

”بہر حال نعیب میری بات پر غور کرنا اور کوشش کرو جلد از جلد کسی فیصلہ پر پہنچ جاؤ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔“ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اب مجھے بھی مزید فرہاد کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ اس لیے جو بھی کرنا تھا، جلد ہی کرنا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ میں پہلے فرہاد سے طلاق لوں کیوں کہ اس کے بغیر میں وجاہت سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔



گھر کے اندر قدم رکھتے ہی وہ اپنی جگہ ساکت ہو گئی، سامنے موجود بڑا سا آم کا درخت جس کی چھاؤں میں تنہا کھیلنے، جانے اس کی کتنی دوپہریں گزری تھیں۔ وہ ہی باورچی خانہ جہاں آج بھی اسے اپنی ماں دکھائی دی۔ جو جلدی جلدی اس کے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ جانتی تھی کہ کھانے کے نام پر جو بھی روکھی سوکھی ہوگی اس کی بیٹی نے سکول سے آکر صبر و شکر کے ساتھ کھا لینا ہے۔

بے اختیار اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں اس کا ماضی بے شک تکلیف دہ تھا، مگر اپنی ماں کا ساتھ وہ کبھی نہ بھول سکتی تھی۔ ابھی بھی اسے آلو کے پرائٹ کے ساتھ اچار کی تیز خوشبو نعتوں میں تھمتی محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار ہی کچن کی جانب بڑھی جو دیران سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ ہی گھر تھا، وہ ہی حبیبہ، سب کچھ وہی ہی تھا سوائے ایک ماں کے، جو اپنوں کے دیئے ہوئے دکھ اور تکلیفیں بھگت کر رہا عدم سدھا رہ گئی تھی، وہ رو پڑی وہ آنسو جو جانے کب سے رکے ہوئے تھے تمام بندھن توڑ کر آزاد ہو گئے۔

اسی دم کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش تلی دینے کی کوشش کی، جیبہ نے پلٹ کر دیکھا شاہ زین اس کے نہایت قریب کھڑا تھا۔ جیبہ کا دکھ اس کے چہرے پر بھی گزرا تھا اس نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

”اس طرح مت رو جیبہ تمہاری ماں کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔ جانتی ہو تمہاری آنکھ میں آیا ایک آنسو تمہاری ماں کو کس قدر پریشان کرتا تھا۔“

شبانہ بھابی نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے سمجھایا۔

”آؤ میرے ساتھ گھر چلو، امی آخری وقت تمہیں بے حد یاد کر رہی تھیں تمہاری امی کا دیا ہوا ایک باکس ان کے پاس رکھا تھا جو وہ مجھے دے گئیں۔ وہ تمہاری امانت ہے مجھ سے آکر لے لو۔“

شبانہ بھابی نے اسے فاطمہ آنٹی کا حوالہ دیا اور وہ خاموشی سے ان کے ساتھ آگئی، ہنا کوئی سوال جواب کیے اور اپنی ماں کا وراثت میں چھوڑا وہ باکس ان کے ہاتھ سے تمام لیا جس میں جانے کیا تھا؟ یہ جاننے کی جستجو میں اس کا سارا بچپن گزر گیا، مگر ماں نے کبھی وہ باکس جیبہ کو نہ دیا اور آج ماں کی اس آخری جمع پونجی کی وہ واحد حق دار ٹھہری۔ وہ آج بھی جانا چاہتی تھی کہ اس میں ایسا کیا ہے جو ماں نے ساری زندگی سنبھال سنبھال کر رکھا، مگر وہ باکس اسے تنہائی میں کھولنا تھا اس وقت کسی کے سامنے وہ اپنی ماں کی زندگی کا مزید کوئی راز کھولنا چاہتی تھی۔

”یہ اس کی چابی ہے؟“ شبانہ بھابی نے کی چین کے ساتھ ایک چابی بھی اس کی جانب بڑھائی جسے اس نے خاموشی سے تمام لیا۔

”اچھا شبانہ بھابی اب میں چلتی ہوں پھر زندگی رہی تو آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔“

اس نے شبانہ بھابی کے ہاتھ تھامتے ہوئے ان سے اجازت چاہی۔

”ارے اتنی جلدی کہاں جا رہی ہو، میں نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے کھا کر جانا۔“ ان کے لہجہ میں پرانی محبت آج بھی جھلک رہی تھی۔

”میں ضرور کھانا کھاتی آپ کے گھر سے، مگر میری دو گھنٹہ بعد واپسی کی فلائٹ ہے اور مجھے قبرستان سے ہوتے ہوئے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔“

انہیں آہستہ آہستہ اپنا پروگرام بتا کر وہ شاہ زین کی سگت میں باہر نکل آئی جہاں سامنے ہی وہ گاڑی کھڑی تھی جس میں بیٹھ کر اس نے واپسی کا سفر شروع کرنا تھا۔



مریم نے جگنو کو دھکا دے کر گرا دیا وہ زور زور سے رونے لگی، ایسے میں مجھے جانے کیا ہوا جو بچن سے باہر نکلتے ہی بے دردی سے مریم کو پیٹ ڈالا۔ اس کے رونے کی آواز سن کر فرہاد کمرے سے باہر نکل آیا اور مجھے اس طرح مریم کو پیٹنا دیکھ کر حیران رہ گیا کیوں کہ میں کبھی بھی بچوں کو اس بے دردی سے نہیں مار کرتی تھی۔ اس وقت شاید میں اپنی ٹینشن میں تھی یا فرہاد سے نجات حاصل کرنے کے لیے شروع کی جانے والی کوششوں میں یہ میرا پہلا قدم تھا، وجہ جو بھی تھی مگر میں یقیناً اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

فرہاد نے تیزی سے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے گھسیٹ کر پیچھے کیا مریم کو مار کھانا دیکھ کر جگنو بھی چلا رہی تھی۔

”تم پاگل ہو گئی ہو کیوں اس طرح بے دردی سے بچی کو پیٹ رہی ہو۔“ مریم کو اپنے پیچھے کرتے ہوئے وہ مجھ پر دھاڑا۔

”ہاں تم سب لوگوں نے مل کر مجھے پاگل کر دیا ہے۔“

میری آواز فرہاد سے بلند تھی ایک پل کو وہ حیران رہ گیا۔

”ہر وقت کی کچ کچ نے تھکا دیا ہے مجھے، فرہاد تمہیں احساس ہے کہ تمہاری کئی دنوں تک مجھ سے بلاوجہ ناراضی اس اکیلے گھر میں مجھے کتنی اذیت دیتی ہے۔ بجائے مجھ سے بات کرنے کے تم ٹی وی پر آنے والی بے ہودہ فلموں میں تسکین تلاش کرتے ہو اور اس وقت جب مجھے تمہاری ضرورت ہوتی ہے تم مصلے سنبال کر نقلی عبادت میں مصروف ہو جاتے ہو۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ حقوق اللہ پورے کرنے سے پہلے حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے۔“

تمہاری بیوی اپنی ضرورت کو ترستی ہے اور تم دنیا دکھا دے کے لیے اللہ کی عبادت میں مصروف ہوتے ہوتا کہ صبح اٹھ کر اپنی بہن کو بتا سکو کہ آج رات میں نے اتنے نفل ادا کیے اور وہ خراج تحسین کا تاج تمہارے سر پر پہنا دے واہ فرہاد واہ! میں اس گھر میں زندہ جاگتی ہستی اپنی ضروریات سمیت کہیں دفن ہو چکی ہوں اور تمہیں اس کا احساس نہیں۔“ اپنے دل کا ہر دکھ آج مجھے اس ظالم شخص کے سامنے بیان کرنا تھا جو غلطی سے میرے مجازی خدا کے عہدے پر فائز تھا۔

”تم واقعی ہی پاگل ہو چکی ہو جو بچوں کے سامنے اس طرح کی گھٹیا بکواس کر رہی ہو اور میری نقلی عبادت پر انگلیاں اٹھاتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔“ وہ ذرا بھی شرمندہ نہ ہوا۔

”اسی لیے تو کہتا ہوں تمہاری کسی نے اچھی تربیت نہیں کی ورنہ تم کبھی بھی اسی طرح کی بات نہ کرتیں، ایسی باتیں بچوں کے سامنے کر کے تم انہیں بھی اپنے جیسا بے حیا بنا چاہتی ہو۔“

مجھ پر پھنکارتا ہوا وہ کمرے کی جانب واپس پلٹا جب میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی۔

”مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا فرہاد مجھے تم سے طلاق چاہیے۔“

آج میں ہر قصہ ختم کرنا چاہتی تھی۔

”ہٹو میرے راستے سے۔“ اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر دور ہٹانا چاہا۔

”مجھے تم سے طلاق چاہیے فرہاد ابھی اور اسی وقت۔“ میں اپنے موقف پر سختی سے قائم رہتے ہوئے چلائی۔

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ذہن بے.....“ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتا ہوا بولا۔

”اتنی ہوس کہ کچھ دن میں نے منہ نہ لگایا تو تم طلاق پر آگئیں لعنت ہے تم پر۔“ اس کے الفاظ تھے یا انگارے میں مجلس کر راکھ ہو گئی۔

”اور اگر تم یہ سمجھتی ہونا کہ میں تمہیں طلاق دے کر آزاد کردوں گا تو یقیناً یہ تمہاری بھول ہے۔“

میری گردن پکڑ کر اس نے مجھے دیوار سے لگا دیا، مریم اور زور زور سے رونے لگی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھے جان سے مار دے گا۔

”نہ اب تمہیں کبھی منہ لگاؤں گا اور نہ ہی طلاق دوں گا تمہاری کتے جیسی حیثیت کردوں گا اس گھر میں پھر دیکھوں گا تم کیا کرتی ہو۔“

مجھ پر نفرت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے وہ پھنکارتا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے سامنے فرہاد کی شکل میں کوئی سانپ

کھڑا ہو۔ اس کے چہرے پر میرے لیے اتنی حقارت اور نفرت تھی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔
اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ فرہاد مجھ سے نفرت کرتا ہے، بے حد نفرت جس کی وجہ میری سمجھ میں صرف اتنی آئی کہ میں اس کی بہن کو پسند نہیں اور وہ صرف میرے خلاف فرہاد کے کان بھرتی ہے جبکہ فرہاد مردوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جو کانوں کے کچے ہونے کے باعث اپنی زندگیاں دوزخ بنا لیتے ہیں اور شاید ایسا ہی کچھ اب اس کے ساتھ بھی ہونے والا تھا۔



صبح سویرے ہی اماں، احسان کو ساتھ لیے میرے گھر آن پہنچیں ان کا سنا ہوا چہرہ اس بات کا غماز تھا کہ دکان پر جاتے ہی فرہاد نے انہیں فون کر کے میری شکایت لگائی ہے، احسان بھی ہمیشہ کی نسبت خاصا خاموش تھا۔
”نہن پتر یہ میں کیا سن رہی ہوں؟“

میرے سلام کے جواب میں انہوں نے تشویش زدہ لہجہ میں میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ایسے میں شاید میری پریشان حال ماں نے میری سوچی ہوئی سرخ متورم آنکھیں قطعی نظر انداز کر دیں ورنہ وہ پہلا سوال یہ کرتیں کہ میری بچی ٹو کیوں اتنی دکھی ہے تجھے کیا ہوا ہے، مگر شاید بیٹیوں کے زبردستی گھر بسانے کی خواہش ماؤں کو ان کے دکھوں سے نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔

”ایسا کیا سن لیا اماں جی آپ نے جو صبح سویرے جواب طلبی کے لیے آگئی ہیں۔“ میں نے حتی الامکان اپنے لہجہ کو تلخ ہونے سے روکا۔

”دیکھو بیٹا لڑائی جھگڑے تو ہر گھر میں ہو جاتے ہیں کون سے میاں بیوی ہیں جو آپس میں نہیں لڑتے احسان اور اس کی بیوی کو ہی دیکھ لو ہر ہفتہ ہی جھگڑتے ہیں پھر صلح بھی ہو جاتی ہے۔“ ان کی باندھی جانے والے تمہید نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھیں۔

”مگر بیٹا اس طرح اتنا بڑا لفظ کوئی شریف عورت منہ سے نہیں نکالتی“ اس کا لہجہ تاسف بھرا تھا۔
”عورت کا تو دوسرا نام ہی مبرورداشت ہے سب کچھ جمیل کر اپنا گھر آباد کرنا ہی ایک شریف عورت کی نشانی ہے۔“
”اماں ایک بات تو بتائیں۔“ میں ان کے سامنے نیچے زمین پر ہی بیٹھ گئی۔
”کیا گھر آباد کرنا صرف ایک عورت کی ذمہ داری ہے۔ کوئی مرد یہ کوشش کیوں نہیں کرتا کہ اس کا گھر آباد رہے، کیا شرافت کا لفظ صرف عورت سے منسوب ہے یہ ہی شرافت مرد میں کیوں نہیں ہوتی۔“
”ٹو بہت جھلی ہے نہن سوچ ذرا اگر فرہاد شریف مرد نہ ہوتا تو تیرے طلاق کے مطالبہ پر تجھے نکال گھر سے باہر نہ کرتا؟“

اپنے ہمیں انہوں نے فرہاد کو شریف ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
”اور آپا میں تو تمہیں ویسے بھی بہت مبرور شکر کرنے والی سمجھتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ فرہاد بھائی کا رویہ تم سے کیسا ہے اور تم پھر بھی ہم سب کی عزت کے لیے اس کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہو اب آپا اس عمر میں اگر ہماری عزت کو اس طرح خراب مت کرو۔“

مجھے احسان کے الفاظ سن کر حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا۔ میرے متعلق سب کچھ جان کر بھی مجھ سے امید کی جارہی تھی کہ میں اپنے سے منسوب تمام لوگوں کی عزت کا خیال رکھوں، سب کو اپنی عزت کی پڑی تھی، میں زندگی کس تکلیف

سے گزار رہی ہوں اس کا کسی کو بھی احساس نہ تھا۔

”میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے مجھے امید ہے اب یہ کبھی ہمیں شرمندہ نہ کرے گی۔“

میں اس وقت جس چنی کش کش کا شکار تھی اس میں اماں کی بات کا جواب دینا میرے نزدیک قطعی اہم نہ تھا، مگر اب میرا ارادہ دوسروں کی عزت بچانے کے لیے اپنی زندگی خراب کرنے کا بالکل نہ تھا۔



”وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔“

میں نے وجاہت پر یہ بات واضح کرتے ہوئے کہا۔

”بچھلے ایک ماہ میں اس کا رویہ مجھ سے نہایت بدتر ہے، شاید وہ اس امید میں ہے کہ میں اس سے اور یا سمینن آپا سے معافی مانگوں۔ اپنی بہن کی بے عزتی اسے میرے قریب نہیں آنے دیتی۔ میری حیثیت اس گھر میں ایک غیر ضروری اور فالتو شے سے زیادہ کچھ نہیں، میں صرف وہاں ایک کونے میں پڑا کٹھ کھاڑ ہوں اور بس.....“

میں رو رہی تھی شاید اتنے عرصہ میں آج پہلی بار میں نے اپنا ایک ایک دکھ وجاہت کے سامنے کھول دیا، وہ حیرت سے منہ کھولے میری ہر بات سن رہا تھا۔

”وہ بہت ضدی انسان ہے وجاہت اسے جب سے یہ احساس ہوا کہ میں اپنی ضرورت کے لیے ترس رہی ہوں وہ مجھے مزید ترسار رہا ہے وہ بہت گھنیا مرد ہے۔“ میں کیا کہنا چاہتی تھی وجاہت سمجھ چکا تھا۔

”میری ماں، میرا بھائی سب یہ کہتے ہیں مجھ جھکنا چاہیے کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کے مقدر میں ہمیشہ جھکنا ہی لکھا ہے، جبکہ مرد تو ایک تناور درخت ہے جو سیدھا کھڑا رہ کر عورت کو چھاؤں ضرور دیتا ہے لیکن اگر اسے جھکانے کی کوشش کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے اور پھر عورت اس کی چھاؤں سے محروم ہو جاتی ہے اب میں اپنی ماں کو کیسے سمجھاؤں کہ فرہاد تو ایک ایسا درخت ہے جس کی چھاؤں بھی صرف دوسروں کے لیے ہے۔“

میں آج وجاہت سے اپنے دل کی ہر بات کہہ دینا چاہتی تھی۔

”میں تمہاری ہر بات سمجھ گیا ہوں نہ نب، پھر بھی یہ سوچو کہ بنا طلاق تم مجھ سے نکاح کیسے کروں گی۔“ اس کی پریشانی بجا تھی۔

”اس مسئلہ کا بھی میرے پاس ایک حل ہے۔“

فرہاد سے کس طرح نجات حاصل کرنی ہے یہ سب آج سوچ کر ہی میں وجاہت سے ملنے آئی تھی۔

”ہم دونوں یہاں سے بھاگ کر کسی دوسرے شہر چلے جائیں پھر میں کورٹ سے خلع لے لوں گی۔“ میں طے کر چکی تھی کہ اب مجھے فرہاد کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں نے مزید کہا۔

”تمہارے ساتھ بھاگنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی غیرت مند مرد کسی ایسی عورت کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا جو کسی غیر مرد کے ساتھ تہا دوا تین دن گزارے اور جب میں ایسا کر لوں گی تو یقیناً جانو فرہاد مجھ پر لعنت بھیج دے گا۔ تمہارے ساتھ گھر چھوڑنے کے بعد وہ مجھے کبھی قبول نہ کرے گا اور میری ایک درخواست پر مجھے خود طلاق دے دے گا۔“

اب میری ساری پلاننگ وجاہت کی سمجھ میں آگئی۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں نہ نب تم جب کہو ہم یہاں سے حیدر آباد چلے جائیں گے وہاں میرا بھائی رہتا ہے۔“

”مجھ سے ایک وعدہ کرو وجاہت مجھے کبھی بری عورت سمجھ کر تنہا نہ چھوڑنا۔“ میرے دل کا خوف لبوں تک آ گیا۔
 ”تم بری عورت نہیں ہو زینب، تمہیں تو فرہاد جیسے مرد نے برا بننے پر مجبور کر دیا۔ کوئی بھی شادی شدہ عورت اگر کسی غیر مرد کے ساتھ محبت کے مراسم استوار کرتی ہے تو اس کے پیچھے اس کا اپنا شوہر ہوتا ہے جو اسے ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے، ورنہ شوہر کا بخشا ہوا اعتماد اور محبت کبھی کسی عورت کو بھٹکنے نہیں دیتا۔“ اس نے میرے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔
 ”ایک بات اور وجاہت اب تم کچھ عرصہ فائزہ کے گھر مت آنا اور نہ ہی مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا اس وقت تک جب تک میں تمہیں فون کر کے خود نہ بلاؤں، دوسری بات یہ کہ جب تم مجھے لینے آؤ تو یہ بات ذہن میں رکھنا جیبہ میرے ساتھ ہوگی میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”تم چاہو تو مریم اور جاذبہ کو بھی لے لو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ کھلے دل سے بولا۔
 ”نہیں صرف جیبہ، وہ دونوں اپنے باپ کے ساتھ رہیں گی میں اسے کسی ذمہ داری سے آزاد چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔“ میں نے سخت لہجہ میں کہا۔

”کاش! جس دن میں نے مریم کو مار کر اپنی بھڑاس نکالی تھی اس دن فرہاد مجھے سمجھ جاتا، مجھے منالیتا اور اپنی ضد ختم کر دیتا مگر افسوس اس نے ایسا نہ کیا، اس کے غصہ اور نفرت نے میرا گھر برباد کر دیا۔“
 اپنی کہانی سناتے سناتے وہ عورت اس طرح بلک بلک کر رونے لگی کہ سامنے بیٹھی لڑکی کا یکسوئی سے چلتا ہوا قلم رک گیا اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ اس دیکھی عورت کو کس طرح قتل دے۔

”پلیز زینب آپ روئیں مت اللہ سے اپنے ہر گناہ کی معافی مانگیں مجھے امید ہے کہ وہ نہ صرف آپ کو معاف کرے گا بلکہ آپ کی زندگی میں بہتری کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی ضرور پیدا کرے گا۔“
 اس لڑکی نے آگے بڑھ کر زینب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دینا چاہی۔

”اور آپ کا بہت شکریہ کہ نہ صرف آپ نے مجھ سے ملاقات کی، بلکہ اس قابل بھی سمجھا کہ مجھے اپنے تمام حالات تفصیل سے بتائے، ورنہ مجھے تو پہلے دن ہی یہ کہہ کر منع کر دیا گیا تھا کہ آپ کسی سے ملاقات نہیں کرتیں یہاں تک کہ جب سے آپ اس دارالامان آئی ہیں اپنے گھر کے کسی فرد سے بھی نہیں ملیں۔ جب کہ میں آپ کو یہ مشورہ دوں گی کہ پلیز ایک بار آپ اپنے شوہر سے ضرور ملیں کیونکہ جب میں یہاں آئی تھی وہ تب بھی باہر ہی بیٹھے تھے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں زینب، آپ ایک بار ان سے مل کر تو دیکھیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی آئندہ زندگی کے لیے کچھ اچھا راستہ نکل آئے۔“

”میں نے کورٹ میں خلع کے لیے درخواست دے دی ہے اور اب میری اس سے جو بھی ملاقات ہوگی، اس حوالے سے عدالت میں ہی ہوگی اس کے علاوہ میں اس شخص سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“
 اس لڑکی کی بات ختم ہوتے ہی زینب فرش سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور ہاں اگر ممکن ہو تو جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اور جو کچھ تم نے اپنے پاس لکھا ہے اس کی ایک کاپی مجھے اس دارالامان میں پہنچا دینا تاکہ میں اپنے سے منسلک لوگوں کو یہ بتا سکوں کہ فرہاد کس طرح کا مرد تھا۔ وہ باتیں جو میں کبھی کسی سے نہ کر سکی لکھے ہوئے مواد کی صورت میں تو انہیں دے سکتی ہوں نا اسی طرح شاید میری ماں میرے اندر کا دکھ جان سکے۔“

اتنا کہہ کر زینب وہاں رکی نہیں بلکہ انتظار گاہ سے باہر نکل گئی۔ اس لڑکی نے جس کا تعلق غالباً کسی اخبار سے تھا اپنے سامنے پھیلے تمام کاغذات سمیٹے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے یہ جان کر دکھ ہوا کہ کس طرح ہمارے غلط رویے گھروں کی بربادی

کا سبب بنتے ہیں اور جب تک گھر مکمل طور پر برباد نہ ہو جائیں وہاں رہنے والے کینوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ باہر لگی تو فرہاد ابھی بھی اپنی جگہ موجود تھا اس کا دل چاہا وہ ایک پل کو رکے اور فرہاد کے پاس جا کر اسے آئینہ دکھائے کہ دیکھو تمہاری بے اعتنائی، ضد، ہٹ دھرمی اور رشتوں کو اہمیت نہ دینے کی عادت نے کس طرح ایک عورت کو برباد کر دیا، مگر اس کا دل ہی نہ چاہا اور خاموشی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی دارالامان کا بڑا سا گیٹ عبور کر گئی۔



فتح محمد اپنی موٹر سائیکل کا پتھر لگوار ہا تھا جب اچانک اس کی نگاہ سامنے کالی چادر میں لپٹی اس سرد قد عورت پر پڑی جس کی چادر سے جھانکتی بڑی بڑی کالی آنکھیں دیکھ کر وہ چونکا۔ وہ نہ نوبت تھی جو لاکھ خود کو چادر میں چھپائے کھڑی تھی مگر فتح محمد سے نہ چھپ سکتی تھی جس کی تصدیق اس کی گود میں موجود بچی سے با آسانی کی جاسکتی تھی۔

”یہ اس وقت تنہا کہاں جا رہی ہے؟“ اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ ہی آیا۔

جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا اتنے سالوں میں اس نے کبھی نہ نوبت کو یوں تنہا کہیں آتے جاتے نہ دیکھا تھا۔ دل چاہا آگے بڑھ کر پوچھے مگر اس سے قبل کہ اپنے دل میں آئی بات کو وہ عملی جامہ پہناتا، یک دم ہی نہ نوبت کے پاس ایک سفید گاڑی آ کر رکی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کا تعلق یقیناً نہ نوبت کی فیملی سے نہیں تھا اور نہ وہ اسے کبھی یہاں سے پک نہ کرتا۔ اپنی چادر سنبھالتی نہ نوبت بڑے استحقاق سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی، فرائٹ بھرتی گاڑی فتح محمد کے قریب سے گزر گئی۔

جب ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کے نقوش اس پر واضح ہوئے اسے محسوس ہوا اس نے پہلے بھی اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔ کہاں اس نے اپنے دماغ پر زور دیا گاڑی ہر لمحہ اس سے دور ہوتی جا رہی تھی یک دم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

گاڑی میں موجود شخص کو اس نے اپنی گلی کی ایک زیر تعمیر بلڈنگ میں دیکھا تھا۔ غالباً وہ کوئی ٹھیکیدار تھا جس کا نام فی الحال اسے یاد نہ آیا مگر نہ نوبت اس شخص کے ساتھ اس طرح تنہا کہاں جا رہی ہے؟ حیرت کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں ایک بے چینی سی ابھر آئی۔ اب وہ جلد از جلد گھر جانا چاہتا تھا کہ سادیہ کو بتا سکے کہ آج اس نے نہ نوبت کو ایک غیر مرد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر جاتے دیکھا ہے۔ وہ سادیہ کو جتنا چاہتا تھا کہ نہ نوبت کے بارے میں اس کے خیالات اتنے غلط نہ تھے جتنے آج تک وہ سمجھتی آئی تھی۔



”تمہاری ماں کہاں ہے؟“

فرہاد کو کافی دیر ہو گئی تھی گھر آئے ہوئے مگر اسے نہ نوبت کہیں دکھائی نہیں دی، کچن کا دروازہ بھی بند تھا ہاتھ روم بھی خالی پڑا تھا، آخر کچھ دیر انتظار کے بعد اسے نہ چاہتے ہوئے بھی مریم سے سوال کرنا پڑا جو وہیں برآمدے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

”وہ حبیبہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی ہیں۔“

مریم کے بتاتے ہی اسے یاد آیا صبح نہ نوبت نے ذکر کیا تھا شاید حبیبہ کی طبیعت خراب تھی اور وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہتی تھی۔

اک ساگر ہے زندگی

”مگر میں نے تو شاید اسے ڈاکٹر کی فیس بھی نہیں دی پھر کس طرح وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔
”پاپا مجھے بھوک لگی ہے۔“

جاڑ بہ نے اس کا گھٹنا پکڑ کر ہلایا۔ فرہاد نے دیکھا تین بجنے والے تھے جانے ابھی تک زینب واپس کیوں نہیں آئی تھی، وہ اٹھ کر کچن میں آیا چاول اور سالن تیار رکھا تھا برتن میں کھانا نکال کر وہ واپس برآمدے میں آگیا کھانا کھاتے ہی جاڑ بہ سو گئی۔

چار بج گئے تھے ابھی تک زینب گھر نہ آئی تھی۔

اسے دکان پر واپس جانا تھا مگر اس کا دل نہ مانا اس طرح بچیوں کو اکیلا چھوڑ کر جانے کو۔

”دروازہ بند کرو مریم، میں تمہاری ماں کو دیکھ کر آؤں کس ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔“

باہر نکل کر وہ گلی کے کنارے پر موجود ڈاکٹر کے کلینک آیا جو اس وقت بند پڑا تھا، پھر وہ مین روڈ والی ڈسپنسری بھی دیکھ آیا زینب کہیں نہ تھی، غصہ کے ساتھ ساتھ اسے بے چینی بھی محسوس ہوئی۔
”ضرور سادیہ کے گھر ہوگی۔“

یہ خیال ذہن میں آتے ہی اس نے گھر جا کر مریم کو سادیہ کی طرف بھیجا جہاں سے وہ مایوس واپس آئی۔

”اماں ان کے گھر بھی نہیں ہیں۔“

اسے لگا شاید زینب ناراض ہو کر اپنے گھر چلی گئی ہے مگر وہ اس طرح بچیوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی، فرہاد اسے پچھلے کئی ماہ سے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔ جس کا احساس اس پر ہوتا ہی اسے ہلکا سا تاسف ہوا جس کے زیر اثر اس نے قریب رکھا فون اٹھا کر اپنے سسرال کا نمبر ملایا۔

”زینب تو کافی عرصہ سے ہمارے گھر نہیں آئی، کیوں خیریت تو ہے بیٹا کہاں ہے وہ؟“ زینب کے بارے میں استفسار کرتے ہی اماں بی تشویش زدہ لہجہ میں بولیں۔

”پتا نہیں شاید حبیبہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی ابھی تک واپس نہیں آئی۔“

اتنا کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، رات گئے تک وہ ہر اس جگہ زینب کو ڈھونڈ آیا جہاں سے اسے امید تھی۔ یہاں تک کہ اسفند بھائی کے ساتھ جا کر اس نے شہر کے سارے ہسپتال بھی دکھ لیے مگر زینب ایسی گم ہوئی کہ کسی کو مل کر ہی نہ دی۔ رات کے اس پہر جب پریشانی کے عالم میں پورا خاندان اس کے گھر جمع تھا، مریم کی ایک بات نے اس کے ساتھ ساتھ سب کو چونکا دیا۔

”بابا آپ امی کو فون کریں اور پوچھیں کہ وہ کہاں ہیں۔“

”مگر بیٹا تمہاری امی کے پاس تو فون بھی نہیں ہے پھر بھلا کیسے پتا چلے وہ کہاں ہیں۔“ فرہاد کے بجائے فضلہ بھابی نے اسے پیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

”امی کے پاس فون ہے آپ انہیں فون کریں۔“ وہ بھند تھی فرہاد نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

”امی اپنا فون یہاں چھپاتی تھیں۔“

یہ جاڑ بہ تھی جس نے اپنی بہن کی بات کی تصدیق کے لیے آگے بڑھ کر الماری کے دونوں پٹ وا کر دیئے۔ اپنی دونوں بیٹیوں کے اس انکشاف نے فرہاد کو گنگ کر دیا وہ حیرتی سے آگے بڑھا، الماری میں ہاتھ مار کر سارے کپڑے باہر پھینک

اک ساگر ہے زندگی

دیئے اور پھر اگلے چند سیکنڈوں میں اس کے ہاتھ میں ایک موبائل فون تھا جو یقیناً زینب افراتفری میں گھر چھوڑ گئی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا اسے محسوس ہوا جیسے سب کی موجودگی میں وہ ذلیل ہو گیا ہو۔

اسفند بھائی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے فون لیا، میموری چیک کی اس میں صرف ایک ہی نمبر تھا جو کسی کے نام سے محفوظ نہ تھا انہوں نے فوراً نمبر ملایا آگے کمپیوٹر کی ریکارڈنگ سن کر یہ واضح ہو گیا کہ مطلوبہ نمبر اس وقت بند تھا۔

○.....◇.....○

”میں اپنا فون گھر بھول آئی ہوں۔“

ہائی وے پر پہنچتے ہی اچانک زینب کو یاد آیا اس کا فون تو گھر ہی رہ گیا ہے تو وہ ہڑبڑا اٹھی۔

”وجاہت اپنی سم نکال کر پھینک دو اس میں صرف تمہارا ہی نمبر ہے اور اس طرح فراہم تک پہنچ جائے گا جبکہ میں نہیں چاہتی کہ خلع کے کیس سے قبل وہ تم تک پہنچے۔“

وجاہت نے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور جیب سے موبائل نکال کر اس کے حوالے کر دیا جس میں سے سم نکال کر زینب نے باہر پھینک دی اس طرح اپنی طرف سے اس نے سارا مسئلہ حل کر دیا مگر درحقیقت ایسا نہ تھا وجاہت کے نمبر سے اس تک پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

○.....◇.....○

”زینب گھر سے بھاگ گئی ہے۔“

فضہ بھابی کے اطلاع دیتے ہی صباحت نے نازیہ کو فون ملا کر یہ خبر سنائی۔

”صباحت باجی سالار کہاں ہیں وہ آپ کی طرف آئے تھے۔“

یہ صباحت کی بات کا جواب نہ تھا اسے نازیہ کچھ گھبرائی ہوئی لگی۔

”میرا خیال ہے وہ صمد کے ساتھ ہے اور تم نے شاید میری بات سنی نہیں، میں نے تمہیں بتایا کہ زینب کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔“

”میں نے آپ کی بات سن کر ہی سالار کا پوچھا کیوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سالار کے ساتھ نہ بھاگ گئی ہو۔“

”کیا مطلب.....“

اب حیران ہونے کی باری صباحت کی تھی۔

”جب میں پاکستان میں تھی تو مجھے کئی بار محسوس ہوا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی چکر چل رہا ہے، میں نے تو سالار کو اجازت بھی دی تھی کہ وہ زینب سے شادی کر لے۔“ زینب کی گمشدگی نے نازیہ کو ہر راز کھولنے پر مجبور کر دیا اس کا کیا جانے والا ہر انکشاف صباحت کو حیران کرتا گیا۔

”مگر جانے کیوں وہ نہ مانا اور زینب نامی تلواریجھ پر اس وقت تک لٹکتی رہی جب تک آپ نے میری گود میں شاہ زین نہ ڈالا۔ پھر شاہ زین کے آتے ہی اس کا رویہ مجھ سے خاصا تبدیل ہو گیا۔ اب اتنے سالوں بعد زینب کا غائب ہونا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وہ کوئی اچھی عورت ہی نہ تھی۔“

”فضہ بھابی تو بتا رہی تھیں کہ جیبہ بھی شاید اسی آدمی کی بیٹی تھی جس کے ساتھ وہ بھاگی ہے اسی لیے تو صرف اس کو ہی لے کر گئی ہے۔“

یہ دنیا تھی اور دنیا کے منہ میں جو آتا ہے وہ بولتی جاتی ہے۔ اسے اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ اس کی باتوں میں کتنی سچائی ہے اور کتنا مبالغہ آمیزی کا عنصر کھلا ہوا ہے اور ان کی یہ بے سرو پا باتیں کہاں تک کسی کو نقصان پہنچاتی ہیں



”یہ میری بیوی ہے۔“ وجاہت نے حیدر آباد اپنے بھائی کے گھر پہنچے ہی زینب کا پہلا تعارف اپنی بیوی کی حیثیت سے ہی کروایا۔

”آپ نے شادی کر لی اور اتنا عرصہ ہمیں خبر بھی نہ کی، خیریت ہے۔“

حبیبہ کو دیکھ کر ان دونوں میاں بیوی کے ذہن میں پہلا خیال یہ ہی آیا کہ وہ وجاہت کی بیٹی ہے جبکہ زینب بالکل خاموش تھی اور صرف ایک دن اور ایک رات ہی انہوں نے وہاں سکون سے گزاری اگلی صبح آنے والے فائزہ کے فون نے ان دونوں کو پریشان کر دیا۔

”فرہاد اور اس کے گھر والوں نے زینب کے اغوا کا پرچہ آپ کے خلاف کٹوا دیا ہے کیوں کہ زینب کے موبائل سے آپ کا نمبر مل گیا تھا اور پھر سادیہ کے شوہر نے بھی گواہی دی کہ اس نے زینب کو آپ کی سفید کمرولا میں بیٹھ کر جاتے دیکھا ہے۔“

فائزہ خود بھی بہت زیادہ پریشان تھی کیوں کہ پولیس اس کے پاس تفتیش کے لیے آچکی تھی اسے ڈر تھا کہ کہیں کسی بات کی زد میں وہ نہ آ جائے وہ بھی تھا ان دونوں کی ملاقات فائزہ ہی کے گھر ہوا کرتی تھی۔

”آپ لوگ وہاں سے کہیں اور چلے جائیں بنا نکاح اس طرح ساتھ رہنے کے جرم میں آپ کو سزا ہو سکتی ہے۔“

زینب کا کورٹ جا کر خلع کا کیس دائر کرنے کا ارادہ دھرا کا دھرا رہ گیا فی الحال سب سے ضروری تھا کہ خود کو متوقع گرفتاری سے بچایا جائے، لیکن اس سے قبل کہ وہ وہاں سے نکلتے پولیس نے انہیں دھریا گرفتاری کے بعد پتا چلا کہ پولیس کو یہاں کا پتا رابعہ نے دیا تھا جسے، وجاہت کے زینب کے ساتھ تعلقات بالکل پسند نہیں تھے۔



آج اس کی پیشی تھی کمر عدالت لوگوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا اس میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جنہیں کبھی زینب سے رشتہ داری کا شرف حاصل تھا۔ اس نے دیکھا سب سے آگے والی سیٹ پر فضا بھابی کے بالکل ساتھ فرہاد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے یاد آیا رات جیل پہنچتے ہی اس سے سب سے پہلی ملاقات فرہاد نے ہی کی تھی جو اس کے سامنے کھڑا اس طرح گڑگڑا رہا تھا کہ یاد آتے ہی زینب کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی اسے محسوس ہوا جیسے فرہاد بھی اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا ہے۔

”دیکھو زینب ہم سب کی عزت اسی میں ہے کہ تم صبح کورٹ میں یہ بیان دے دینا کہ تمہیں وجاہت نے اغوا کیا تھا اس طرح تم پر کوئی آج نہیں آئے گی اور تم بری ہو جاؤ گی۔“

”اچھا پھر.....؟“ اس کی بات سن کر زینب نے جیسے مڑا لیا۔

”پھر میں تمہیں گھر لے جاؤں گا اور کوشش کروں گا آئندہ مجھ سے کوئی ایسی غلطی نہ ہو جو تمہیں اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور کر دے۔“ وہ منت کرتا ہوا بولا۔

اک ساگر ہے زندگی

”شکر ہے تم نے اعتراف تو کیا کہ تمہاری غلطیوں نے مجھ سے یہ سب کروایا ہے، مگر فرہاد وقت گزرنے کے بعد یاد آنے والی غلطی پر صرف معافی مانگی جاسکتی ہے کیوں کہ غلطی ہو جانے کے بعد اسے سدھارنا اتنا آسان نہیں، جتنا تم نے مجھ رکھا ہے اب میری اور تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ مجھے طلاق دے دو۔“

وہ اب کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی اور فرہاد جب تک وہاں رہا اس کی ہر بات کا زینب نے ایک ہی جواب دیا اور وہ تھا ”طلاق“ فرہاد کے علاوہ زینب نے کسی بھی فرد سے ملنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ احسان اور اپنی ماں سے بھی نہیں ملنا چاہتی تھی اور اب عدالت میں پیش ہوتے ہی اسے وہ تمام لوگ نظر آئے جو رات جیل میں اس سے ملاقات کرنے پر ہنستے تھے۔

احسان اماں کے ساتھ ہی بیٹھا تھا اس کی ماں کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید تھا جس پر شرمندگی گڑھی ہوئی تھی اور سب کا ذمہ دار صرف ایک ہی فرد تھا اور وہ تھا فرہاد۔ زینب نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

”مسز زینب فرہاد.....“ وکیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے پکارا۔

”میری عدالت سے درخواست ہے مجھے صرف ام مریم کے نام سے ہی پکارا جائے اس کے علاوہ میری کوئی اور پہچان نہیں۔ کچھ بھی پوچھے بغیر میں یہ واضح کر دوں کہ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا، میں اپنی مرضی سے بھاگی ہوش و حواس و جاہت کے ساتھ گئی تھی۔ جس پر مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔“

”اس کے باوجود کہ آپ کسی شخص کے نکاح میں تھیں۔“

”یہ صرف نام کا نکاح تھا اس کے علاوہ میرا، سامنے بیٹھے اس شخص سے کوئی تعلق نہیں جس کا گواہ یہ خود ہے۔“ چہرے کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔

”دیے بھی و جاہت نے مجھے اکیلی جان کر صرف اپنے گھر میں پناہ دی تھی جس میں اس کا کوئی تصور نہیں محترم جج صاحب، مجھے طلاق چاہیے کیوں کہ میں اپنی زندگی خود جینا چاہتی ہوں۔ سمجھوتے والی زندگی نے اب مجھے تھکا دیا ہے۔“

زینب نے خلع کا کیس عدالت میں دائر کر دیا۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے اور ماننے کو بالکل تیار نہیں تھی اس کے بیان کے بعد دوسری پیشی میں ہی عدالت نے و جاہت کو بری کر دیا۔

”جب تک آپ کے مقدمہ کا فیصلہ نہ ہو آپ اپنی والدہ کے ساتھ جاسکتی ہیں۔“

اسے رہائی کے بعد جیل چھوڑنا تھی جس کے لیے عدالت نے اس کی ماں کا گھر منتخب کیا۔

”لیکن مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے نہایت اطمینان سے انکار کر دیا۔

”کیوں.....“

جج نے حیرت سے زینب کی جانب دیکھا۔

”میں اپنا فیصلہ کسی بھی دباؤ کے بغیر چاہتی ہوں۔“ اور جج اس کی بات فوای سمجھ گیا۔

”ٹھیک ہے آپ کو اختیار ہے آپ جہاں چاہے رہ سکتی ہیں۔“

”میری عدالت سے درخواست ہے کہ مجھے دارالامان بھیج دیا جائے کیوں کہ میرا اس دنیا میں کوئی ایسا سہارا نہیں جہاں جا کر میں رہ سکوں۔ مزید یہ کہ جب تک میں وہاں رہوں کسی کو بھی مجھ سے ملاقات نہ کرنے دی جائے کیوں کہ میں کسی سے

نہیں ملنا چاہتی۔“

نہنب کی درخواست قبول کر لی گئی اور اسے فوراً ہی دارالامان بھیج دیا گیا ابھی وہ کمرے عدالت سے باہر نہ نکلی تھی کہ اس کے راستے میں فرہاد آن کھڑا ہوا ایک عجیب بے بسی اس کے چہرے پر درج تھی۔

”میرے ساتھ چلو نہنب تم جو کہو گی وہ ہی ہوگا، مگر خدا کے لیے دارالامان مت جاؤ کیونکہ تم نہیں جانتی وہ کیسی جگہ ہے۔“

دارالامان سے منسوب کہانیوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔

”وہاں میرے علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں رہتی ہیں جو کسی کی بہن اور بیٹیاں ہیں۔“ فرہاد کو جواب دے کر وہ آگے بڑھ گئی۔

اور پھر ایک دن دارالامان میں اس سے ملنے سالار آیا جس کے چہرے پر نہنب کے لیے دکھ آج بھی موجود تھا۔
”یہ میرا فون نمبر ہے نہنب تمہیں جب بھی میری ضرورت ہو پکار لینا میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ کھڑا ملوں گا۔“ جاتے جاتے وہ اسے اپنا کارڈ دے گیا۔

ایک دن اماں بھی آئیں جو اس کے لیے بے حد پریشان تھیں۔

”نہنتی ضد کر نہنب مان جا ابھی بھی وقت ہے فرہاد بہت شرمندہ ہے۔ وہ اپنی ہر غلطی کا ازالہ کرنے کو تیار ہے اسے معاف کر دے۔ وہ تو سب جاننے کے باوجود حبیبہ کو بھی اپنانے کو تیار ہے۔“ اماں کی بات سنتے ہی وہ چوکی۔

”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں اماں کھل کر کہیں۔“

دیکھ پتراب تو سب کو پتا لگ گیا ہے کہ حبیبہ وجاہت کی بیٹی ہے تو جانے کب سے فائزہ کے گھر اس سے چھپ کر ملتی تھی۔“

اس کی ماں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ نہنب بالکل خاموش ہو گئی کیوں کہ وہ ایک جھوٹی بات کی وضاحت دے کر سے سچا کرنے کے حق میں نہ تھی۔ اسے افسوس ہوا لوگوں نے بنا سوچے سمجھے کتنی من گھڑت باتیں یہاں وہاں پھیلا دی تھیں۔

”جب تک خلع کا فیصلہ ہونے کے بعد عدت پوری نہ کر لوں تم مجھ سے ملنے یہاں مت آنا۔“

ماں کے جاتے ہی اس نے وجاہت کو فون کر کے دارالامان آنے سے منع کر دیا۔

○.....❖.....○

وہ گھر آیا تو دروازے کے باہر کھڑی کالی گاڑی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”کریم دین کون آیا ہے؟“

اندر داخل ہوتے ہی اس نے گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے سوال کیا۔

”حبیبہ بی بی کے کوئی رشتہ دار ہیں جی، ان سے ملنے آئے ہیں۔“

”حبیبہ کے رشتہ دار.....!“

کریم دین کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔ وہ ڈرائنگ روم کا پردہ ہٹا کر جیسے ہی اندر داخل ہوا سامنے صوفہ پر موجود عمیر لغاری کو دیکھتے ہی ناگواری کی ایک لہری اس کے چہرے پر ابھر آئی جبکہ اس کے ساتھ موجودہ سادہ سی خاتون اسے پہلے

بھی کہیں دیکھی ہوئی لگیں۔

”السلام علیکم!“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سلام کرنا پڑا۔ اس نے دیکھا حبیبہ کے علاوہ کمرے میں موجود دیگر افراد کچھ پریشان سے تھے۔

”ولیکم السلام!“ اس خاتون کا انداز خاصا شفقانہ تھا۔

”تمہیں شاید یاد نہیں شاہ زین یہ میری آنٹی فائزہ ہیں جن سے تم پہلے بھی ایک بار مل چکے ہو۔“

”اوہ.....“ حبیبہ کے یاد کراتے ہی وہ انہیں فوراً پہچان گیا۔

”عمیر لغاری ان ہی کا بیٹا ہے۔“

یہ انکشاف اس کے لیے خاصا حیران کن تھا کیوں کہ حبیبہ نے ایسا ذکر اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

”بیٹھ جاؤ شاہ زین۔“

سالار نے اسے کھڑے دیکھ کر اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ بے چین سا تھا، وجہ شاید یہ تھی کہ اسے عمیر لغاری کا

اس طرح اپنے گھر آنا ذرا اچھا نہیں لگا تھا۔

”یہ لوگ حبیبہ کے رشتہ کے لیے آئے ہیں۔“

”واٹ.....“

اپنے پاپا کی فراہم کردہ اطلاع سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ویسے تو حبیبہ جب سے اس کی زندگی میں آئی تھی اس کا ہر

دن ایک نئے انکشاف کا دن ہوتا، مگر ان میں یہ انکشاف بالکل ناقابل یقین تھا۔

”ہاں.....“

پاپا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”اور ان کی یہاں آمد حبیبہ کی منشا کے عین مطابق ہے کیوں وہ خود بھی یہ ہی چاہتی ہے۔“

سالار نے اپنے بیٹے سے لگا ہوا چراتے ہوئے مکمل وضاحت دی۔

”پھر میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔“

وہ لوگ غالباً کافی دیر سے آئے ہوئے تھے اس لیے شاہ زین کے آتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ حبیبہ، پاپا اور ماما جب

انہیں باہر گیٹ تک چھوڑ کر واپس آئے تو شاہ زین ابھی تک اسی ہال میں اپنی جگہ کھڑا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے حبیبہ.....“

حبیبہ کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اس دن سے کر رہا ہوں جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا

پھر یہ لوگ درمیان میں کہاں سے آ گئے۔“

اپنے ماما پاپا کی وہاں موجودگی وہ قطعی نظر انداز کر بیٹھا۔

”ریلیکس شاہ زین میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

اپنے بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے وہ اسے پرانی والی حبیبہ نظر آئی جو اس کے ساتھ لاہور گئی تھی بالکل اجنبی پُر غرور اور اپنے

خول میں بند حبیبہ.....

”میں جانتی ہوں تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“
دھیمے دھیمے بات کرتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

”اور یہ بات میں اس دن سے جانتی ہوں جس دن میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ اور آج بھی مجھے تمہاری محبت سے کوئی انکار نہیں، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تم سالار انکل کے بیٹے نہیں ورنہ یقیناً جانو تمہاری محبت میری خوش قسمتی ہوتی۔ دکھ تو صرف یہ ہے کہ تمہارا تعلق اس خاندان سے ہے جو میری ماں کی بربادی کا ذمہ دار تھا۔ تم میرے سگے چچا کے بیٹے ہو، تم ایٹال کے سگے بھائی ہو اور میں کسی بھی صورت اس خاندان سے اپنا کوئی رشتہ باقی رکھنا نہیں چاہتی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے حبیبہ جو بلاوجہ دوسروں کے پیچھے اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ بھول جاؤ کہ ایٹال اور اس کے خاندان سے میرا کوئی تعلق ہے۔ صرف یہ یاد رکھو کہ میں شاہ زین سالار ہوں جو تم سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ نہ کرو حبیبہ میرے ساتھ ایسا، شاید تمہارے بغیر میں مر جاؤں گا۔“

حبیبہ کے چہرے پر نظر آنے والی ضد نے اسے گڑگڑانے پر مجبور کر دیا۔ اس لمحے سالار کو ایسا لگا جیسے اس کے سامنے زینب کھڑی ہو بالکل ایسی ہی ضدی اور خود سر۔ وہ جان چکا تھا کہ اب حبیبہ نے شاہ زین کی کوئی بات نہیں ماننی اپنے بیٹے کی سامنے نظر آنے والی شکست اس سے دیکھی نہ گئی اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔



اس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا جب اسے ایک لرزہ خیز خبر نے ہلا دیا۔
فرہاد کو نیند کی حالت میں ہونے والا ہارٹ ایٹک جان لیوا ثابت ہوا۔ فرہاد مر گیا۔ اس کی موت کی خبر نے زینب کو لرزا دیا۔ وہ دارالامان کے کمرے میں تنہا پھوٹ پھوٹ کر رو دی جب اس سے ملنے اماں جی آگئیں۔ فرہاد کی بے وقت موت نے انہیں بھی دکھی کر دیا تھا۔
”میں کہتی تھی نا زینب وہ تجھ سے بہت محبت کرتا ہے، مگر کچھ مرد شاید اپنی محبت اپنے اندر چھپا کر رکھنا مردانگی سمجھتے ہیں۔ وہ بھی ان ہی مردوں میں سے تھا اسی لیے تیرے طلاق کے مطالبے نے اسے مار دیا۔“
”پتا نہیں اماں میرے مطالبے نے اسے مارا یا دنیا کی بے عزتی کے خوف نے اس کی جان لی۔“ وہ ابھی بھی بے اعتبار تھی۔

”نہیں زینب میرا بھائی تم سے بہت محبت کرتا تھا۔“
اماں کے پیچھے روتی ہوئی یا سمین آپا بھی اندر آگئیں۔

”اپنے شوہر کی بے اعتنائی کا بدلہ میں نے ہمیشہ اسے تم سے متنفر کر کے لیا کیوں کہ وہ میری بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتا تھا۔ مگر میں نہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا میری چھوٹی چھوٹی غلطیوں نے تم دونوں کو برباد کر دیا خدا مجھے معاف کرے۔“

وہ اس وقت رو رہی تھیں جب ان کے رونے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

طلاق یافتہ نہ سہی وہ بیوہ تو ہوئی تھی نا، اس حوالے سے عدت اس کا حق ٹھہری اپنی عدت کی مدت اس نے دارالامان ہی ہی رہ کر پوری کرنے کا فیصلہ کیا وہیں اسے پتا چلا کہ اسفند بھائی ساری جائیداد بیچ کر کراچی چلے گئے۔ جاتے ہوئے فصد

بھابی مریم کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں جبکہ جاذبہ کو مباحثہ دینی لے گئی۔ اس طرح اس کا آشیانہ تنکوں کی طرح گھر گیا۔ مدت ختم ہوتے ہی اس سے اماں ملنے آئیں تو بے حد کمزور اور بیمار سی لگیں۔

”احسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سعودیہ جا رہا ہے، میں بھی اس کے ساتھ جا رہی ہوں۔“

”یہ میرے گھر کی چابیاں ہیں زینب ہم شاید اسی ہفتہ چلے جائیں تو جب چاہے یہاں سے اپنے گھر جاسکتی ہے۔“
چابیوں کا گچھا اس کے سامنے رکھ کر اماں واپس چلی گئیں۔ زینب نے گھٹنوں پر رکھا اپنا سر اٹھایا اسے ایک مدت چاہیے تھی یہ فیصلہ کرنے میں کہ اس سودو زیاں کے سفر میں اس نے کیا کھویا اور کیا پایا شاید کچھ حاصل کیے بنا ہی اس نے سب کچھ کھو دیا۔



”مجھ معاف کرنا وجاہت میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔“

وجاہت کو سفید دوپٹے میں ملبوس وہ عورت زینب نہ لگی۔ یہ تو کوئی اور ہی عورت تھی جس کی صرف شکل زینب سے ملتی تھی۔

”میں جو ساری زندگی فرہاد کی محبت کے لیے ترستی رہی مرتے مرتے وہ مجھے اپنی محبت کا ایسا احساس دے گیا کہ شاید اب زندگی بھر کوئی محبت اس کی بخشی ہوئی محبت پر حاوی نہیں ہو سکتی۔ جانتے ہو..... جس رات وہ اس دنیا سے گیا اس صبح وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس دن پہلی بار اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور یہ کہ میرے بنا وہ مرجائے گا، مگر میں نے اس کی کسی بات پر یقین نہ کیا۔ اس کی کہی ہوئی ہر بات کو جھٹلایا، اس دن وہ میرے سامنے جھک گیا تھا، وہ رو رہا تھا وجاہت۔“
زینب کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

”ماں نے صبح کہا تھا جھکنے والا درخت ٹوٹ جاتا ہے۔“

وجاہت کو لگا ابھی وہ صدمہ کے زیر اثر ہے کچھ دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جائے گی، مگر ایسا نہ ہوا۔
”اگر ہو سکے تو مجھے اور حبیبہ کو اماں کے گھر چھوڑ دو اس کی چابیاں میرے پاس ہیں اب سارگی زندگی ہم دونوں ماں بیٹیوں نے وہاں ہی گزارنی ہے۔“

وجاہت نے اسے اس کی خواہش کے مطابق وہاں پہنچا دیا جہاں سے نکلتی زینب کو دیکھتے ہی وجاہت کسی زمانے میں اس کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ پھر جب تک وہ زندہ رہا اس نے اپنا فرض سمجھ کر زینب اور حبیبہ کا خیال رکھا۔ حبیبہ چھ سال کی تھی جب ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہونے والی وجاہت کی موت نے زینب کی زندگی کا یہ باب بھی ختم کر دیا۔ صرف ایک فائزہ تھی جس نے اپنے بھائی کی موت کے بعد بھی زینب سے کوئی تعلق نہ توڑا، زمانے کی مصروفیات نے اسے زینب سے دور ضرور کیا، مگر وہ اسے کبھی بھولی نہیں تھی۔



عمیر کے پہلو میں بیٹھی حبیبہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

”اللہ اسے ہمیشہ خوش رکھے۔“

اس کے اس فیصلہ سے ناخوش مریم نے دل کی گہرائیوں سے بہن کے لیے دعا کی، حالانکہ ان سب کی خواہش تھی کہ حبیبہ عمیر کو ٹھکرا کر شاہ زین سے شادی کرے، مگر اس نے کسی کی بات نہ مانی اور سب کو اس کی ضد کے آگے ہار مانتی پڑی۔

اک ساگر ہے زندگی

ابھی بھی مریم کو سامنے دیکھتے ہی اس نے اشارے سے اپنے قریب بلایا مریم سٹیج پر اس کے پاس جا کھڑی ہوئی جب جیبہ نے اپنے پاس رکھا چھوٹا سا شاپراٹھا کر اس کی جانب بڑھایا۔
”یہ کیا ہے؟“

مریم نے حیرت سے دریافت کیا اور جیبہ کے جواب دینے سے قبل ہی شاپر کھول کر اندر جھانکا جہاں ایک چھوٹی سی کتاب رکھی تھی۔ مریم نے اسے باہر نکال لیا کتاب کو پلٹ کر اس کے ٹائٹل پر نظر ڈالی۔
”اک ساگر ہے زندگی“ مصنفہ جیبہ شاہ..... وہ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ وجاہت کی نسبت استعمال کرتی۔
”تم لکھتی بھی ہو۔“ مریم کو خوشگوار حیرت ہوئی۔
”نہیں۔“

اس نے اطمینان سے اپنی گردن نفی کے انداز میں ہلائی اور کتاب کا پہلا صفحہ پلٹا۔ ”ایک سچی کہانی جس کا مرکزی کردار کوئی اور نہیں بلکہ میری ماں ہے اور اس میں لکھا ہوا ہر لفظ ان کا اپنا لفظ ہے جو ان کے ہر دکھ کی عکاسی کر رہا ہے۔“ مریم اتنا پڑھتے ہی ہر بات سمجھ گئی۔

”اماں کے باکس میں ان کی فوٹو اسٹیٹ حالت میں ایک کہانی موجود تھی اور مجھ سے انہوں نے التماس کی تھی کہ میں یہ سب کچھ چھپوا دوں تاکہ دنیا کو حقیقت کا علم ہو سکے۔“
جیبہ نے بیگی آنکھوں سے مریم پر ہر بات واضح کی۔

اور پھر عمیر کی کوششوں سے ہم اسے کتابی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اب یہ کتاب آپ کے اور چاڑ بہ باجی کے لیے ہے۔ ٹائم نکال کر اسے پوری پڑھیے گا، پھر آپ کو علم ہوگا میں نے شاہ زین کو کیوں ٹھکرایا۔“ مریم نے دیکھا ماں کی محبت کا نور جیبہ کے چہرے پر بکھرا ہوا ہے وہ شرمندہ ہو گئی۔
جانے اس کہانی میں کس کا قصور تھا تیرا یا میرا

سارا روٹا صرف انا کا تھا

تو بھی انا پرست تھا

میں بھی انا کی ماری تھی

اور اس انا کے کھیل میں ہم دونوں نے بازی ہاری تھی۔

کتاب کے دوسرے صفحہ پر موجود ان الفاظ کو پڑھتے ہی مریم کی آنکھیں بھی پانی سے بھر گئیں۔ اس نے کتاب بند کر کے واپس رکھ دی اسے پڑھے بنا بھی وہ جان سکتی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی کیسی تھی۔

○.....ختم شد.....○